

سرفروش مُجاہد

اے حمید



میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

یہ تینوں بھارت کے صوبہ آندھرا پردیش کی پولیس کے اہلکار تھے۔ ان کی وردیاں میں پہچانتا تھا۔ ان میں سے ایک پولیس کانسٹیبل تھا۔ دوسرا سب انسپکٹر ہوگا تیسرا جس نے سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے یقیناً خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ سب انسپکٹر یا انسپکٹر پولیس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ میری طرف تھا۔ دوسرے کے پاس رائفل تھی۔ میں نہتا تھا۔ فاصلہ ہمارے درمیان اتنا تھا کہ میں کمانڈو اٹیک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ان پر جھپٹتا وہ بڑی آسانی سے مجھ پر فائر کر سکتے تھے۔ دوسرے موقع ایسا نہیں تھا کہ میں پولیس مقابلہ کرتا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان لوگوں نے مجھے ہاتھ کھڑے کرنے کے لئے کس لئے کہا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ ادھر کسی جگہ چھاپہ مارنے آئے ہوں۔ میں نے سب انسپکٹر کو انگریزی میں کہا۔

"معاملہ کیا ہے سر؟ میں تو یہاں اجنبی ہوں۔ اپنے کزن سے ملنے حیدر آباد سے آج ہی آیا ہوں"

سب انسپکٹر نے تلگو زبان میں سویلین کپڑے والے ساتھی سے کچھ کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر میری تلاشی لینی شروع کر دی۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس کوئی پستول وغیرہ تو کیا ایک چاقو بھی نہیں تھا۔ ان علاقوں میں لوگ لائسنس یافتہ اسلحہ بھی ساتھ نہیں رکھتے۔ جب میرے پاس سے کچھ بھی نہ نکلا تو سب انسپکٹر نے پستول نیچے کر لیا اور بولا۔

"تمہارا کزن کہاں ہے جس سے تم ملنے آئے ہو؟"

میں نے جھومرے پٹی میں ملازم اپنے غازی کا نام لیا اور کہا۔

"وہ جھومرے پٹی میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے اس جگہ انتظار کرنے کو کہا تھا"

سب انسپکٹر نے کہا۔

"چلو جھومرے پٹی کلب میں چلو"۔

یہ لوگ مجھے لان میں لے آئے۔ ٹھیک اس وقت اپنا غازی لان کے برآمدے سے نکل رہا تھا۔ اس نے لان کی دھیمی روشنی میں مجھے پولیس کے ساتھ دیکھا تو اس نے سب انسپکٹر سے تلیگو زبان میں کوئی بات کی۔ اس نے بھی تلیگو زبان میں کوئی جواب دیا۔ پھر سب انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے پستول ہولسٹر میں ڈال لیا اور انگریزی میں کہنے لگا۔

"غلطی ہو گئی۔ تم کو معلوم ہے ادھر کل ایک ریٹائرڈ میجر کا قتل ہو گیا تھا۔ ہم نے علاقے کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔"

تینوں پولیس والے چلے گئے۔

غازی نے انگریزی میں زیرلب پولیس والوں کو گالی دی اور مجھ سے کہا۔

"تم لان سے نکل کر سڑک پر چلے گئے تھے؟"

میں نے کہا۔

"یہاں مچھروں نے تنگ کیا تو سڑک پر جا کر ٹہلنے لگا تھا کہ اچانک یہ لوگ جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آ گئے"

غازی بولا۔

"تمہیں سڑک پر نہیں جانا چاہئے تھا۔ سب انسپکٹر میرا واقف تھا۔ معاملہ خراب بھی ہو سکتا تھا۔ آجاؤ ہم دوسری طرف سے ہو کر نکلیں گے"

وہ مجھے جھومرے پٹی کلب کے ایک اور راستے سے لے کر ایک طرف آ گیا۔ یہ چھوٹا سا راستہ تھا جہاں دونوں جانب جھاڑیاں تھیں اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

ہم پیدل چلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں اپنے غازی کا بوسیدہ سا اک منزلہ ڈھلوان چھت والا مکان تھا۔ کمرے میں سامان بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ اس نے

چارپائی اور بانس کے پرانے صوفے پر سے کپڑے اٹھا کر کونے میں پھینکے اور بولا۔

"تم یہاں بیٹھو میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔ تم کافی پیو گے یا چائے۔ یہاں کافی کا بہت رواج ہے۔ مگر مجھے چائے پسند ہے"

میں نے کہا۔

"مجھے بھی چائے پسند ہے"

تھوڑی دیر میں وہ چائے کی دو پیالیاں بنا کر لے آیا۔ ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ اس نے مجھ سے میرے سفر کے بارے میں پوچھا کہ راستے میں اور خاص طور پر ایلور شہر میں داخل ہونے کے بعد کوئی خفیہ پولیس کا آدمی تو میرے پیچھے نہیں لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ بظاہر تو مجھے کوئی مشتبہ آدمی اپنا تعاقب کرتا دکھائی نہیں دیا۔ وہ کہنے لگا۔

"یہاں کی خفیہ پولیس بہت زیادہ خفیہ ہوتی ہے۔ وہ اس طرح پیچھا کرتی ہے کہ دوسرے کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ بہرحال تمہیں یہاں بڑا محتاط رہنا ہو گا۔"

اس کے بعد اس نے میرے مشن کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جو ایلور کی جزیرائی جیل میں پاکستانی جاسوس ہونے کے الزام میں اذیتیں جھیل رہا ہے تو وہ کہنے لگا۔

"یہ دلیر جوان پاکستان کی جانباز فورس کا مجاہد ہے۔ 65ء کی جنگ میں اس کی ڈیوٹی رات کے وقت فائٹنگ پٹرول پارٹی کو لے کر دشمن کے مورچوں کے پیچھے اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخیروں کو اڑانے کی لگی تو یہ اندھیرے میں اپنی پارٹی کے گوریلا جوانوں سے بچھڑ گیا۔ جانباز فورس پاک فوج کی تربیت یافتہ فوج نہیں تھی۔ ان کے جذبہ حب الوطنی کو دیکھتے ہوئے انہیں تھوڑی سی ٹریننگ دی گئی تھی کیونکہ جنگ زوروں پر تھی اور پوری ٹریننگ کے لئے وقت نہیں تھا۔ یہ جوان راستہ بھول کر دشمن کے مورچوں میں چلا گیا اور پکڑا گیا۔ دشمن نے اسے پاک فوج کا کمانڈو سمجھ کر اسے پوچھ گچھ کے لئے پیچھے امرتسر ٹارچر سنٹر میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس پر وحشیانہ تشدد کیا گیا مگر اس جوان نے سوائے اپنے

نام اور نمبر کے کچھ نہ بتایا۔ امرتسر سے اسے گوالیار کے ٹارچر سنٹر میں لے جایا گیا۔ وہاں بھی یہ جوان ہر قسم کی اذیتیں برداشت کرتا رہا مگر اس نے پاک آرمی اور پاکستانی کمانڈو اور جانباز فورس کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ اس کے بعد اسے آندھرا پردیش کی اس بدنام زمانہ جزیرائی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ آج اسے جیل میں پڑے سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ اس سے آج بھی پوچھ گچھ وقفے وقفے کے بعد ہوتی رہتی ہے۔ اسے ٹارچر کیا جاتا ہے۔ مگر پھانسی کی کوٹھڑی میں اس جوان کے اللہ اکبر اور یا علی نعرے گونجتے رہتے ہیں۔ اس جوان کا نام کیپٹن جمشید ہے۔ وہ جانباز فورس میں اعزازی کیپٹن تھا۔"

میں نے غازی سے پوچھا کہ اس کو کیپٹن جمشید کے بارے میں اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں تو وہ بولا۔

"ایلور جیل میں ایک عورت جیل کے وارڈن کی سیکرٹری ہے۔ اس عورت کا نام مادھوی ہے۔ یہ عورت کرسچئن ہے اور کیپٹن جمشید سے اس کو محبت ہو گئی ہے۔ مگر یہ بات اس نے سوائے میرے اور کسی کو نہیں بتائی۔ مجھے اس لئے بتائی ہے کہ وہ میری پرانی دوست ہے۔ مگر اسے میری کشمیری مجاہد کی حیثیت کا علم نہیں ہے۔ اپنی محبت کا اظہار اس نے کبھی پاکستانی مجاہد کیپٹن جمشید سے بھی نہیں کیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک سال سے کیپٹن جمشید ایلور جیل میں بند ہے لیکن اس کے گرد جیل کے اندر بھی اس قدر سخت پہرہ لگایا گیا ہے کہ یہ عورت وارڈن کی سیکرٹری ہونے کے باوجود کبھی کیپٹن جمشید کے قریب نہیں جا سکی۔ بس دور دور سے اس کی جھلک دیکھ لیتی ہے۔"

میں نے غازی سے کہا۔

"یہ ساری معلومات تمہیں اس لڑکی مادھوی کی زبانی معلوم ہوئی ہیں کیا؟"

"ہاں" مجاہد نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مادھوی نے ہی آج سے چھ سات ماہ پہلے مجھے بتایا تھا کہ ہماری جیل میں ایک پاکستانی کمانڈو قید ہے جس کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے مگر وہ اس قدر بہادر اور دلیر جوان ہے کہ ہر قسم کا تشدد برداشت کر رہا ہے۔ لیکن سوائے اپنے نام عہدے اور نمبر کے

اور کچھ نہیں بتاتا۔۔ میں نے اس کے بعد کیپٹن جمشید کو وہاں سے فرار کرانے کے سلسلے میں مادھوی سے بات کی تو اس نے کہا کہ اس جیل میں اگر کوئی مکھی بھی چلی جاتی ہے تو وہ بھی باہر نہیں نکل سکتی اور اسے وہیں مرنا ہوتا ہے۔"

میں اپنے غازی کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ کیپٹن جمشید کے فرار کے بارے میں بھی سوچنے لگا تھا۔ میں نے غازی سے کہا۔

"کیا تم کسی طرح مجھے مادھوی سے ملا سکتے ہو؟ ہو سکتا ہے وہ کوئی ایسا راستہ ہمیں بتا دے کہ جس سے ہم کیپٹن جمشید کو بھارتی درندوں کی درندگی سے نجات دلا سکیں"

غازی نے کہا۔

"میں مادھوی کل صبح فون کروں گا۔ اس سے کہوں گا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کل کا کوئی وقت دے دے۔ پھر ہم دونوں اس سے مل کر بات کریں گے"

"تم میرا اس سے کیسے تعارف کراؤ گے؟"

"میں کہہ دوں گا کہ تم میرے کزن ہو۔ اور حیدر آباد سے مجھے ملنے آئے ہو اور کیپٹن جمشید کو اس لئے فرار کرانا چاہتے ہو کہ تم بھی مسلمان ہو اور وہ بھی مسلمان ہے اور خواہ مخواہ اسے بھارتیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔

"کیا وہ یہاں تمہارے گھر میں آئے گی؟"

غازی بولا۔

"یہاں میں لوگوں سے کم ہی ملتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی ریستوران وغیرہ میں بلائے۔ ہماری ملاقاتیں کبھی کبھار ہی ہوتی ہیں اور ہم ریستوران میں بیٹھ کر تھوڑا وقت گزار لیتے ہیں۔ مادھوی کی شادی نہیں ہوئی۔ اس کے ماں باپ بھی نہیں ہیں اور وہ ایک گرلز کالج کے ہوسٹل میں رہتی ہے۔"

رات میں نے اپنے غازی کے کمرے میں ہی بسر کی۔ دوسرے دن وہ ناشتے کے بعد

مادھوی کو ٹیلی فون کرنے چلا گیا۔ جھومرے پٹی میں اس کی ڈیوٹی شام کے وقت شروع ہوتی تھی۔ کچھ دیر بعد غازی نے واپس آکر بتایا کہ مادھوی نے شام سات بجے کا ٹائم دیا ہے۔ میں نے کہا۔

"اس وقت تو تم جھومرے پٹی کلب میں اپنی ڈیوٹی پر ہوگے"

وہ بولا۔

"میں آج کلب نہیں جاؤں گا۔ یہ کام زیادہ ضروری ہے۔"

میں دوپہر تک غازی کے پرانے مکان میں ہی رہا۔ غازی تھوڑی دیر کے لئے چلا گیا۔ دوپہر کو واپس آگیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ میں نے سگریٹ اور غازی نے بیڑی سلگائی اور ہم باتیں کرنے لگے وہ کہنے لگا۔

"ویسے تو تمہیں یہاں کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ایک اجنبی ہونے کی حیثیت سے بھی تم خفیہ پولیس کی نگاہوں میں آسکتے ہو۔ اس لئے میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ دن کے وقت تم زیادہ وقت مکان میں ہی رہو تو زیادہ بہتر ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں خود بھی یہاں لوگوں کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتا۔"

"تم اندھیرا ہونے کے بعد چہل قدمی کے لئے سمندر کی طرف بے شک نکل جایا کرو۔ اول تو تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ اگر کسی نے پوچھ بھی لیا تو یہی کہنا کہ تم میرے کزن ہو اور حیدر آباد سے مجھے ملنے آئے ہو"

غازی نے اپنے کلب میں بھی ٹیلی فون کر دیا تھا کہ اس کا بھائی حیدر آباد سے اسے ملنے آیا ہے۔ اس لئے آج وہ کلب نہیں آئے گا۔ مادھوی نے سات بجے شام کا وقت دیا تھا۔ ہم ساڑھے چھ بجے گھر سے نکل پڑے۔ جس ریستوران میں مادھوی نے ملنے کے لئے کہا تھا وہ ایلور شہر کے جنوب میں ایک کرسچن آبادی میں ایک چھوٹے سے خوبصورت گرجے کے عقب میں واقع تھا۔ میں اور غازی وہاں پیدل ہی گئے۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ریستوران کے اندر بھی کچھ لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ ریستوران کے آگے

ایک چھوٹا سا سرسبز لان تھا۔ وہاں بھی کرسیاں اور میز لگے ہوئے تھے۔ پیڈسٹل فین چل رہے تھے۔ ہم ایک طرف ہو کر کونے والی میز کے گرد بیٹھ کر مادھوی کا انتظار کرنے لگے۔ لان میں تین چار کھمبوں پر ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ پیڈسٹل فین کی وجہ سے ہم مچھروں سے بھی محفوظ تھے اور ہوا بھی خوب آرہی تھی۔ ٹھیک سات بجے ایک رکشا آکر ریستوران کے سامنے رکا۔

غازی نے کہا۔

"یہ مادھوی ہی ہوگی۔ وہ وقت کی بہت پابند ہے۔"

رکشے میں سے ایک درمیانے قد کی متناسب جسم والی عورت باہر نکلی۔ اس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے لان میں ایک نظر ڈالی اور غازی کو بیٹھے دیکھ کر وہ ہماری طرف آئی۔ ہم نے کھڑے ہو کر اس کا خیر مقدم کیا۔ غازی نے مادھوی سے میرا تعارف کرایا اور کہا۔

"یہ میرا کزن ہے۔ مجھ سے ملنے حیدر آباد سے آیا ہے۔ یہاں اس نے کیپٹن جمشید کے بارے میں مجھ سے سنا تو کہنے لگا اس بہادر جوان کو قید سے فرار کروانا اب میرا فرض بن گیا ہے۔"

مادھوی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بڑا اچھا خیال ہے مگر یہ ایسا خیال ہے جس کا حقیقت میں تبدیل ہونا تقریباً ناممکن ہے۔"

میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہو گیا۔ غازی نے مادھوی سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اتنے میں وہاں میرے اور غازی کے لئے چائے اور مادھوی کے لئے کافی آگئی۔ ساتھ کھانے کے لئے بھی سنیکس وغیرہ تھے۔ دس پندرہ منٹ کی غیر اہم گفتگو کے بعد غازی نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے مادھوی سے کہا۔

"مادھوی! ویسے کبھی کبھی میں بھی سوچتا ہوں کہ کیپٹن جمشید کو ایلور جیل کی کوٹھڑی سے نجات دلانا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ میں اسے حق بجانب سمجھتا ہوں۔ کوئی بھی وطن

پرست آدمی دشمن کی قید میں جا کر اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتا۔ بھارتی پولیس اور انٹیلی جنس کیپٹن جمشید پر کافی سے زیادہ تشدد کر چکی ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر یہ تشدد مزید کچھ روز جاری رہا تو کیپٹن جمشید کی موت یقینی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔"

غازی نے بڑی دانشمندی سے مادھوی کے اس جذبہ محبت کو ابھارا تھا جو اس کے دل میں پاکستانی جوان کیپٹن جمشید کے لئے موجزن تھا۔ مادھوی کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اپنے پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس نے سگریٹ سلگایا اور کہنے لگی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ کیپٹن جمشید کو کسی طرح وہاں سے فرار کروا دوں۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' یہ کام ناممکن ہے۔ ایلور جیل میں سے تو عام قیدی بھی فرار نہیں ہو سکتا اور کیپٹن جمشید تو ایسا قیدی ہے کہ جس کو نہ صرف یہ کہ پھانسی کی کوٹھڑی میں بند رکھا جاتا ہے بلکہ اس کی اردگرد کڑا پہرہ بھی ہوتا ہے۔ اور پھر ایلور کی جیل سمندر کے عین بیچ میں واقع ہے۔ جزیرے کے اردگرد چاروں طرف سمندر ہے اور اس سمندر میں حکومت کی طرف سے آدم خور شارکیں چھوڑی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی قیدی کسی طرح جیل توڑ کر سمندر میں چھلانگ بھی لگاتا ہے تو خونخوار شارکیں اسے وہیں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ ایسے دو تین واقعات ہو چکے ہیں۔ اب کوئی قیدی فرار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

میں خاموش تھا۔ غازی بھی خاموشی سے مادھوی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھی کیپٹن جمشید سے ہمدردی ہے۔ میں اس کی بہادری اور حب الوطنی سے بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ جب کیپٹن پر بہت زیادہ تشدد کیا جاتا ہے تو وہ اللہ اکبر اور یا علیؓ کے نعرے لگاتا ہے۔ پھر نعرے لگاتے لگاتے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس کے شیر ببر ایسے نعروں کی گونج ہمارے دفتر تک سنائی دیتی ہے۔"

میں نے مادھوی سے پوچھا۔

"رات کے وقت جیل خانے پر چوکی پہرے کی کیا پوزیشن ہوتی ہے؟"

مادھوی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"رات کو دن سے زیادہ نگرانی ہوتی ہے۔ جیل خانے کے چاروں کونوں پر واچ ٹاور بنے ہوئے ہیں۔ ان پر مشین گنوں کے مورچے بھی ہیں۔ اور بڑی بڑی سرچ لائٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ساری رات ان کی روشنی کے دائرے اردگرد کے سمندر کو روشن رکھتے ہیں۔ کہیں سمندر پر کوئی چھوٹا سا تختہ بھی لہروں پر اچھلتا نظر آ جائے تو اس پر مشین گنوں کی بوچھاڑیں پڑنے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ جیل کے اندر دو ہیلی کاپٹر بھی ہیں جو ذرا سے اشارے پر اڑتے ہیں اور سمندر پر نیچی پروازیں کرتے ہوئے فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔ جیل کے ریکارڈ کے مطابق جیل خانے سے آخری قیدی دو سال پہلے فرار ہوا تھا جس کی لاش صبح کے وقت جیل خانے کی چٹانوں کے پاس سمندر نے اگل دی تھی۔ اس کا آدھا دھڑ شارکیں ہڑپ کر چکی تھیں اور باقی بچا ہوا آدھا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔"

مادھوی کی زبانی جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں ان کے مطابق جانباز فورس کے کیپٹن جمشید کا جیل سے فرار ناممکن تھا۔ لیکن میں اپنے جانباز کو کفار کی قید سے آزاد کرانے کا عزم لے کر آیا تھا اور مجھے اس وطن پرست پاکستانی جوان کو ہر حالت میں ہندوؤں کی اذیت ناک جیل سے فرار کروا کر پاکستان پہنچانا تھا۔

میں نے مادھوی سے کہا۔

"میڈم! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ کیپٹن جمشید کو پھانسی کی جس کوٹھڑی میں رکھا ہوا ہے اس کا حدود اربعہ کیا ہے اور اس کا رخ سمندر کی کس جانب ہے؟"

میڈم مادھوی نے اپنی پیالی میں تازہ کافی ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس کوٹھڑی کے پاس کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جس مجرم کو پھانسی پر چڑھانا ہوتا ہے اس کو بھی وہاں سے دور آخری کوٹھڑی میں رکھا جاتا ہے۔ میں اپنے وارڈن صاحب کے ہمراہ صرف ایک بار کیپٹن جمشید کی کوٹھڑی تک گئی ہوں۔ یہ کوٹھڑی جیل کے اندر بنی ہوئی ایک اور جیل میں ہے۔ مجھے میرے باس نے دوسری جیل کے باہر ہی کھڑے رہنے کو کہا تھا۔ میں تمہیں اتنا بتا سکتی ہوں کہ یہ کال کوٹھڑی سمندر کے

مشرق کے رخ پر ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ جیل کی چار دیواری بہت اونچی ہے۔ اور پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے۔ اس چار دیواری کے اندر اور باہر چوبیس گھنٹے پولیس ڈیوٹی بدل بدل کر گشت لگاتی رہتی ہے۔ اپنے غازی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔"

"اب تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"اگر مجھے اس کال کوٹھڑی کے اردگرد کے ماحول کا چھوٹا سا نقشہ مل جائے تو میں کسی فیصلے پر پہنچ سکتا ہوں"

میڈم مادھوی نے کہا۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ سارا حدود اربعہ میری نگاہوں میں ہے۔ میں تمہیں ابھی اس کا نقشہ بنائے دیتی ہوں۔"

غازی نے ریستوران کے بیرے سے کاغذ اور پنسل منگوائی اور میڈم مادھوی نے اس پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر ایک رف سا نقشہ بنا کر میرے آگے رکھ دیا اور بولی۔

"یہ پھانسی کی کال کوٹھڑیاں ہیں"

اس نے پنسل ایک جگہ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ کونے والی کال کوٹھڑی وہ ہے جس میں کیپٹن جمشید قید ہے۔ یہ دو لکیریں جو تم دیکھ رہے ہو یہ کال کوٹھڑی کے آگے جو بغیر چھت کے برامدہ ہے اس کی دیوار اور ایک جانب کا لوہے کے جنگلے والا دروازہ ہے۔ اس کے پیچھے گہری خندق ہے جس میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔ یہ کوڑا کرکٹ شام کے وقت دو ٹرک اٹھا کر گھاٹ پر لے جاتے ہیں اور اسے سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔"

میں نقشے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نقشے سے معمولی سا اندازہ ہو گیا تھا مگر پوری تصویر سامنے نہیں آرہی تھی۔ میں نے مادھوی سے پوچھا کہ قید خانے میں سپلائی کی چیزیں کیسے اور کیا آتی ہیں۔ اس نے کہا۔

"جیل کے باہر گوالوں کے کوارٹر ہیں۔ گائیوں کے باڑے ہیں۔ دودھ یہی گوالے جیل میں سپلائی کرتے ہیں۔ سبزی آٹا اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں ہفتے میں ایک بار ایک سٹیمر شہر سے لے کر آتا ہے۔ جیل کے ٹرک گھاٹ پر سے یہ سپلائی لے کر جیل خانے میں آجاتے ہیں۔ باہر کے کسی آدمی کو ان ٹرکوں کے ساتھ اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جیل کے دفاتر بڑے گیٹ کے قریب ہی آمنے سامنے بارکوں کی شکل میں بنے ہوئے ہیں۔ جیل کے دفاتر اور جیل کی بارکوں میں کام کرنے والا عملہ اور خاص سٹیمر میں بیٹھ کر صبح نو بجے جیل میں پہنچ جاتا ہے۔ پھر یہی سٹیمر انہیں لے کر شام کے پانچ بجے واپس ایلور چلا جاتا ہے۔ جیل کے عملے کا کوئی آدمی سوائے ان وارڈوں اور داروغوں کے جن کی رات کو ڈیوٹی ہوتی ہے جیل کے اندر چھٹی ہو جانے کے بعد نہیں ٹھہر سکتا۔"

میں نے مادھوی سے سوال کیا۔

"کیا جیل میں عمر قید اور دوسری معیاد کی قید بھگتنے والوں کے رشتے دار ان سے ملاقات کرنے نہیں آتے؟"

میڈم مادھوی نے کہا۔

"اس جیل میں لمبی قید کے قیدی ہیں۔ زیادہ تعداد عمر قید کی سزا کاٹنے والوں کی ہے۔ اس وقت چار ایسے قیدی بھی کال کوٹھڑی میں بند ہیں جن کی رحم کی درخواستیں انڈیا کے صدر کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ اگر یہ درخواستیں مسترد ہو گئیں تو انہیں جیل کے اندر ہی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ باقی رشتے داروں کو مہینے میں صرف ایک بار اپنے قیدیوں سے ملنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ ملاقات بڑی مختصر ہوتی ہے اور مسلح پولیس والوں کی سخت نگرانی میں کرائی جاتی ہے۔ جتنی دیر یہ ملاقات ہوتی ہے اتنی دیر تک مسلح گارڈ سر پر کھڑے رہتے ہیں۔ کسی رشتے دار کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ قیدی کو کوئی چیز دے۔ درمیان میں ویسے بھی لوہے کا جنگلہ ہوتا ہے جس پر لوہے کی جالی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ جیل میں ملاقات کے واسطے جانے سے پہلے رشتے دار کا پورا ایکس رے کیا جاتا ہے کہ یہ کوئی فالتو چیز تو ساتھ لے کر نہیں جا رہا----"

مادام مادھوی ہمارے پاس ایک گھنٹے تک ریستوران کے لان میں بیٹھی رہی۔ میں نے اس سے جس قدر جیل کے گرد و نواح کی تفصیلات درکار تھیں اور جتنی اسے معلوم تھیں وہ مجھے بتاتی رہی۔ میرے سامنے کیپٹن جمشید تک پہنچنے کے لئے دو مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ ایلور گھاٹ سے چار پانچ میل کا سمندر پار کرنا تھا۔ میں اس سمندر کو تیر کر یا کسی بوٹ کشتی میں بیٹھ کر پار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میری کشتی کو سمندری شارکیں الٹ نہیں دیتیں اور میں ان سے بچ کر نکل جاتا ہوں تو ایلور جیل کے واچ ٹاور کے گارڈز اپنی دوربینوں کی مدد سے مجھے دور ہی سے دیکھ سکتے تھے اور پھر مجھ پر مشین گنوں کی بوچھاڑیں آنی شروع ہو جاتیں۔ مادھوی نے یہ بھی بتایا تھا کہ دن میں ایک دوبار جیل کا ایک ہیلی کاپٹر بھی دیکھ بھال کے لئے جیل کے گرد سمندر کے اوپر چکر لگاتا ہے۔ میں اس ہیلی کاپٹر کی مشین گن کی زد میں آسکتا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ میں تیر کر یا کسی کشتی میں بیٹھ کر سمندر عبور نہیں کر سکتا۔ دوسرا مرحلہ جزیرے میں پہنچ کر جیل کی کئی فٹ اونچی مضبوط دیوار کو پار کرنا تھا۔ یہ بات بھی بظاہر ناممکن دکھائی دیتی تھی۔ لیکن سب سے مشکل مرحلہ سمندر کو عبور کرنا تھا۔

میں اور غازی اس رات کافی دیر تک بیٹھے اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ لیکن ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ میں نے غازی سے کہا۔

"صرف ایک طریقے سے میں جیل کے جزیرے میں پہنچ سکتا ہوں۔ دوسرا کوئی ذریعہ مجھے نظر نہیں آتا"

"وہ کونسا طریقہ؟"

غازی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"ہفتے میں ایک بار جو سٹیمر سپلائی لے کر جزیرے پر جاتا ہے کسی طرح اس سٹیمر میں سوار ہونے کی کوشش کی جائے اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ مجھے نظر نہیں آتا۔"

غازی بھی غور کرنے لگا۔ اس نے بیڑی سلگا رکھی تھی۔ اس کا ہلکا سا کش لگانے کے بعد میری طرف دیکھنے لگا۔

"مگر اس سٹیمر پر تم کس طرح سوار ہو گے؟"

"جہاں تک میرا خیال ہے سٹیمر پر سوائے روزمرہ کے عملے کے آدمیوں کے دوسرے کسی آدمی کو سوار ہونے کی اجازت نہیں ہوگی اور تم تو یہاں بالکل اجنبی ہو۔ تم اس پر کیسے سوار ہو گے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہی ایک نقطہ غور طلب ہے۔ اگر یہ نقطہ حل ہو جائے تو پھر سمجھ لو کہ میں کیپٹن جمشید کو قید سے نکال کر لے آؤں گا۔"

غازی کہنے لگا۔

"فرض کر لیا تم جزیرے پر پہنچ جاتے ہو۔ تم کیپٹن جمشید کو بھی جیل کی کال کوٹھڑی سے نکال کر جیل کی چاردیواری سے باہر لے آتے ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسے لے کر سمندر کو عبور کیسے کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"اسی سٹیمر میں واپس آئیں گے جو سپلائی لے کر آتا ہے"

"مگر وہ سٹیمر تو اسی رات واپس آجاتا ہے۔ اگر تمہیں کیپٹن جمشید کو کال کوٹھڑی سے نکالنے میں دیر ہو گئی تو سٹیمر تو چلا جائے گا۔ پھر تم کیا کرو گے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم جزیرے میں چھپ کر دوسرے ہفتے سپلائی سٹیمر کے دوبارہ جزیرے پر آنے کا انتظار کریں گے۔"

اب غازی بھی ہنسنے لگا۔ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں۔ یہ اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے والی بات ہے۔ میں تمہیں ایسا کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تو پھر مجھے کوئی دوسرا راستہ بتا دو"

غازی بولا۔

"مجھے سوچنے کا موقع دو۔ اسی موضوع پر کل پھر بات کریں گے۔"

وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن غازی مجھے گھر کے اندر ہی چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے باہر چلا گیا۔ وہ کافی دیر بعد واپس آیا۔ اس کی ڈیوٹی شام کو شروع ہوتی تھی۔ آتے ہی وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"میں مادھوی کے پاس گیا تھا۔ آج اس کی دفتر سے چھٹی تھی۔ میں اس سے کیپٹن جمشید کے فرار کے بارے میں مزید گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ یہی ایک عورت ایسی ہے جو اس مشن میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

میں نے پوچھا۔

غازی بولا۔

"وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے ذہن میں فرار کا کوئی پلان ہے۔ اس کے متعلق وہ صرف تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو"

وہ بولا۔

"تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں خود یہاں پہنچ رہی ہے۔ میں شہر ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم خود اس سے بات کر لینا۔ مادھوی اپنے کیپٹن جمشید سے واقعی دل سے محبت کرتی ہے وہ اسے وہاں قید و بند کی مصیبتیں اور اذیتیں اٹھاتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"وہ تمہارے سامنے بات کیوں نہیں کرنا چاہتی؟"

غازی نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا۔

"بس وہ صرف تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ ویسے اس نے کہا ہے کہ بعد میں وہ مجھے

بھی اس مشن میں شامل کرے گی۔ لیکن ابھی وہ صرف تم سے بات کرنے کی خواہشمند ہے۔"

میں بھی نہ سمجھ سکا کہ یہ عورت صرف مجھ سے ہی اس بارے میں بات کیوں کرنا چاہتی ہے۔ بہرحال میرا مقصد کیپٹن جمشید کو قید سے آزاد کرانا تھا۔ خواہ کسی طرح سے بھی ممکن ہو۔ غازی چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد مادھوی آ گئی۔ اس نے ساڑھی کی بجائے جامنی رنگ کا فراک پہنا ہوا تھا۔ وہ رکشے میں آئی تھی۔ مکان کے چھوٹے سے کمرے میں ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے کہا۔

"میڈم! اپنے غازی نے مجھے بتایا ہے کہ تم کیپٹن جمشید کے فرار کے بارے میں مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہو"

اس نے اپنا پرس اپنی گود میں رکھ لیا۔ سگریٹ نکال کر سلگایا اور کہنے لگی۔

"ہاں۔ میں صرف تم سے اس لئے بات کرنا چاہتی ہوں کہ تم یہی مشن لے کر اس شہر میں آئے ہو"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی چپ تھا اور اسے تک رہا تھا۔ میں اسے موقع دینا چاہتا تھا کہ اگر اس کے ذہن میں فرار کی کوئی سکیم ہے تو وہ خود بتائے۔ اپنے غازی نے اسے یہ بتایا تھا کہ میں کیپٹن جمشید کا مداح ہوں اور صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس بہادر آدمی کو بھارت کی قید سے آزاد کرانے کا مشن لے کر وہاں آیا ہوں۔ اس کے علاوہ غازی نے میرے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ بات مادھوی نے بھی بتا دی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"جس طرح تمہیں کیپٹن جمشید سے ہمدردی ہو گئی ہے اسی طرح میں بھی اس بہادر انسان سے ہمدردی رکھتی ہوں۔ بلکہ میں صاف صاف کہوں گی کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ میں خود اسے بھارتی پولیس کی درندگی سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔ مگر میں یہ کام اکیلی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے اس کے لئے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ ایسے ساتھی کی جو اس کام کو ایک مشن سمجھ کر سرانجام دے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے مل گئے ہو۔"

میں نے کہا۔

"اپنا دوست غازی بھی ہمارے اس مشن میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

میڈم مادھوی نے کہا۔

"وہ ضرور ہماری مدد کرے گا اور اگر ضرورت پڑی تو ہم اس سے بھی کام لیں گے۔ لیکن شہر کے لوگ جانتے ہیں۔ گھاٹ کے لوگ بھی جہاں سے سپلائی کا سٹیمر قید خانے کی طرف سپلائی لے کر ہفتے میں ایک بار جاتا ہے وہاں کے لوگ بھی غازی کی شکل صورت سے واقف ہیں۔ جب کہ تمہارا چہرہ ان سب کے لئے اجنبی ہے۔ تمہیں یہاں کوئی نہیں جانتا۔"

میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"کیا تمہاری سکیم یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی سپلائی سٹیمر کے ذریعے ایلور جیل کی چار دیواری تک جائے؟"

وہ کہنے لگی۔

"اس کے سوائے سمندر عبور کر کے ایلور جیل تک جانے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن تم نے تو خود کہا تھا کہ جو سٹیمر سپلائی لے کر جیل کے جزیرے تک جاتا ہے اس پر کوئی اجنبی شخص سوار نہیں ہو سکتا اور سٹیمر کے عملے کے ہر آدمی کے پاس اس کا شناختی کارڈ موجود ہوتا ہے جو اس نے اپنی قمیض پر لگایا ہوا ہوتا ہے۔"

میڈم مادھوی نے سگریٹ کا راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں نے تمہیں یہی کہا تھا اور یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ایسا انتظام کر رہی ہوں کہ تمہارے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں ہوگا اور تم سٹیمر کے ذریعے سمندر پار کر کے جیل کی چار دیواری کے اندر پہنچ جاؤ گے"

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"میں کل رات گئے تک اکیلی بستر پر لیٹی سوچتی رہی کہ تمہیں کس طرح جزیرے کی جیل کے اندر پہنچایا جائے؟ ظاہر ہے تم شناختی کارڈ کے ساتھ بھی سپلائی لے جانے والے سٹیمر پر سوار ہو کر سمندر عبور نہیں کر سکتے۔ ایک اجنبی آدمی کو سٹیمر پر دیکھ کر سٹیمر کا کیپٹن ضرور تم سے پوچھے گا کہ تم کون ہو اور تم نے شناختی کارڈ کہاں سے حاصل کیا ہے۔ آخر میں نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا۔ یہ ایسی ترکیب ہے کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ تمہیں آدھے پونے گھنٹے کی تکلیف ضرور اٹھانی پڑے گی۔"

"میں اس کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا پلان کیا ہے؟"

میرے اس سوال پر میڈم مادھوی کہنے لگی۔

"ہر ہفتے کی شام کو جب یہ سٹیمر ایلور کی گودی سے سپلائی لے کر جزیرے پر پہنچتا ہے تو چیف وارڈن کی طرف سے میری یہ ڈیوٹی لگی ہوتی ہے کہ میں سٹیمر پر جا کر سپلائی کے سامان کو چیک کروں۔ میں سپلائی کے سارے سامان کو چیک بھی کرتی ہوں اور اسے اپنی نگرانی میں جیل کے اندر سٹور روم تک بھی پہنچاتی ہوں۔ اس روز میری ڈیوٹی دوپہر دو بجے سے رات دس بجے تک ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی امید افزا بات تم نے بتائی ہے میڈم۔ مگر سٹیمر پر سفر کس طرح کروں گا؟"

میڈم مادھوی نے دوسرا سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔

"ہمیں اپنے دفتر میں ضروری فائلیں رکھنے کے واسطے ایک فالتو بڑی الماری کی ضرورت ہے۔ یہ الماری لکڑی کی ہوگی اس لئے کہ اس سمندری علاقے میں لوہے کی الماری کو بہت جلد زنگ لگ جاتا ہے۔ چیف وارڈن نے مجھے بطور اپنے سیکرٹری کے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ میں خود شہر کی مارکیٹ سے الماری پسند کر کے خریدوں اور اسے سپلائی سٹیمر کے ذریعے دفتر میں پہنچاؤں۔ بس تم اس الماری میں چھپ کر سمندر عبور کرو گے۔ اور جیل کے اندر بھی پہنچ جاؤ گے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

یہ پلان جیسے قدرت نے خود ہمیں مہیا کر دیا تھا۔ جیل کی چار دیواری کے اندر پ اور خطرناک سمندر عبور کرنے کا اس سے کارگر طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں میڈم مادھوی سے کہا۔

"میں تیار ہوں۔ لیکن اگر سمندری سفر کے دوران کسی نے الماری کو کھول کر دیکھ کی کوشش کی تو پھر کیا ہوگا؟"

میڈم مادھوی کہنے لگی۔

"میں اس الماری کے ساتھ سٹیمر پر سفر کر رہی ہوں گی۔ اسی روز میں خود مارکی سے الماری خرید کر اپنے سامنے سٹیمر پر رکھوا دوں گی اور خود بھی اسی سٹیمر میں بیٹھ جزیرے پر جاؤں گی۔"

پلان انتہائی تر بہدف قسم کا تھا۔ میں نے کہا۔

"پھر ٹھیک ہے اس طرح میں بڑی آسانی سے جیل کے اندر چیف وارڈن کے آف تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟"

میڈم مادھوی نے آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ میں تمہیں وہاں پہنچ کر بتاؤں گی ابھی تم صرف اتنا کرو کہ غازی سے کہہ کر اپ لئے ایسا پستول یا ریوالور حاصل کر لو جس کی نالی پر سائی لینسر لگا ہوا ہو اور جس کے فائ دھماکہ نہ ہو کیپٹن جمشید کو جیل سے فرار کراتے وقت تمہیں اس کی ضرورت پڑ سک ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔ مجھے کس روز سٹیمر پر میرا مطلب ہے الماری کے اند سفر کرنا ہوگا؟"

مادھوی بولی۔

"صرف کل کا دن باقی ہے۔ پرسوں شام کو سٹیمر جیل کی سپلائی لے کر جزیرے ک طرف روانہ ہوگا۔ میں پرسوں دو بجے کے بعد مارکیٹ سے الماری خرید کر اسے ساتھ لے

کر سٹیمر پر سوار ہوں گی۔ ایلور کی گودی کے قریب ہی میری ایک سہیلی کی کوٹھی ہے۔ کوٹھی کا ایک گیراج ہے جو خالی رہتا ہے کیونکہ میری سہیلی کے خاوند کے پاس ابھی گاڑی نہیں ہے۔ لکڑی کی یہ الماری کوٹھی کے گیراج میں شام تک پڑی رہے گی۔ شام ہونے سے ذرا پہلے تم میرے ساتھ اس گیراج میں جاؤ گے اور وہیں تم الماری کے اندر چھپ کر بیٹھ جاؤ گے۔ وہاں سے الماری ایلور گھاٹ پر پہنچانے کے بعد سٹیمر پر رکھوا دی جائے گی۔ میں اس دوران الماری کے ساتھ ہوں گی۔"

"میں اتنی دیر کہاں رہوں گا؟"

وہ بولی۔

"تم ابھی میرے ساتھ چلو گے۔ میں تمہیں دور سے اپنی سہیلی کی کوٹھی کا گیراج دکھاؤں گی۔ تم کل دوپہر کے بعد پورے چار بجے وہاں آ جاؤ گے میں تمہیں گیراج کے باہر ملوں گی۔ مگر میرے اشارے کے بغیر کوٹھی میں ہرگز داخل نہ ہونا۔ تم سمجھ گئے ہو ناں؟"

میں نے کہا۔

"بالکل سمجھ گیا ہوں"

"تو پھر میرے ساتھ آؤ"

ہم دونوں غازی کے مکان سے نکل کر بازار میں آ گئے۔ وہاں سے ہم نے ایک رکشا لیا۔ اسی سڑک پر آگے جا کر تیسرے چوک میں سے دائیں طرف ایک چھوٹی سی سڑک مڑتی تھی۔ اس سڑک پر درختوں کے درمیان ایک پرانی سی شکستہ کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ مادھوی اور میں رکشے سے اتر کر کچھ فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مادھوی نے دور سے مجھے کوٹھی کا گیراج دکھایا اور بولی۔

"کل ٹھیک چار بجے جب تم یہاں آؤ گے تو میں پہلے سے گیراج کے پاس کھڑی ہوں گی۔ رکشے میں آنا اور رکشا چوک میں ہی چھوڑ دینا۔ آؤ اب واپس چلتے ہیں۔"

ہم اسی رکشے میں بیٹھ کر غازی کے مکان پر آ گئے وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں اور مادھوی اپنے پلان کی تفصیلات پر غور کرتے رہے۔ وہ کہنے لگی۔

"تم زیادہ دیر تک الماری میں نہیں رہو گے۔ اس کے باوجود میں لکڑی کی ایک الماری خریدوں گی جس کے اوپر کی جانب دو چھوٹے چھوٹے جالی دار روشندان بنے ہوتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی الماریاں اکثر تیار ہوتی ہیں تاکہ الماری میں تازہ ہوا آتی رہے۔ کیونکہ یہاں لوگ اس قسم کی الماریوں میں کپڑوں کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھتے ہیں۔"

اتنے میں غازی بھی آگیا۔ میڈم مادھوی نے اسے سارا پلان بتادیا۔ غازی کو پلان پسند آیا۔ کہنے لگا۔

"مگر سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا دوست تمہاری مدد سے کیپٹن جمشید کو کال کوٹھڑی سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ اسے اس جہنمی جزیرے سے کیسے باہر نکالے گا؟"

مادھوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ کام بھی ہو جائے گا۔ اسے تم لوگ مجھ پر چھوڑ دو"

پھر اس نڈر عورت نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اب میں جاتی ہوں۔ کل ٹھیک چار بجے سہ پہر تم میری سہیلی کی کوٹھی پر پہنچ جانا۔ میں گیراج کے باہر تمہارا انتظار کروں گی۔"

جب مادھوی چلی گئی تو میں نے اپنے غازی سے کہا۔

"یہ عورت بڑی دلیر ہے۔ اس کی مدد سے میں کم از کم جیل کی چاردیواری کے اندر تو پہنچ جاؤں گا۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

غازی بولا۔

"یہ اپنے کیپٹن جمشید سے دل وجان سے پیار کرتی ہے۔ یہ محبت ہی ہے جو اس سے بہادری کے کام کروا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی تمہیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ یہ عورت کتنی بہادر کیوں نہ ہو بہرحال نا تجربہ کار ہے۔ ذرا سی بھول چوک اس کے ساتھ تمہیں بھی کسی خوفناک مصیبت میں پھنسا سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"مادھوی نے کہا ہے کہ مجھے اپنے ساتھ ایک پستول یا ریوالور بھی لے جانا ہو گا جس پر سائی لینسر لگا ہوا ہو۔ کیا اس کا انتظام ہو سکے گا؟"

غازی بولا۔

"تم جو کہو گے تمہیں مہیا کر دیا جائے گا۔ میں رات کو کلب سے واپسی پر ریوالور لیتا آؤں گا"

غازی دوپہر کے بعد اپنی ڈیوٹی پر جھومرے پٹی کلب چلا گیا۔ میں اگلے روز شروع ہونے والے مشن پر غور کرنے لگا۔ لکڑی کی الماری میں بند ہو کر تین چار میل کا سمندر عبور کرنا میرے لئے کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ تشویش اگر مجھے تھی تو اس بات کی تھی کہ جب میں الماری میں بند ہو کر جیل کے اندر چیف وارڈن کے دفتر میں پہنچ جاؤں گا تو اس کے بعد حالات کوئی سنگین صورت اختیار نہ کر لیں۔ مادھوی بہادر عورت ضرور تھی مگر یہاں بہادری کے ساتھ ساتھ عقل مندی اور سوچ سمجھ کی بھی ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا اصل مشن چیف وارڈن کے آفس میں پہنچنے کے بعد ہی شروع ہونے والا تھا۔ میں دیر تک اکیلا چارپائی پر لیٹا یہی کچھ سوچتا رہا۔ رات کے دس گیارہ بجے کے قریب اپنا جاسوس غازی بھی کلب سے واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا تھیلا تھا۔ اس نے تھیلے میں سے ایک ریوالور نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"کیا اس سے تمہارا کام چل جائے گا؟"

ریوالور کی نالی پر سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کا میگزین کھول کر دیکھا۔ اس میں بارہ گولیوں کا میگزین بھرا ہوا تھا اور لاک لگا ہوا تھا۔ میں نے غازی سے کہا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم کچھ دیر اپنے مشن کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ غازی کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے مادھوی نے تمہارے اور کیپٹن جمشید کے کامیابی سے جزیرے سے نکل آنے کے بعد تم دونوں کے لئے کسی نہ کسی خفیہ جگہ کا ضرور بندوبست کر رکھا ہو گا۔

اگر ایسی بات نہ ہوئی تو تم کیپٹن جمشید کو لے کر سیدھا میرے مکان پر آجانا۔ مکان کی ایک چابی تمہارے پاس ہی ہوگی۔ میں نہ بھی ہوا تو تم کیپٹن کو یہاں چھپا دینا اور میری واپسی کا انتظار کرنا۔ میں کل رات جلدی واپس آجاؤں گا۔ اس کے بعد تم دونوں کے یہاں سے نکل جانے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی کروں گا"

میرا ذہن ابھی تک اس بات سے مطمئن نہیں تھا کہ مادھوی کیپٹن جمشید کو کامیابی سے جیل کی حدود سے باہر نکال سکے گی۔ پھر خیال آتا کہ ہو سکتا ہے وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ کل اس کی رات کی ڈیوٹی ہوگی اور وہ شام سے لے کر رات دس گیارہ بجے تک جیل کے اندر ہی رہے گی۔ ممکن ہے اس نے کوئی انتظام کر رکھا ہو۔ مادھوی نے اس بارے میں زیادہ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنے طور پر سوچ رکھا تھا کہ ایک بار میں نے کیپٹن جمشید کو دشمن کی قید سے نکال لیا تو اس کے بعد میں کسی نہ کسی طرح اسے جزیرے سے بھی فرار کروا لوں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے ریوالور کی بارہ گولیوں سے جیل کے بارہ آدمی کیوں نہ ہلاک کرنے پڑیں۔ دوسرے دن میں دیر تک سویا رہا۔

غازی نے بھی مجھے نہ جگایا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ اس کو چار بجے کلب اپنی ڈیوٹی پر جانا تھا اور مجھے پورے چار بجے مادھوی کی سہیلی کے گیراج میں پہنچنا تھا۔ میں ساڑھے تین بجے غازی سے اجازت لے کر چل پڑا۔ سڑک پر ایک رکشے میں سوار ہو گیا اور ایک چوک پہلے اتر گیا۔ وہاں سے پیدل ہی فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے چلنے لگا۔ ٹھیک چار بجے میں مادھوی کی کوٹھی کے گیٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے ایک طرف درختوں کی اوٹ میں سے کوٹھی کے گیراج کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے مادھوی نظر نہ آئی۔ میں وہیں درختوں کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے مادھوی نظر آئی۔ وہ اپنی سہیلی کی کوٹھی کے برآمدے میں سے گزرتی ہوئی گیراج کی طرف آرہی تھی۔ میں بھی اس کی طرف چل پڑا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ گیراج کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

میں بھی اس کے پیچھے گیراج میں داخل ہو گیا۔ گیراج میں دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں میری نظر دیوار کے ساتھ لگی لکڑی کی قد آدم الماری پر پڑی۔ مادھوی نے گیراج کا دروازہ بند کر دیا۔ میں الماری کے سامنے کھڑا اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ مادھوی میرے قریب آئی۔ اس نے الماری کا دروازہ کھول دیا۔ یہ الماری اس طرح کی تھی کہ اس کا آدھا حصہ اوپر سے لے کر نیچے تک بالکل خالی تھا۔ دوسرے آدھے حصے میں شیلف بنے ہوئے تھے۔ مادھوی نے کہا۔

"اس کے اندر کھڑے ہو کر دیکھو"

میں الماری کے اندر کھڑا ہو گیا۔ میرا سر الماری کی چھت سے چھ سات انچ نیچے تھا الماری میں اتنی جگہ تھی کہ میں وہاں بیٹھ بھی سکتا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا مادھوی کہنے لگی۔

"تمہیں تکلیف تو ضرور ہوگی۔ لیکن یہ تکلیف تمہیں کیپٹن جمشید کی خاطر برداشت کرنی پڑے گی۔ میں نے تازہ ہوا کا خاص طور پر اس میں انتظام کیا ہوا ہے۔ اوپر چھت کی طرف دیکھو۔"

میں نے الماری کی چھت کی طرف نگاہ اٹھائی۔ چھت کی لکڑی میں تین گول گول سوراخ بنے ہوئے تھے۔ وہ بولی۔

"یہ سوراخ صرف تازہ ہوا کے لئے میں نے رکھوائے ہیں۔ چیف وارڈن کے آفس میں پہنچنے کے بعد ان سوراخوں پر کپڑا ڈال کر انہیں بند کر دیا جائے گا۔ میں الماری کا دروازہ بند کرتی ہوں"۔

اس نے الماری کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ الماری میں ایک دم اندھیرا ہو گیا۔ الماری کی چھت کے سوراخوں میں بلب کی دھیمی روشنی اندر آنے لگی۔ مادھوی نے باہر سے پوچھا۔

"اندر دم گھٹنے کا احساس تو نہیں ہو رہا؟"

میں نے کہا۔

"اس قسم کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تازہ ہوا اوپر والے سوراخوں سے آ رہی ہے۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں الماری سے باہر نکل آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟"

اس نے کہا۔

"ٹھیک چھ بجے شام اس الماری کو لینے ایک ٹرک آئے گا۔ تم الماری میں بند ہو کر ٹرک پر پہنچ جاؤ گے۔ میں الماری کے ساتھ ہوں گی۔ یہاں سے ٹرک الماری لے کر گودی پر جائے گا جہاں اسے سپلائی لے کر جانے والے سٹیمر پر رکھوا دیا جائے گا۔ میں جب بھی الماری کے پاس ہی رہوں گی۔ اگر تمہیں کسی قسم کی کوئی دقت پیش آئے تو الماری کے تالے والے سوراخ میں سے باہر مجھے دیکھنے کے بعد دوبار دروازے پر ٹھک ٹھک کرنا میں موقع پا کر دروازہ تھوڑا سا کھول کر تم سے بات کر لوں گی۔ ویسے تم ایسا نہ ہی کرو تو بہتر ہے"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں یہ سفر خاموشی سے طے کر لوں گا۔"

اس کے بعد وہ یہ کہہ کر گیراج سے نکل گئی کہ میں کچھ دیر بعد آؤں گی۔ میں گیراج میں الماری کے پاس اکیلا رہ گیا۔ وہاں کونے میں ایک سٹول پڑا تھا۔ میں سٹول پر بیٹھ گیا اور الماری کی طرف دیکھنے لگا۔ بھرا ہوا ریوالور میری پتلون کی جیب میں تھا۔ میں نے صرف پتلون قمیض پہن رکھی تھی۔ کافی دیر بعد مادھوی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی چینک اور شیشے کے دو گلاس تھے۔ کہنے لگی۔

"میں کافی لائی ہوں۔ پیئیوں گے؟"

میں نے کہا۔

”ضرور پیئوں گا“

ہم کافی پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے مادھوی سے پوچھا۔

”جیل کی چاردیواری کے اندر پہنچنے کے بعد ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ سپلائی والا سٹیمر تو بقول تمہارے آج رات کے پچھلے پہر جزیرے سے واپس چل پڑے گا۔ کیا اس دوران ہم کیپٹن جمشید کو کال کوٹھڑی سے نکالنے میں کامیاب ہو سکیں گے؟ اور فرض کر لیا کہ ہم اسے نکال بھی لیتے ہیں تو کیا ہم دوسروں کی نظروں سے چھپ کر سٹیمر میں سوار ہو کر سمندر عبور کر سکیں گے؟“

مادھوی کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا۔ کافی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگی۔

”یہ سب کچھ میں تمہیں جیل کے اندر پہنچنے کے بعد بتاؤں گی۔ ابھی ہمارا مقصد صرف تمہیں جیل کے اندر چیف وارڈن کے دفتر میں پہنچانا ہے۔ آگے کا بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔ لیکن یہ میں تمہیں وہاں پہنچنے کے بعد بتاؤں گی۔“

وہ دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ پھر چلی گئی۔ چھ بجنے میں ابھی دس ایک منٹ رہتے تھے کہ وہ آگئی۔ کہنے لگی

”تیاری پکڑ لو۔ پورے چھ بجے گودی کا ٹرک الماری لینے آجائے گا“

میں نے الماری کا دروازہ کھولا اور اس کے اندر جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بیٹھ گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا میں بند الماری کے خانے میں آسانی سے بیٹھ سکتا ہوں؟ میں بیٹھ گیا تھا۔ مجھے زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مادھوی نے کہا۔

”یہ الماری ٹرک میں کھڑی کر کے رکھی جائے گی۔ تم اگر بیٹھنا چاہو اور بیٹھنے میں تمہیں اگر تکلیف محسوس نہیں ہوتی تو تم بے شک بیٹھ جانا۔ جس طرح تمہیں سہولت ہو ویسے ہی کرنا۔“

وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی جو اس کی کلائی پر بندھی ہوئی تھی۔ میں الماری سے باہر آگیا۔ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ میں الماری میں بیٹھ کر جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

چھ بج کر دس منٹ پر باہر کسی ٹرک نے ہارن دیا۔ مادھوی نے کہا۔

”الماری میں بیٹھ جاؤ۔ ٹرک آگیا ہے۔“

میں الماری میں داخل ہو کر بیٹھ گیا۔ مادھوی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور الماری کے دونوں پٹ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب میں الماری میں قید ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی سلنڈر کے اندر بیٹھا ہوں۔ چھت کے سوراخوں میں سے بلب کی دھیمی روشنی الماری کے اندر آرہی تھی۔ مجھے مادھوی کے قدموں کی آواز باہر جاتے سنائی دی۔ پھر اس نے انگریزی میں کسی سے کہا۔

”ٹرک ادھر لے آؤ۔ الماری گیراج میں ہے۔“

ٹرک کا انجن چل رہا تھا۔ ٹرک کی گھوں گھوں کی آواز قریب آنے لگی۔ پھر ایسے لگا جیسے ٹرک گیراج کے سامنے آکر رک گیا ہے۔ مجھے مادھوی کی آواز سنائی دی۔

”الماری کو احتیاط سے اٹھا کر رکھنا۔ یہ بڑی قیمتی الماری ہے۔ کہیں کوئی رگڑ نہ لگ جائے۔“

کسی نے بلند آواز میں جواب دیا۔

”ڈونٹ وری میڈم“

پھر میری الماری نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے الماری زمین سے بلند ہو گئی۔ الماری کو اس طرح اٹھائے ہوئے گیراج سے نکال کر ٹرک میں بڑے آرام سے رکھ دیا گیا۔ مادھوی کی آواز آئی۔

”اسے رسی سے باندھ دو“

مجھے ایسی آوازیں آئیں جیسے الماری کے گرد رسی ڈال کر اسے ٹرک کی دیوار کے ساتھ باندھا جا رہا ہے۔ پھر ٹرک کے انجن کو گیئر لگایا گیا اور وہ چل پڑا۔ اس وقت شام کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ میں الماری کے خانے میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے

اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ الماری کی چھت کے سوراخ باہر اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے نظی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ سٹیمر پر سپلائی کا کافی سامان لدا ہوا تھا۔ سمندر کا تین چار میل کا
نہیں آرہے تھے مگر ان میں سے تازہ ہوا ضرور اندر آرہی تھی۔ مجھے گھٹن کا احساس بالکفاصلہ سٹیمر نے کافی وقت لگا کر طے کیا۔ مجھے الماری میں بیٹھے بیٹھے سخت گرمی لگنے لگی تھی
نہیں ہو رہا تھا۔ ٹرک سڑک پر ہلکے ہلکے دھچکے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ ایلور کی گودی وہاں سےاور جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ مگر مجھے یہ گرمی برداشت کرنی تھی۔ آخر سٹیمر نے بار
چھ سات میل کے فاصلے پر تھی۔ ٹرک کئی سڑکوں پر مڑا۔ پھر الماری کے سوراخوں میںبار وسل دینا شروع کر دیا۔ لگتا تھا کہ جیل والے جزیرے کا گھاٹ قریب آگیا ہے۔ اتنے
سے سمندر کی مرطوب ہوا آتی محسوس ہوئی۔ ٹرک ایلور کی گودی پر پہنچنے والا تھا۔ ٹرمیں الماری کی دیوار پر کسی نے بڑی آہستہ سے ٹھک ٹھک کی۔ ساتھ ہی مادھوی کی دھیمی
کی رفتار ہلکی ہوگئی اور ایک طرف کو گھوم کر وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا۔ باہر سے آواز آئی۔
مختلف آدمیوں کی ایک دوسرے کو آواز دینے کی صدائیں آرہی تھیں۔ کسی سٹیمر کے "ہم پہنچ گئے ہیں۔ بس تھوڑی سی اور تکلیف برداشت کرلو۔ بولنا بالکل مت۔"
وسل کی آواز بھی سنائی دی۔ مادھوی ٹرک میں آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ اگر الماری کے پاس میں خاموش رہا۔ سٹیمر گھاٹ کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ پھر اسی طرح مزدوروں نے
ہوتی تو ضرور مجھ سے ایک آدھ بات کر لیتی۔ مزدور لوگ بھی شاید ٹرک کے عقب میری الماری کو اٹھا کر سٹیمر سے نکالا اور ایک جگہ رکھ دیا۔ مادھوی کی آواز آئی۔ وہ
دروازے کے پاس بیٹھے تھے۔ مجھے ان کی کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ الماری کو ٹرک پر انگریزی میں بول رہی تھی۔
سے اتارا جانے لگا۔ "آفس کا ٹرک اس طرف کھڑا ہے۔ الماری کو ادھر لے چلو۔"
مجھے لگا کہ الماری کو مزدور لوگ اٹھا کر لئے جا رہے ہیں کسی مزدور نے دوسرے سے وہاں سے پھر میری الماری کو اٹھا لیا گیا۔ اور کسی دوسرے ٹرک میں لے جا کر رکھ دیا
کہا۔ گیا۔ گرمی اور حبس کی وجہ سے مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا
"سالی الماری بڑی بھاری ہے" اور منہ اوپر والے سوراخوں کی طرف کر کے زور زور سے سانس لینے لگا۔ تازہ سمندری
اب جو الماری کو نیچے رکھا گیا تو الماری بڑے بے معلوم انداز میں مجھے اوپر نیچے ہوتی ہوا مجھے بڑے قریب سے آتی لگی اور طبیعت کی گھبراہٹ کافی حد تک جاتی رہی۔ اب میں
محسوس ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ الماری کو سپلائی والے سٹیمر پر لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ مادھو الماری میں سیدھا کھڑے کا کھڑا ہی رہا۔ ٹرک جزیرے کی سڑک پر جا رہا تھا۔ سڑک اونچی
کسی کے ساتھ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔ شاید وہ سٹیمر کا کیپٹن یا انجینئر تھا۔ کچھ وقت نیچی تھی۔ ٹرک کو ہلکے ہلکے دھچکے لگ رہے تھے۔ ٹرک کی رفتار ہلکی تھی۔ کبھی ٹرک ایک
گزر گیا پھر سٹیمر کے ہارن کی تین بار آواز بلند ہوئی اور اس کے فوراً بعد سٹیمر کا انجن طرف گھوم جاتا کبھی دوسری طرف مڑ جاتا۔ پھر وہ ایک جگہ پہنچ کر رک گیا۔ کسی آدمی کی
سٹارٹ ہو گیا اور مجھے الماری کے اندر بیٹھے بیٹھے ہلکا سا دھچکا لگا۔ سٹیمر سمندر پر چل پڑا آواز آئی۔
تھا۔ "اس میں کیا ہے؟ بولے گا"
یہ وہ سمندر تھا جس کو میں الماری میں بند رہ کر ہی عبور کر سکتا تھا۔ یہ سمندر میرے مادھوی کی آواز پھر بلند ہوئی۔
لئے آگ کا دریا تھا۔ اب میں اس سمندر کو ایک طرح سے محفوظ حالت میں عبور کر رہا "اوکے پٹیل بھائی۔ اوکے۔ آفس کے واسطے الماری لایا ہے"
تھا۔ سٹیمر کے انجن کی گڑگڑاہٹ زیادہ تھی اور لگتا تھا کہ اس کی رفتار بہت ہلکی ہے۔ اس اس مرد کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے۔ آگے جاؤ"

ٹرک پھر چل پڑا۔ مگر بہت دھیمی رفتار کے ساتھ چل رہا تھا۔ کسی نے ٹرک کی سا پر ہاتھ مارا۔ ٹرک چلتا رہا۔ ٹرک ایک طرف مڑا اور رک گیا۔ ٹرک کی اگلی سیٹوں کھڑکیاں کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔

"الماری آفس کے اندر لے جائے گا آہستہ آہستہ۔ اوکے"

کچھ لوگوں نے الماری کو اٹھا کر ٹرک میں سے اتارا اور اسی طرح اٹھائے ہوئے دور لے جانے کے بعد ایک جگہ رکھ دیا۔ مادھوی نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ جاؤ گے اوکے۔"

مزدوروں کے آپس میں تلیگو زبان میں باتیں کرنے کی آواز آئی پھر یہ آوازیں ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ کوئی دو منٹ بعد فرش پر کسی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ٹک ٹک ٹک۔ آواز میری الماری کے پاس آ کر رک گئی۔

"تم ٹھیک ہو ناں؟"

مادھوی نے میرا نام لے کر کہا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے اندر سے نکالو۔ بڑی سخت گرمی لگ رہی ہے۔"

الماری میں چابی گھمائی گئی۔ الماری کا دروازہ کھل گیا۔ تازہ ٹھنڈی ہوا کا جھو میرے جسم سے ٹکرایا۔ میرے سامنے کمرے کی دھیمی روشنی میں مادھوی کھڑی تھی۔ کمرے میں ایک بڑی میز تھی۔ دیوار کے ساتھ کرسیاں لگی تھیں۔ دیوار پر انڈیا کا بہت بڑا نقشہ لگا تھا۔ بڑی میز کے پیچھے دیوار پر گاندھی اور پنڈت نہرو کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ میں جلدی سے باہر نکل کر قریبی کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

مادھوی نے کہا۔

"تم ٹھیک ہو ناں؟"

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا ہم جزیرے کی جیل کے اندر آ گئے ہیں؟"

مادھوی الماری بند کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"شی! اونچی آواز میں بات نہ کرو۔"

تم اس وقت جزیرے کی جیل کے اندر چیف وارڈن کے آفس میں ہو۔

چھت کے ساتھ لگا پنکھا چل رہا تھا۔ میرے پسینے میں شرابور بدن کو یہ ہوا بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہاں سے ہمیں کہاں جانا ہو گا؟"

یہ بات میں نے سرگوشی میں مادھوی سے پوچھی تھی۔ اس نے ہاتھ سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اصل میں دروازے کی طرف سے کسی کے بھاری بوٹوں کی چاپ آ رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ مادھوی نے مجھے میز کی دوسری طرف چھپ جانے کا اشارہ کیا۔ میں جلدی سے بڑی میز کے پیچھے جا کر اس کے نیچے بیٹھ گیا۔

یہاں سے مجھے دروازے کا نچلا آدھا حصہ نظر آ رہا تھا۔ مادھوی نے دروازہ کھول دیا۔ باہر سے کوئی آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے بھاری سیاہ فوجی انداز کے بوٹ' ٹانگوں پر چڑھی ہوئی خاکی جرابیں اور نیکر کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس آدمی نے کہا۔

"میڈم ابھی ادھر کام کرے گا یا سٹور میں جائے گا؟"

یہ کوئی گارڈ تھا جس کی وہاں رات کو پہرہ دینے کی ڈیوٹی تھی۔ مادھوی نے بڑے پرسکون لہجے میں بے نیازی سے کہا۔

"ابھی تھوری دیر کو آفس میں کام کرے گا۔ پھر سٹور میں چیکنگ کے واسطے جائے گا۔ تم گیٹ پر ڈیوٹی پر جائے گا"

"یس میڈم"

اور اس آدمی کی ٹانگیں پیچھے کو گھوم کر دروازے میں سے باہر نکل گئیں۔ میں میز کے نیچے ہی چھپا رہا۔ مادھوی نے دروازہ بند کر دیا مگر چٹخنی نہ لگائی۔ میز کے پاس آ کر اس نے مجھے باہر نکل آنے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ فائلیں کھول

کراپنے سامنے رکھ لیں اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم اس کرسی پر سے اٹھ کر الماری کی ساتھ والی کرسی پر جا کر بیٹھ جاؤ"

الماری کی اوٹ میں ایک کرسی پڑی تھی میں اس پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے فائ نظریں جمائی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی۔

"سپلائی والی رات کو میں یہاں رات کی ڈیوٹی پر ہوتی ہوں۔ یہاں کوئی نہیں ا جیل کے سارے دفتر بند ہوتے ہیں۔ پھر بھی احتیاط ضروری ہے یہ چوکیدار اندر کسی و میں آکر جھانک سکتا ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں الماری کی اوٹ میں بٹھایا ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ہمیں کتنی دیر تک یہاں بیٹھے رہنا ہوگا۔"

مادھوی نے اپنی کلائی والی گھڑی دیکھی اور بولی۔

"ابھی آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے جیل کے قیدی میں کھانا تقسیم ہوتا ہے یہاں قیدیوں کو کھانا سلاخوں کے اندر ہی کھلایا جاتا ہے۔ اس وق میں تھوڑی دیر کے لئے جاؤں گی۔ واپس آکر بتاؤں گی کہ تمہیں آگے کیا کرنا ہوگا۔"

میں الماری کی اوٹ میں کرسی پر خاموش بیٹھا رہا۔ مادھوی دھیمی آواز میں کسی ک وقت مجھ سے کوئی بات کر لیتی تھی۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ کرسی چھوڑ کر اٹھی ا میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں جاتی ہوں۔ جلدی واپس آجاؤں گی۔ میں کمرے کو باہر سے تالا لگا کر جاؤں گی۔ تم خاموش بیٹھے رہنا۔ کھانسی بھی آئے تو روک لینا۔ کیونکہ باہر سیکورٹی گارڈ ٹہلتا رہتا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں اپنی جگہ پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ دیوار پر کلاک لگا ہوا تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلاک کو دیکھ لیتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد مادھوی واپس آئی۔ دروازہ بند کر کے وہ الماری کے قریب آکر کہنے لگی۔

"یہ لو اسے اپنی قمیض پر سامنے کی طرف لگا لو۔"

اس نے پرس میں سے ایک شناختی کارڈ نکال کر مجھے دیا جس کے ساتھ بکسوا لگا ہوا تھا۔ اس پر انگریزی اور تیلگو زبانوں میں کسی آدمی کا نام لکھا ہوا تھا اور مہر بھی لگی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ جیل کے ایک ایسے کچن میٹ کا آئی ڈی کارڈ ہے جو ایک ماہ کی چھٹی پر گیا ہوا ہے۔"

میں نے اپنی قمیض کے سامنے کی طرف آئی ڈی کارڈ چپکاتے ہوئے کہا۔

"لیکن کچن کے لوگ میرے اجنبی چہرے کو دیکھ کر ضرور پوچھیں گے کہ میں کون ہوں اور میں نے اس شخص کا آئی ڈی کارڈ کہاں سے لیا ہے جو ایک ماہ کی چھٹی پر گیا ہوا ہے۔"

مادھوی پرس کو بند کر رہی تھی کہنے لگی۔

"تم کچن کی طرف نہیں جاؤ گے۔ میں بتاتی ہوں تمہیں کہاں جانا ہوگا۔ سنو میں ابھی سٹور میں سپلائی کی چیکنگ کے لئے جاؤں گی وہاں مجھے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ جائے گا۔ اس دوران قیدیوں کو کھانا دے دیا گیا ہوگا ان کی رات کی آخری گنتی بھی ہو چکی ہوگی رات کو ٹھیک گیارہ بجے قیدیوں کی بارکوں اور کوٹھڑیوں کی روشنی بجھا دی جاتی ہے۔ صرف کوٹھڑیوں کے سامنے والی بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ میں اب تمہارے پاس واپس نہیں آؤں گی۔ دیوار پر کلاک لگا ہوا ہے۔ اس کلاک پر جب ٹھیک رات کے سوا گیارہ بجیں تو تم اس کمرے کی بتی بجھا دینا پنکھا بھی بند کر دینا اور بڑی احتیاط سے کمرے میں سے نکل کر بائیں جانب کوریڈور میں چلتے جانا۔ بیس قدم چلنے کے بعد ایک دروازہ آئے گا۔ دروازہ میں نے کھلا رکھا ہوگا۔ اس دروازے میں سے گزر کر تم آگے جاؤ گے تو تمہیں ایک نیم روشن برآمدہ ملے گا۔ اس کی ایک جانب اونچی دیوار ہوگی۔ دوسری جانب چھوٹی پانچ کوٹھڑیاں ہوں گی۔ برآمدے کے پہلے دروازے پر اور آخری دروازے پر دو سنتری پہرہ دے رہے ہوں گے برآمدے کے دروازے کے باہر ایک بالٹی پڑی ہوگی تم وہ بالٹی اٹھا کر برآمدے میں داخل ہو جاؤ گے۔ سنتری تمہاری طرف سرسری نظروں سے دیکھے گا۔

پہلی کوٹھڑی میں جو قیدی بند ہوگا اس کے برتن دروازے کی سلاخوں کے باہر پڑے ہو گے۔ تم ان کو اٹھا کر بالٹی میں رکھ لو گے۔ اس کے بعد دو کوٹھڑیاں خالی ہوں گی۔ چو کوٹھری کے خالی برتن بھی دروازے کی سلاخوں کے باہر پڑے ہوں گے۔ اس کوٹھڑی تمہارا کیپٹن جمشید قید ہے۔ دروازے پر جو تالا لگا ہوا ہے اس کی چابی دوسرے درواز والے سنتری کی بیلٹ میں لگی ہوگی۔ یہاں جو کچھ کرنا ہوگا وہ صرف تم ہی کو کرنا ہوگا تم نے دونوں سنتریوں پر قابو پالیا اور ان کو اس طرح قابو کیا کہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکی اور دیوار کے ساتھ لگے الارم کا بٹن نہ دبا سکیں تو تم دوسرے سنتری کی بیلٹ سے چا نکال کر کوٹھڑی کا دروازہ کھولو گے اور کیپٹن جمشید کو نکال کر دوسرے دروازے برآمدے سے باہر نکلتے ہی دائیں جانب مڑ جاؤ گے۔ یہ کوٹھڑیوں کا عقبی حصہ ہوگا۔ وہا ایک پرانا ٹرک کھڑا ہے اس ٹرک کی ایک جانب مین ہول ہے۔ اس مین ہول میں جیل کا سارا پانی ایک سرنگ میں سے ہو کر سمندر میں گرتا ہے۔ تم دونوں اس سرنگ سے ہو کر جیل کی چاردیواری سے باہر نکل جاؤ گے۔ باہر سمندر میں چھوٹی بڑی چٹانیں نظ آئیں گی۔ ان میں ایک سب سے اونچی چٹان ہے۔ اس اونچی چٹان کے عقب میں ایک جگہ زمین پر پتھر کی سل ملے گی۔ اس پر میں نے درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر ڈال رکھی ہیں پتھر کی سل کو ہٹاؤ گے تو نیچے ایک سرنگ ملے گی۔ بس تم دونوں اس سرنگ میں چھپ گے اور میرا انتظار کرو گے خبردار۔ جب تک میں نہ آؤں۔ ہرگز ہرگز وہاں سے باہر نکلنا۔ اب میں سپلائی کا سامان چیک کرنے سٹور میں جاتی ہوں تمہیں ٹھیک سوا گیارہ بجے اپنے مشن پر نکل پڑنا ہے۔"

مادھوی یہ کہہ کر چلی گئی۔ میں چیف وارڈن کے کمرے میں الماری کی اوٹ میں ہو بیٹھ گیا۔ جب دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے رات کے ٹھیک سوا گیارہ بجائے تو میں اللہ کو یاد کیا اور پہلے کمرے میں چلتا ہوا پنکھا آف کیا۔ پھر کمرے کی بتی بجھا دی اور دروا کھول کر باہر نکل آیا اور کوریڈور میں بائیں طرف دبے پاؤں چلنے لگا۔ بیس قدم چلنے بعد ایک دروازہ آ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ دروازے میں سے نکل کر دیکھا تو آگے ایک روشن برآمدہ تھا۔ میں نے رک کر غور سے دیکھا۔ برآمدے کی ایک جانب اونچی دیوار تھی۔ دوسری جانب کوٹھڑیاں تھیں۔ ان کوٹھڑیوں کے وسط میں ایک کھمبے کے ساتھ بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی دھیمی تھی اور مجھے کوٹھڑی کی سلاخیں نظر آ رہی تھیں۔ برآمدے کے شروع میں ہی ایک بالٹی پڑی تھی۔ میں نے بالٹی اٹھا لی۔ ایک سنتری پہلی کوٹھڑی کے آگے ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے بندوق کاندھے پر لگا رکھی تھی۔ میں نے برآمدے کے آخر میں نگاہ ڈالی۔ وہ چوتھی کوٹھڑی تھی۔ ہمارا بہادر پاکستانی جانباز اسی کوٹھڑی میں قید تھا۔ اس کوٹھڑی کے آگے ایک سنتری سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے ان دونوں سنتریوں کو قابو کرنا تھا۔ میں انہیں صرف کچھ دیر کے لئے بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ مگر صورت حال اتنی نازک تھی کہ وہ میرے ہاتھوں مر بھی سکتے تھے۔ میری نیت انہیں مارنے کی نہیں تھی۔ سب سے پہلے مجھے پہلی کوٹھڑی کے آگے جو سنتری ٹہل رہا تھا اسے قابو کرنا تھا۔ میں نے بالٹی ایک طرف اندھیرے میں رکھ دی اور خود بھی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ سنتری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اس سے کوئی بات کروں۔

میں نے بالٹی اٹھالی اور وہیں سے سنتری کو آواز دی۔

"صاب ادھر سانپ ہے"

سنتری نے مجھے بالٹی ہاتھ میں لئے کھڑے دیکھا تو سمجھ گیا کہ کچن کا ملازم قیدیوں کے برتن اکٹھے کر کے لے جانے آیا ہے۔ وہ برآمدے میں سے اتر کر میری طرف بڑھا۔ اس نے تلگو یا تامل زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے ایک طرف اندھیرے میں اشارہ کر کے کہا۔

"صاحب سنیک ہے۔ سنیک کوبرا"

سنتری نے بندوق سیدھی کر لی اور جھک کر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ میں نے بالٹی زمین پر رکھ دی اور اس کے پہلو میں آ کر پوری طاقت سے اپنا بازو اس کی گردن کے پیچھے مارا۔ اس خاص داؤ کی ہمیں خاص طور پر ٹریننگ دی گئی تھی۔ گردن کے وسط میں ہاتھ کی

بھرپور ضرب سے گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے اس بات کا بڑا خیال رکھا تھا کہ ضرب صرف اتنی ہو کہ سنتری بے ہوش ہو جائے۔ لیکن جب سنتری منہ کے بل گرا تو میں نے اس کے کان کے نیچے الٹا ہاتھ رکھ کر دیکھا کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

سنتری کے گرنے سے ذرا سا شور بلند ہوا تھا۔ اس شور کو سن کر برآمدے کے دوسرے سرے پر چوتھی کوٹھڑی کے باہر جو سنتری سٹول پر بیٹھا تھا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے وہیں سے پہلے والے سنتری کو آواز دے کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں برآمدے میں آگیا اور اسے کہا۔

"صاب! سنتری جی بے ہوش ہو گیا ہے۔"

دوسرا سنتری گھبرا کر میری طرف دوڑا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ دوسرے لمحے دوسرا سنتری بھی پہلے سنتری کے اوپر منہ کے بل گر کر بے ہوش ہو گیا تھا یا مر گیا تھا۔ اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کے دل کی دھڑکن پرکھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بے ہوش ضرور ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی بیلٹ میں لگا ہوا چابیوں کا گچھا نکال لیا اور برآمدے میں چوتھی کوٹھری کی طرف دوڑا۔ چوتھی کوٹھڑی میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں میں نے ایک انسان کو زمین پر اوندھے منہ پڑے دیکھا۔

میں نے چابیوں کے گچھے میں سے تالے پر چابیاں لگانی شروع کر دیں۔ زبوں حال قیدی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا اور جلدی جلدی چابیاں لگانے لگا۔ آخر ایک چابی لگ گئی۔ میں سلاخوں والا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا اور قیدی سے پوچھا۔

"کیا تم پاکستانی جانباز فورس کے کیپٹن ہو؟"

"ہاں" نوجوان نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔

"جلدی سے اپنا نام بتا دو"

"میرا نام جمشید ہے"

ٹھیک ہے فوراً میرے ساتھ نکل چلو۔

"جلدی کرو"

کیپٹن جمشید جیسے پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ وہ بوریئے پر سے اٹھا اور میرے ساتھ کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ میں برآمدے سے نکل کر جلدی سے دائیں مڑ گیا۔ یہ جیل کی کال کوٹھڑیوں کا پچھواڑا تھا۔ کیپٹن جمشید کو میں نے اپنے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"جیل کی دیوار پر کیسے چڑھیں گے؟"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"پلیز! خاموش رہو"

وہاں اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ جیل کی چاردیواری پر جو واچ ٹاور بنے ہوئے تھے ان کی سرچ لائٹ کا دائرہ دیوار کی دوسری جانب چل رہا تھا۔ اس روشنی کا عکس جیل کی چاردیواری کے اندر کی فضا کو بھی اجال رہا تھا۔ مجھے ایک جانب ٹرک کھڑا نظر آیا۔ میں نے کیپٹن جمشید کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ٹرک کی طرف بڑھا میں بھی جھک کر چل رہا تھا۔ کیپٹن جمشید بھی جھک کر چل رہا تھا۔ ٹرک کے پاس جا کر میں مین ہول کے ڈھکن کو تلاش کرنے لگا۔ کیپٹن جمشید وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے مین ہول نظر آگیا۔ میں نے کیپٹن کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے مین ہول کا ڈھکن کسی نہ کسی طرح اٹھا لیا۔ میں نے اس سے سرگوشی میں کہا۔

"ہمیں اس کے اندر اترنا ہے۔"

ڈھکن الگ ہوتے ہی نیچے گٹر کی سرنگ میں سے ناخوشگوار بو کے بھبکے باہر نکلے۔ میں پہلے نیچے اتر گیا۔ نیچے اندھیرا تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹول کر محسوس کیا کہ یہ کوئی پائپ نہیں تھا بلکہ زمین کے اندر واقعی ایک کافی کشادہ سرنگ بنی ہوئی تھی۔ اس دوران کیپٹن جمشید بھی نیچے اتر آیا تھا۔ ہم نے دوبارہ ڈھکن لگا کر مین ہول کا منہ بند کر دیا۔ اندر

کی فضا میں بو اور گرمی اور حبس تھا۔ اندھیرے میں کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جیب سے ماچس نکال کر جلانی چاہی۔ مگر اس خیال سے رک گیا کہ اندر ہلکی ہلکی گیس کی بو بھی ہے کہیں آگ نہ بھڑک اٹھے۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"یہ سرنگ جیل کی چاردیواری کے باہر سمندری چٹانوں میں جا نکلتی ہے۔ ہمیں یہاں سے تیز تیز چلنا ہوگا۔"

سرنگ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ہم جھک کر آگے کی طرف چلنے لگے۔ سرنگ کے درمیان میں پانی کی نالی بنی ہوئی تھی۔ دونوں جانب چلنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ بجلی کے موٹے تار جڑے ہوئے) تھے۔ مجھے پسینے آنے لگے۔ سرنگ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے گرمی حبس بڑھتا جا رہا تھا۔ کیپٹن جمشید میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ ایک جگہ ہمیں تازہ ہوا محسوس ہوئی۔ یہاں شاید سرنگ کی چھت میں کوئی ہوا دان لگا ہوا تھا۔ تازہ ہوا نے ہمیں تھوڑا سکون سا دیا۔ خدا کا شکر تھا کہ سرنگ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ ہم سرنگ میں سے باہر کھلی فضا میں نکل آئے۔ یہاں سمندر ہمارے سامنے تھا اور چٹانوں سے اس کی لہریں دور دور سے آ کر ٹکرا رہی تھیں۔

کیپٹن جمشید لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کیا تم اپنے بارے میں مجھے نہیں بتاؤ گے کہ تم اللہ کے فرشتے کون ہو؟"

میں نے پنجابی میں کہا۔

"کیا تم پنجابی ہو؟"

کیپٹن جمشید بولا۔

"ہاں۔ مسلمان ہوں اور پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ لاہور میں ہمارا گھر ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں بھی پنجابی ہوں۔ مسلمان ہوں پاکستانی ہوں اور میرا مشن تمہیں یہاں سے فرار کروانا اور پاکستان پہنچانا ہے۔ آگے کوئی سوال نہ کرنا۔ یہ سب باتیں بعد میں کی جا ہیں۔ ابھی تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

میں نے اندھیرے میں چٹانوں کی طرف دیکھا۔ رات کی تاریکی میں چٹانوں کے خاکے ہی نظر آ رہے تھے۔ اتنے میں ایک جانب سے واچ ٹاور کی سرچ لائٹ کی روشنی کا دائرہ دیوار کے ساتھ ساتھ ہماری طرف بڑھتا نظر آیا۔ ہم جلدی سے دوڑ کر چٹان کے پیچھے ہو گئے۔ روشنی کا دائرہ آگے نکل کر ایک جگہ رک گیا۔ پھر یہی دائرہ جیل کی چاردیواری کے اندر ہو کر واپس آنے لگا۔ اس دوران میں نے سمندر کنارے کی چٹانوں میں سے بڑی چٹان کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے کیپٹن سے کہا۔

"ہم اس چٹان کی طرف جائیں گے۔"

بڑی چٹان سمندر کے پانیوں میں تھی اور سمندر کی موجیں اس سے ٹکرا ٹکرا کر جھاگ اڑاتی واپس چلی جاتی تھیں۔ بڑی چٹان کی ایک جانب مجھے زمین پر جھاڑیاں سی نظر آئیں۔ میں نے انہیں ایک طرف ہٹایا تو نیچے پتھر کی چوکور سل پڑی تھی۔ ہم نے مل کر سل کو ایک طرف سرکا دیا۔ نیچے گڑھا بنا ہوا تھا۔ میں نے جمشید سے کہا۔

"ہمیں یہاں چھپ کر کسی کا انتظار کرنا ہے۔"

ہم گڑھے میں اتر گئے۔ باہر کی دھیمی دھیمی روشنی میں میں نے دیکھا کہ گڑھے کی دیوار میں ایک جانب غار کا منہ تھا میں نے جھانک کر دیکھا۔ یہ کوئی قدرتی غار تھا۔ اور غار میں دوسری جانب سے ہوا آ رہی تھی۔ ہم نے پتھر کی سل کو دوبارہ گڑھے کے اوپر اس طرح رکھ دیا کہ وہ بالکل فٹ ہو گئی اور زمین کے ساتھ زمین ہو گئی۔ ہم قدرتی غار میں داخل ہو گئے۔ دس بارہ گز چلنے کے بعد غار کے آگے دیوار آ گئی۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"تمہیں گھبراہٹ تو محسوس نہیں ہو رہی؟"

کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"نہیں ایک تو میں پہلے ہی سخت جان فوجی ہوں۔ اوپر سے ان لوگوں نے مجھ پر اتنا ٹارچر کیا ہے کہ اب اس قسم کی تکلیفوں کا احساس نہیں ہوتا۔"

کیپٹن جمشید مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کون ہوں اور اسے بھارتی جیل سے فرار

کروانے کا خیال مجھے کیسے آیا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا کہ میرا تعلق کشمیری حریت پسندوں کے ایک ایسے گروہ سے ہے جو کشمیر کے محاذ پر بھارتی فوجیوں سے بھی برسرپیکار رہتا ہے اور بھارت کے دوسرے شہروں میں قید اپنے مجاہدوں کی بھی خبر رکھتا ہے اور انہیں بھارتی جیلوں سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیپٹن جمشید نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن دوست! اس جیل کے چاروں طرف خطرناک سمندر ہے جس میں آدم خور شارکیں چھوڑی گئی ہیں۔ یہ سمندر تین چار میل کے پھیلاؤ میں ہے۔ تم نے مجھے جیل کی کال کوٹھری سے تو آزاد کروا لیا ہے لیکن یہاں سے باہر نکل کر خطرناک سمندر کیسے عبور کریں گے؟"

میں نے کہا۔

"جس شخص نے مجھے تم تک پہنچنے میں میری مدد کی ہے وہ ہمیں سمندر پار کرنے کی بھی کوئی ترکیب بتا دے گا۔"

"یہ فرشتہ کون ہے جس نے تمہاری مجھ تک پہنچانے میں مدد کی ہے"

میں نے کیپٹن جمشید کو میڈم مادھوی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا مگر یہ نہ بتایا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اور اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے یہ سارا خطرہ مول لیا ہے۔ میری جیب میں ریوالور اسی طرح محفوظ پڑا تھا۔ ہم اندھیرے میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کیپٹن نے پوچھا یہ نیک دل خاتون یہاں کس وقت آئے گی؟ کیونکہ میرے فرار کا کسی بھی وقت جیل کے عملے کو علم ہو سکتا ہے"

میں نے کہا۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔ اگر میڈم مادھوی کو مناسب موقع مل گیا تو وہ ابھی کسی وقت آ جائے گی۔ اگر نہ ملا تو ہو سکتا ہے ہمیں کل کا دن بھی اسی اندھیرے غار میں بسر کرنا پڑے۔ ویسے میڈم مادھوی کا پروگرام یہی تھا کہ وہ جزیرے سے واپس جانے والے سپلائی سٹیمر کے ذریعے یہاں سے نکال دے گی۔"

کیپٹن جمشید بولا۔

"یہ کام مجھے مشکل نظر آتا ہے۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ اتنے میں ہمیں غار میں ایسی مسلسل آواز سنائی دینے لگی جیسے باہر جیل میں خطرے کا الارم چیخ اٹھا ہو۔ کیپٹن جمشید نے کہا۔

"یہ جیل کا الارم ہے۔ انہیں میرے فرار کا علم ہو گیا ہے۔ اور یقینی طور پر جیل والوں کو دونوں سنتریوں کی لاشیں بھی مل گئی ہوں گی۔ اب ہمارا یہاں سے نکلنا مزید مشکل ہو گیا ہے۔"

میں نے کان لگا کر غور سے سنا۔ یہ جیل کا الارم ہی چیخ رہا تھا۔ جس کی آواز غار کے اندر دبی ہوئی آ رہی تھی۔ میں بھی سوچنے لگا کہ اب میڈم مادھوی ان چٹانوں کی طرف آنے کا خطرہ مول نہیں لے گی۔ اور رات والے سپلائی سٹیمر میں سوار ہو کر ہمارے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا کہ اب ہمیں بڑے صبر اور استقلال سے کام لینا ہو گا۔

"کوئی پتہ نہیں ہمیں کب تک اس اندھیرے غار میں بند رہنا پڑے"

کیپٹن جمشید بولا۔

"کوئی بات نہیں مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔"

وقت کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ جیل کا خطرے کا الارم بند ہو چکا تھا۔ موٹر گاڑیوں کی کبھی کبھی ہلکی آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں۔ یہ بات بڑی غنیمت تھی کہ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں کسی طرف سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔ خدا جانے یہ کس خفیہ سوراخ میں سے آ رہی تھی۔ جب وہاں بند ہو کر بیٹھے بیٹھے میرے اندازے کے مطابق ہمیں ڈھائی تین گھنٹے گزر گئے تو میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"میں باہر جا کر صورت حال کا پتہ کرتا ہوں۔"

وہ بھی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ مگر میں نے اسے وہیں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود پتھر کی سل سرکا کر سر باہر نکال کر دیکھا۔ سب سے پہلے تو باہر کی تازہ ہوا نے جیسے

میرے جسم میں جان ڈال دی۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر جیل کی دیوار تھی۔ صبح کے وقت بھی آسمان پر ہیلی کاپٹروں کے چکر لگانے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ جب
سرچ لائٹ کی روشنی کے دو دائرے بڑے تیزی سے ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے۔ جیل کے باہر دن کی روشنی پھیل گئی تو ہم نے پتھر کی سل کو واپس شگاف کے اوپر جما دیا۔ اندر کی
اندر سے آدمیوں کے ایک دوسرے کو آوازیں دینے کی دھیمی دھیمی آوازیں بھی آرہی فضا ایک بار پھر حبس آلود ہو گئی۔ لیکن یہ حبس ہمیں اس لئے بھی گوارا کرنا پڑ رہا تھا کہ
تھیں۔ پھر سٹیمر کے وسل دینے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ٹرک کا انجن سٹارٹ ہوا اس کی وجہ سے ہم دونوں کی جان بچی ہوئی تھی۔
کچھ دور جا کر اس کی آواز غائب ہو گئی۔ جیل کا عملہ مفرور کیپٹن جمشید کو بڑی سرگرمی مجھے معلوم تھا کہ مادھوی صبح نو بجے دفتر آجاتی ہے۔ ممکن تھا کہ شاید وہ دن میں کسی
سے تلاش کر رہا تھا۔ پھر ایک ہیلی کاپٹر فضا میں شور مچاتا بلند ہوا اور اس کی سرچ لائٹ وقت اس طرف چکر لگائے۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ہم چٹان والی غار میں رات بھر سے
سمندر پر پڑنے لگی۔ مادھوی کے آنے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں غیر یقینی بند ہیں۔ ہمیں پیاس لگ رہی تھی۔ کیپٹن جمشید کہنے لگا کہ میں باہر جا کر کہیں پانی تلاش
مدت کے لئے وہاں بند ہو کر رہنا تھا۔ ہمارے پاس پینے کے لئے پانی بھی نہیں تھا۔ مجھے کرتا ہوں۔ میں نے اسے منع کیا۔ کیونکہ ہم ابھی تک ایلور کے جزیرے پر ہی تھے اور
دور سے کچھ آدمیوں کی آوازیں اپنی طرف آتی سنائی دیں۔ میں نے سر نیچے کر کے جلدی جیل کی چاردیواری سے زیادہ دور بھی نہیں تھے۔ رات کو جیل کی پولیس کیپٹن جمشید کی
سے پتھر کی سل اوپر فٹ کر دی اور کیپٹن جمشید کے پاس آ گیا۔ اندھیرے میں اس کی آواز تلاش میں اس طرف دو تین بار آچکی تھی۔ ہمیں پولیس کے سنتریوں کی آوازیں سنائی دی
سے مجھے پتہ چلا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگا۔ تھیں۔ عین ممکن تھا کہ اس وقت بھی سمندری چٹانوں میں پولیس کے سنتری ہماری کھوج
"اگر وہ لوگ میری تلاش میں ادھر آرہے ہیں تو اس بات کا امکان ہے کہ انہیں میں لگے ہوئے ہوں۔ اگرچہ میری قمیض پر جیل کے کچن کے ملازم کا شناختی کارڈ لگا ہوا تھا

ہمارے ٹھکانے کا علم ہو جائے۔"

میں نے کہا۔

"مادھوی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس خفیہ غار کا وہاں کسی کو علم نہیں ہے۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو"

کیپٹن جمشید نے گہرا سانس لینے کے بعد کہا۔ اب ہماری ساری امیدیں مادھوی کے وہاں آنے پر لگی ہوئی تھیں۔

رات گزر گئی۔ رات گزرنے اور دن کے طلوع ہونے کی خبر ہمیں اس طرح ہوئی کہ میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گڑھے کے اوپر رکھی ہوئی سل تھوڑی سی ہٹا کر باہر دیکھ لیتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر یہ سل میں نے تھوڑی سی پرے ہٹادی تھی۔ اس طرف سے بھی تازہ ہوا اندر آنے لگی تھی۔ غار میں صبح ہونے تک حبس ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ سل تھوڑی سی ہٹا دینے سے فضا تھوڑی قابل برداشت ہو

مگر میری شکل ان لوگوں کے لئے اجنبی تھی اور مجھ کو پکڑ کر وہ پوچھ گچھ کر سکتے تھے اور ان پر فوراً میرا بھید کھل سکتا تھا۔ اس وجہ سے میں بھی باہر نہیں نکل رہا تھا۔ دن گزرتا چلا گیا۔ کیپٹن جمشید کی جسمانی حالت بھارتی پولیس کی اذیتیں سہنے سے کمزور ہو رہی تھیں۔ پیاس کی وجہ سے وہ نڈھال ہونے لگا تھا۔ مجھے تو پیاس اور بھوک زیادہ سے زیادہ دیر تک برداشت کرنے کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ ایک بار میں نے سل تھوڑی سی ہٹا کر باہر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سورج سر کے اوپر آچکا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ دن آدھا گزر گیا تھا۔

کیپٹن جمشید بھی بڑے صبر کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پیاس سے اس کی آواز کمزور اور خشک ہو گئی تھی۔ غار کے اندر اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کی آواز ہی سن سکتے تھے۔ اتنی دیر تک اندھیرے میں رہنے سے ہمیں اب ایک دوسرے کی شکلوں کے دھندلے دھندلے خاکے سے دکھائی دینے لگے تھے۔ دن کا دوسرا پہر بھی گزر گیا۔ بھوک اور پیاس

کی وجہ سے مجھے بھی کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ تیسرا پہر گزر رہا تھا کہ ہمیں اوپر زم
کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کیپٹن جمشید نے خشک آواز میں کہا۔

"کوئی آرہا ہے۔"

چاپ کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آرہا ہو۔ یہ آواز ہما
سروں کے بالکل اوپر زمین پر آکر رک گئی۔ پھر جیسے کوئی دو قدم پیچھے کی طرف چلا۔ ا
پھر رک گئی۔ ایک دو سیکنڈ کی خاموشی چھاگئی۔ اس کے بعد کسی نے پتھر کی سل پر ا
ٹھک کی۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا میں نے کیپٹن سے کہا۔

"یہ مادھوی ہی ہو سکتی ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔"

میں تیزی سے گڑھے میں گیا اور اوپر سل کو تکنے لگا۔ سل آہستہ سے ایک ط
کھسکی اور اندر دن کی روشنی کی کرنیں آنے لگیں۔ پھر مجھے مادھوی کی سرگوشی نما
آئی۔ اس نے میرا نام لے کر مجھ کو آواز دی تھی۔

میں نے جلدی سے منہ اوپر کر کے کہا۔

"میں اندر ہوں۔ کیپٹن بھی میرے ساتھ ہی ہے۔"

پتھر کی سل ایک طرف کو تھوڑا سا اور سرکی اور مادھوی نے ایک تھیلا اندر لڑھ
اور کہا۔

"میں پھر آؤں گی۔ ابھی باہر نہ نکلنا۔"

اور وہ سل شگاف کے منہ پر رکھ کر چلی گئی۔ میں تھیلا لے کر اندھیرے میں ک
جمشید کے پاس آگیا۔ میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک ایک کر کے چیزیں باہر نکا
لگا۔ سب سے پہلے ایک لمبی تھرمس نکلی جو ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ میں
تھرمس کھول کر کیپٹن کو دی اور کہا۔

"پانی کے صرف تین گھونٹ پینا۔"

کیپٹن نے تین گھونٹ ہی پیے۔ مجھے اس کے گھونٹ بھرنے کی آواز آتی رہی۔
گھونٹ پانی میں نے پی لیا۔ پانی نے جسم میں جا کر اسے سیراب کر دیا۔ دوسری چیز

تھیلے میں سے نکلیں وہ یہ تھیں ایک پلاسٹک کا گول ڈبہ۔ ایک ٹارچ' ایک ماچس اور موم بتیوں کا ایک پیکٹ میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ غار میں ہمارے درمیان روشنی ہو گئی۔ میں نے پلاسٹک کا ڈبہ کھولا۔ وہ چاولوں کی گرم کھچڑی سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے تھوڑی تھوڑی کھچڑی کھالی۔ کیپٹن نے کہا۔

"ٹارچ بجھادو۔ موم بتی روشن کر لیتے ہیں۔"

ہم نے ٹارچ کی جگہ موم بتی روشن کرلی۔ پٹ سن کا تھیلا سامنے پڑا تھا۔ کیپٹن نے کہا۔

"اس میں کوئی اور چیز نہیں ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"بس یہی چیزیں تھیں۔"

میں نے یونہی تسلی کے لئے تھیلے کے اندر ہاتھ ڈالا تو مجھے اندر تہہ کیا ہوا کاغذ ملا۔ میں نے جلدی سے کاغذ نکال کر کھولا۔ یہ مادھوی کا انگریزی میں لکھا ہوا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"یہاں کیپٹن کے فرار اور دو سنتریوں کے قتل کے بعد سیکورٹی اس قدر سخت کر دی گئی ہے کہ کوئی پرندہ بھی اڑ کر باہر نہیں نکل سکتا۔ تمہارے یہاں سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے جو میں تمہیں لکھ رہی ہوں۔ جہاں تم چھپے ہوئے ہو یہاں سے سمندری چٹانوں کے ساتھ ساتھ اگر تم بائیں جانب جاؤ گے تو تمہیں جیل کے گھاٹ کی روشنیاں نظر آئیں گی۔ اس گھاٹ پر کوسٹل گارڈ کی سات بوٹیں جو لمبی کشتیوں کی شکل میں ہیں۔ کنارے پر کھڑی ملیں گی۔ یہ خاص قسم کی کشتیاں ہیں۔ ان میں موٹریں بھی لگی ہیں۔ مگر تم موٹر سٹارٹ نہیں کرنا۔ آدھی رات کے بعد تم غار میں سے نکل کر ان کشتیوں میں سے ایک کشتی کو قبضے میں لے کر اس کے ذریعے سمندر پار کر کے ساحل پر پہنچ سکتے ہو۔ اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ان موٹر کشتیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے پیندے اور دونوں پہلوؤں میں فولادی کانٹے باہر کو نکلے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے

سمندری شارکیں ان پر حملہ نہیں کرتیں۔ اگر تم یہ خطرہ مول لے سکتے ہو تو تمہارا اس جزیرے سے فرار ممکن ہے۔ ورنہ تمہارا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ اگر تم آج رات کسی طرح ساحلی گارڈز کی کشتی لے کر سمندر پار کر جاؤ تو کیپٹن کو ساتھ لے کر میرا اپنے ساتھی کے گھر پہنچ جانا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گی۔"

یہ خط کیپٹن جمشید نے بھی پڑھا۔ خط کے نیچے مادھوی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ کیپٹن جمشید خط پڑھ کر کہنے لگا۔

"اس عورت نے ہمیں راستہ دکھا دیا ہے اب یہ ہماری ہمت پر منحصر ہے کہ ہم اس راستے پر چل سکتے ہیں یا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"کسی دوسرے خیال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں ہر حالت میں اس سکیم پر عمل کرنا ہوگا اور آج ہی رات کو عمل کرنا ہوگا۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ کیا تم یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہو؟"

یہ کیپٹن جمشید واقعی دلیر جوان تھا۔ کہنے لگا۔

"تم مجھے اپنے سے دو قدم آگے پاؤ گے"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں دوست۔ آگے نہیں۔ تم مجھ سے دو قدم پیچھے رہو گے۔"

میں نے مادھوی کے خط کو اس طریقے سے پھاڑا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے پرزے بن گئے۔ میں نے ان پرزوں کو مٹی میں دبا دیا۔ اب ہم آدھی رات کا انتظار کرنے لگے میں نے شام کا اندھیرا ہوتے ہی سل کو تھوڑا سا ایک طرف ہٹا دیا تھا۔ ہم سل کے نیچے گڑھے میں آکر بیٹھ گئے تھرمس کا سارا پانی ہم نے ختم کر دیا تھا۔ ڈبے کے چاول بھی ختم ہو گئے تھے۔ ہم نے موم بتیوں کا پیکٹ خالی ڈبہ اور تھرمس وہیں غار میں چھوٹا سا گڑھا کھود کر انہیں زمین میں دبا دیا۔ جب ہمارے خیال اور اندازے کے مطابق آدھی رات گزر گئی تو ہم گڑھے سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی ہم سمندر میں چٹانوں کی طرف چل

گئے۔ سمندر کا پانی ہمارے گھٹنوں تک تھا۔ موجیں ہمارے گھٹنوں کو چھو کر ہمیں ڈگمگاتی ہوئی ساحلی چٹانوں کی طرف نکل رہی تھیں۔ ہم نے مادھوی کی ہدایت کے مطابق دور سے جیل کے گھاٹ کی روشنیاں دیکھ کر اسی طرف چلنا شروع کر دیا۔ واچ ٹاورز کی سرچ لائٹوں کی روشنیاں جیل کی دیوار کے اندر اور باہر پڑ کر آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں۔ لیکن وہ ہم سے کافی دور تھیں اور ہم رات کے اندھیرے میں چل رہے تھے۔ گھاٹ کی روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ کچھ کشتیاں ساحل سمندر پر ایک قطار میں لگی تھیں۔

اب ہم بڑے محتاط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔

کشتیوں کے قریب ایک انسان ٹہل رہا تھا۔ کیپٹن جمشید نے کہا۔

"یہ کوسٹ گارڈ کا سنتری ہے۔"

وہاں کوئی آڑ نہیں تھا۔ قریب جانے پر ہم سنتری کو نظر آسکتے تھے۔ میں نے کیپٹن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ساحل کی ریت پر بیٹھ گیا۔ میں گارڈ سنتری کی نقل و حرکت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند قدم چل کر آخری کشتی کے قریب آتا۔ وہاں دو تین سیکنڈ کے لئے رکتا اور پھر واپس چل پڑتا۔ میں نے سرگوشی میں کیپٹن جمشید سے کہا۔

"یہاں صرف ایک ہی سنتری پہرے پر ہے۔ دوسرا سنتری نظر نہیں آرہا۔ تم اسی جگہ بیٹھے رہو۔ میں اسے جا کر قابو کرتا ہوں۔"

کیپٹن نے کہا

"ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لو"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

اور میں ریت پر لیٹ کر رینگنے لگا۔

میں کہنیوں کے بل آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ بڑا نازک مقام تھا۔ ذرا سی غلط حرکت گارڈ کو ہوشیار کر سکتی تھی اور ہمارے فرار کے منصوبے پر پانی پھیر سکتی تھی۔ اور ہم دونوں کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔

آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے جس کی وجہ سے ستاروں کی جو دھندلی روشنی سمندر پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بھی غائب ہو گئی اور اندھیرا گہرا ہو گیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا بھی میں بے حد محتاط ہو کر رینگ رہا تھا۔ میں سنتری کے اتنا قریب پہنچ گیا کہ مجھے اس کے کاندھے پر رکھی ہوئی رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔ گارڈ سنتری اوپر سے ٹہلتا ہوا آخری کشتی کی طرف آ رہا تھا۔ ہمیں اسی آخری کشتی کی ضرورت تھی۔ سنتری آخری کشتی کے قریب آیا تو میں نے اپنا سر نیچے کر کے ریتلی زمین کے ساتھ لگا دیا۔ گارڈ آخری کشتی کے قریب آ کر رک گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی روٹین کے مطابق وہاں دو تین سیکنڈ رک کر واپس چلا جائے گا۔ لیکن وہ واپس مڑنے کی بجائے کشتی کے باہر نکلے ہوئے تختے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ میں زمین کے ساتھ لگا اوندھا پڑا تھا اور گردن کو اٹھائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عجیب مشکل صورت حال بن گئی تھی۔

کوئی پتہ نہیں تھا کہ یہ شخص وہاں کب تک بیٹھا رہے گا۔ اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ اگر اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی تو سارا کام چوپٹ ہو جائے گا۔ وہ یقیناً رائفل کا فائر کر دے گا۔ اور دوسرے گارڈ اور پولیس فوراً وہاں پہنچ جائے گی۔ سنتری پتھر کا بت بن کر کشتی کے تختے پر بیٹھا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کیپٹن جمشید مجھے نظر نہ آیا۔ مجھے بہرحال اس گارڈ سنتری کے وہاں سے واپس جانے کا انتظار کرنا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے سنتری نے سگریٹ پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سمندر کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور سست قدم اٹھاتا واپس چل پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جتنی

تیزی سے رینگ سکتا تھا۔ رینگتا ہوا آخری کشتی کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ میں ندھیرے میں تھا۔ گارڈ سنتری دس بارہ قدم چلنے کے بعد واپس مڑا اور میری طرف آنے گا۔ میں نے احتیاطاً جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ریوالور پر سائی لینسر لگا ہوا ہے اور میں بڑی آسانی کے ساتھ گارڈ کو ہلاک کر سکتا ہوں۔ یکن جیسا کہ آپ میری طبیعت سے واقف ہو چکے ہیں میں بلا ضرورت کسی کو ہلاک کرنے کے خلاف تھا۔ جہاں پستول کا فائر کئے بغیر کام نکل سکتا ہو وہاں میں فائر کرنے سے گریز کرتا نا۔ یہ مقام بھی ایسا ہی تھا۔ گارڈ سنتری آخری کشتی کے پاس پہنچ کر ایک دو سیکنڈ کے لئے پھر کا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ سمندر میں اور سمندر کے ساحل پر اندھیرا اور خاموشی نی۔ اس خاموشی میں صرف سمندر کی لہروں کا ہلکا ہلکا شور مخل ہو رہا تھا۔ سنتری گارڈ مجھ سے تین چار قدموں کے فاصلے پر تھا۔ وہ مڑ کر واپس چلنے لگا۔ اب میں اسے زیادہ مہلت یں دینا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے واپس مڑنے کے بعد ایک قدم اٹھایا میں نے کشتی کی اٹ سے نکل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی بندوق ہاتھ سے چھٹ کر دور جا گری۔ ی میں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی گردن میں بازو ڈالنا چاہا لیکن وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا اور بندوق کی طرف دوڑا۔ اس سے پہلے کہ میں دوسری بار اس کو قابو میں لرتا اس نے میرے دیکھتے دیکھتے بندوق اٹھا لی۔ میں نے ریوالور سے اس پر دو فائر کر یئے۔ دونوں گولیاں اس کے پیٹ میں لگیں۔ وہ گر پڑا میں نے دوڑ کر اس کے ہاتھ سے ندوق چھین کر پرے پھینک دی اور جھک کر اسے دیکھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ یٹ میں گولی لگے تو اس کا پہلا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ جسم سن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ندید درد ہونے لگتا ہے۔ پیٹ میں گولی یا چاقو کا زخم آدمی کو ماہی بے آب کی طرح تڑپاتا ہے۔ سنتری گارڈ کا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ پہلے تو اس کا بدن بالکل بے حس ہو گیا۔ اس کے بعد وہ پیٹ کو پکڑ کر تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے ایک دو آوازیں نکلیں تو میں نے

تیسرا فائر اس کے دل پر کیا۔ اس فائر نے اسے بے جان کر دیا۔

میں دوڑ کر کیپٹن جمشید کے پاس گیا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم آخری کشتی کے پاس آ گئے۔ میں نے کشتی کو کھولا۔ کیپٹن کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کے پیچھے موٹر لگی تھی۔ مگر میں نے اس کو بالکل نہ چھیڑا۔ اس میں دو لمبے لمبے چپو پڑے تھے۔ میں نے چپو سنبھالے اور انہیں آہستہ آہستہ چلاتا کشتی کو کنارے کی طرف سے کھلے سمندر کی طرف لے جانے لگا۔ ایک موج دور سے آ کر کشتی سے ٹکرائی۔ کشتی موج کے اوپر چڑھ گئی اور پھسل کر دوسری طرف نکل گئی۔ یہ لمبوتری کشتی تھی۔ میں نے کیپٹن کو ایک چپو دیتے ہوئے کہا۔ اس طرف سے تم چلاؤ۔ ہم چپو چلاتے ہوئے کشتی کو سمندر میں اس طرف لے جانے لگے جدھر دور ایلور گھاٹ کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ساحل کی طرف سے ایک لہر واپس آتے ہوئے ہماری کشتی کو دھکیلتی ہوئی سمندر میں اور آگے لے گئی۔ میں نے چپو چلاتے ہوئے ہاتھ روک کر کشتی کے پہلو پر ہاتھ پھیرا۔ مادھوی نے ٹھیک کہا تھا۔ کشتی کی دونوں سائیڈوں میں بڑے بڑے کانٹے باہر نکلے ہوئے تھے۔ یہ شارک مچھلیوں کے حملے سے محفوظ رہنے کے لئے لگائے گئے تھے۔

ہم جتنی تیز کشتی چلا سکتے تھے چلاتے ہوئے سمندر میں کافی دور نکل گئے۔ ایلور جیل کے واچ ٹاور کی روشنی ہم سے دور ہوتی جا رہی تھی اور ایلور گھاٹ کی جھلملاتی روشنیاں قریب آ رہی تھیں۔ کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"ہمیں کشتی ایلور گھاٹ کی گودی سے دور رکھنی ہو گی۔ اس گھاٹ کے سیکورٹی گارڈ کو میرے فرار کی خبر مل چکی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔"

اور میں نے کشتی کا رخ ایلور گھاٹ کی روشنیوں سے ہٹ کر دوسری طرف کر لیا۔

رات کے اندھیرے میں سمندر ایسے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ جیسے سانس لے رہا ہو۔ تین چار میل کا فاصلہ ہم نے کشتی کے ذریعے کوئی ایک گھنٹے میں طے کیا اور کشتی کو ہم اس طرف

ساحل پر لے آئے۔ جہاں سے ایلور کا گھاٹ بائیں جانب کافی فاصلے پر رہ گیا تھا۔ یہ ریتلا ساحل دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم نے کشتی کو سمندر میں ہی چھوڑ دیا اور پانی میں چلتے ہوئے ساحل پر آ گئے۔ یہاں کہیں کہیں ناریل کے درخت کھڑے تھے۔ سامنے کی جانب دور شہر کی آبادی کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ہم ان کی طرف دوڑنے لگے۔ میں نے کیپٹن سے کہا۔

"یہ سارا علاقہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

ہم دوڑتے دوڑتے سمندر سے کافی دور نکل گئے۔ جب ایک پتلی سی ریتلی سڑک پر پہنچے تو کیپٹن جمشید بیٹھ گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ بھارتی پولیس نے اس پر بڑا تشدد کیا تھا جس کی وجہ سے اس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک دوڑ سکتا۔ میں اس کے قریب کھڑا ہو گیا اور اردگرد دیکھنے لگا۔ یہ سڑک ایک پٹی کی طرح ایلور شہر کی طرف جاتی نظر آ رہی تھی۔ گھاٹ کی روشنیاں بائیں جانب کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہئے۔"

کیپٹن جمشید اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ چلو"

ہم دوڑنے کی بجائے پتلی سڑک پر تیز تیز چلنے لگے۔ ہم ایک ایسی آبادی میں سے گزرے جس کی ایک طرف جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں اور دوسری طرف مکان تھے۔ کیپٹن جمشید نے پوچھا۔

"اپنے آدمی کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"ہمیں کسی ایسے راستے سے جانا چاہئے جہاں رات کو گشت کرتی پولیس اور چوکیدار

وغیرہ کے ملنے کا امکان نہ ہو"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ہم ایسے ہی راستے پر چل رہے ہیں۔"

حقیقت یہ تھی کہ خود مجھے بھی اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ اپنے غازی کا مکان وہاں سے کس طرف کو ہے اور کتنی دور ہے۔ اس وقت سب سے ضروری بات یہی تھی کہ اس علاقے سے جس قدر اور جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جائیں۔ لیکن مجھے ایک اندازہ ضرور تھا کہ غازی کا مکان وہاں سے شمال مغرب کی جانب ہے اور ہمارا رخ اسی طرف تھا۔ ایک تو اجنبی علاقہ تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ اس شہر کی جیل سے ایک خطرناک مبینہ طور پر پاکستانی کمانڈو دو آدمیوں کا خون کر کے فرار ہو چکا ہے جس کی تلاش میں شہر کی پولیس اور ممکن ہے یہاں کی ملٹری انٹیلی جینس بھی الرٹ ہو گئی ہو۔ شہر میں کسی بھی جگہ کسی بھی سڑک پر ہماری چیکنگ ہو سکتی تھی۔ لیکن ہم رک بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں ہر حالت میں اپنے آدمی غازی کی کمیں گاہ میں پہنچنا تھا۔

چھوٹی سڑک شہر کی ایک بڑی سڑک پر نکل آئی۔ یہاں دونوں جانب آبادی کے مکان اور دکانیں تھیں جو اگرچہ بند تھیں مگر ان کے باہر بتیاں روشن تھیں۔ ایک جگہ ہمیں چوکیدار بھی نظر آیا جو ایک بند دکان کے آگے سٹول پر لاٹھی گھٹنوں پر رکھے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ہم بڑے اعتماد سے انگریزی میں باتیں کرتے اس کے قریب سے گزر گئے۔ مجھے غازی کے علاقے کا نام یاد تھا۔ ایک رکشا تیزی سے گزر گیا۔ ایک اور رکشا سامنے سے آتا نظر آیا تو میں نے اسے ہاتھ دے دیا۔ رکشا رک گیا۔ میں اور کیپٹن جمشید جلدی سے اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے رکشا ڈرائیور کو غازی کی علاقے کا نام بتا کر کہا کہ ہمیں وہاں پہنچا دو۔ رکشا چل پڑا۔ پھر ایک بہت بڑے مندر کے قریب سے گزرا تو میں نے اس مندر کو پہچان لیا اس مندر کو میں نے دن کے وقت میڈم مادھوی کی سہیلی کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ رکشا ایک سڑک کو کاٹ کر دوسری سڑک پر آیا تو اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ آخر وہ رک گیا۔ معلوم ہوا کہ جس علاقے کا میں نے نام لیا تھا یہ وہی علاقہ تھا۔

میں نے جمشید سے پنجابی میں کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اتر جانا چاہئے۔"

ہم دونوں رکشے سے اتر آئے اور اس کو دس روپے دے کر رخصت کر دیا۔ اس چوک کو بھی میں نے پہچان لیا۔ وہاں سے ایک چھوٹی سڑک جھومرے پٹی کلب کی طرف جاتی تھی۔ اس سڑک پر وہ کوارٹر تھے جن میں سے ایک بوسیدہ مکان میں اپنا غازی رہتا تھا۔ ذرا آگے جا کر مجھے پرانے شکستہ کوارٹروں کی قطار نظر آ گئی۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

غازی کے مکان کا دروازہ بند تھا۔ آس پاس اندھیرا اور گہری خاموشی تھی۔ آخری کوارٹروں کی جانب سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد دروازہ کھلا اور اپنے جاسوس غازی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے تیلگو میں کچھ پوچھا۔ یہی پوچھا ہو گا کہ کون ہے۔ پھر اس نے مجھے اور میرے ساتھ ایک اجنبی چہرے کو دیکھا تو جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

ہم لپک کر اندر داخل ہو گئے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ساتھ کیپٹن جمشید کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ کمرے میں پنکھا چل رہا تھا۔ غازی نے بتی روشن کر دی میں نے کیپٹن جمشید سے اس کا تعارف کرایا تو وہ خوش ہو کر کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے۔ خدا کا شکر ہے۔"

میں نے اسے اپنے فرار کی پوری داستان مختصر الفاظ میں بیان کی اور کہا کہ اگر اُن میں مادام مادھوی ہماری مدد نہ کرتی تو کیپٹن جمشید کو ایلور جیل کی کال کوٹھڑی سے نکال کر لے آنا ناممکن تھا۔ وہ بولا۔

"محبت انسان کو بڑا نڈر بنا دیتی ہے۔"

کیپٹن جمشید نے میری طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کس کی محبت کی بات ہو رہی ہے۔ تب میں نے اور اپنے غازی نے اسے ساری حقیقت بیان کر دی اور بتا دیا کہ

مادھوی اس سے محبت کرتی ہے اور یہ اسی محبت کا اثر تھا کہ اس فرار میں مادھوی نے ہماری بھرپور مدد کی ورنہ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ ایک اجنبی قیدی کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیتی۔

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"لیکن میں تو جیل میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ میں نے تو اسے آج تک دیکھا بھی نہیں۔"

غازی بولا۔

"کیپٹن صاحب! آپ نے اسے نہیں دیکھا لیکن مادھوی نے کئی بار آپ کو دیکھا تھا۔ وہ آپ کی بہادری اور وطن پرست اور حب الوطنی کے جذبے سے بے حد متاثر تھی اور اس وجہ سے اسے آپ سے محبت ہو گئی۔ بس اب آپ بھی اس کا دل مت توڑیئے گا۔"

کیپٹن جمشید نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں اسے کیسے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے جب کہ ایسی کوئی بات، کوئی خیال میرے دل میں نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"بھائی اس عورت کا دل رکھنے کے لئے کہہ دینا کہ آئی لو یو۔ وہ کون سا تمہارے ساتھ شادی کرنے والی ہے۔"

کیپٹن جمشید ہنسنے لگا۔

"او کے او کے۔"

اس کے بعد ہم اسی کمرے میں فرش پر سو گئے۔

دوسرے روز ہم کافی دیر تک سوئے رہے۔ غازی ہم سے پہلے اٹھ چکا تھا اور اس نے ناشتہ تیار کر کے رکھ دیا تھا۔ ناشتہ ہم نے اکٹھے کیا۔ اس کے بعد غازی ہمیں مکان میں بند کر کے باہر تالا لگا کر شہر میں حالات کا جائزہ لینے چلا گیا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آیا تو اس نے بتایا کہ پولیس نے شک شبے میں شہر کے کئی مشکوک آدمیوں کو پکڑ لیا ہے اور شہر

کے تمام ناکوں اور بندرگاہ اور ریلوے سٹیشن کے آس پاس پولیس بیٹھ گئی ہے۔ اور خفیہ پولیس کے آدمی جگہ جگہ پھرنے لگے ہیں تاکہ کسی طرح شام ہونے سے پہلے پہلے مفرور پاکستانی کمانڈو کیپٹن جمشید کو گرفتار کر لیا جائے۔

"تم لوگ خوش قسمت ہو کہ رات کو تمہیں یہاں تک آتے ہوئے کوئی پولیس والا نہیں ملا۔ شہر میں ہر کوئی پاکستانی کمانڈو کے فرار کی باتیں کر رہا ہے اور سنا ہے کہ مدراس سے چوٹی کے پولیس افسر اور سراغ رساں ایلور پہنچ رہے ہیں۔"

کیپٹن نے غازی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے شام ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے بھی فرار ہو جانا چاہئے۔"

میں نے اسے کہا۔

"بھائی تم اکیلے فرار نہیں ہو گے میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ لیکن جب تک ہمیں لائن کلیئر نہیں ملتا ہم یہاں سے باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"اور یہ لائن کلیئر کون دے گا؟"

کیپٹن جمشید نے پوچھا۔ ہمارے غازی نے جواب دیا۔

"اس سلسلے میں بھی ہمیں میڈم مادھوی کی مدد لینی ہوگی۔ کیونکہ پولیس اس چھوٹے سے شہر میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔"

ہم شام تک غازی کے مکان میں ہی بند رہے۔ اس روز وہ جھومرے پٹی کلب بھی نہ گیا۔ جب رات پڑ گئی تو میڈم مادھوی بھی وہاں آ گئی۔ کیپٹن جمشید نے مادھوی کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جب غازی نے اس کا تعارف کرایا تو کیپٹن شرما سا گیا۔ بہادر آدمی شرمیلے ہوتے ہیں۔ مادھوی نے کیپٹن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی شیریں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیپٹن! میں یہ کہتے ہوئے بالکل نہیں شرماؤں گی کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ صرف تمہاری محبت کی وجہ سے کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم لوگ جیل سے نکل کر خونی سمندر کو عبور کر کے یہاں پہنچ گئے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن اب ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ یہ علاقہ ایلور جیل کے سمندر کے قریب کا علاقہ ہے۔ بہت ممکن ہے پولیس یہاں گھر گھر تلاشی لینی شروع کر دے۔"

غازی خاموش بیٹھا تھا کہنے لگا۔

"میرا تو خیال ہے کہ تم لوگوں کو آج رات موقع پا کر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

مادھوی نے کہا۔

"یہ کس طرف سے جائیں گے؟ ریلوے سٹیشن اور بندرگاہ پر تو ہر طرف پولیس ہی پولیس ہے۔"

غازی نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے انہیں دریا کے راستے پیچھے جنگلوں میں سے ہو کر فرار ہو جانا چاہئے۔"

مادھوی نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے پولیس دریا پر نہیں ہوگی؟ میری رپورٹ کے مطابق دریا کے دونوں جانب پولیس موجود ہے اور کوسٹل گارڈ کے دو موٹر بوٹ دریا میں صبح سے چکر لگا رہے ہیں۔"

میں نے مادھوی سے پوچھا۔

"پھر تم ہمیں کیا مشورہ دیتی ہو؟"

مادھوی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تمہیں اس وقت تک اسی جگہ چھپ کر بیٹھے رہنا چاہئے جب تک کہ پولیس تھک ہار کر کیپٹن جمشید کی تلاش سے ہاتھ نہیں اٹھا لیتی۔"

غازی نے کہا۔

"لیکن مدراس سے تو پولیس کی مزید نفری یہاں پہنچ رہی ہے۔"

مادھوی بولی۔

"جب کیپٹن جمشید نہیں ملے گا تو مدراس کی پولیس کیا کرے گی؟ وہ کب تک یہاں پڑی رہے گی۔ ایک دن وہ بھی مایوس ہو کر واپس چلی جائے گی۔"

غازی کہنے لگا۔

"اس سارے عمل میں کئی روز لگ سکتے ہیں اور اس مکان میں کیپٹن جمشید کا اتنے دن قیام خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔"

مادھوی نے کہا۔

"اس کے چھپنے کے لئے میری نگاہ میں ایک مناسب جگہ ہے۔ میں اسے وہاں لے جاؤں گی۔ جب حالات ذرا نارمل ہوں گے تو میں خود اسے یہاں سے فرار کرا دوں گی۔"

میں نے غازی کی طرف دیکھا۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے مادھوی اس طرح سے کیپٹن جمشید کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔

اس کے بات کرنے کے انداز سے مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس نے اپنے ذہن میں کوئی دوسرا پروگرام بنا رکھا ہے پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ایک مفرور قیدی کو اپنے پاس کتنی دیر تک رکھ سکتی ہے۔ میں نے مادھوی سے اس خفیہ جگہ کے بارے میں پوچھا جو اس کے ذہن میں تھی تو وہ سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔

تمہیں اس بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں میں تم دونوں کو لے جاؤں گی۔ وہاں پولیس نہیں پہنچ سکے گی۔"

غازی نے کہا۔

اگر ایسی بات ہے تو پھر ان دونوں کو یہاں دیر نہیں کرنی چاہئے۔

مادھوی بولی۔

دیر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں سارا بندوبست کر کے آئی ہوں۔ میں دس بجے آؤں گی اور دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے غازی سے کہا۔

"کیا ہمیں مادھوی کے ساتھ چلے جانا چاہئے؟"

تم ہمیں کیا مشورہ دیتے ہو؟

غازی نے کہا۔

"ظاہر ہے وہ تمہیں پولیس کے حوالے تو نہیں کرے گی۔ کسی محفوظ جگہ پر ہی لے جائے گی۔ تمہیں اس پر بھروسہ کرنا چاہئے۔"

کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔"

رات کے سوا دس بجے غازی کے مکان کے باہر ایک گاڑی آکر رکی۔ ہم نے کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ یہ ایک ویگن تھی جس کی چھت پر سبز اور سرخ بلب باری باری روشن ہو رہے تھے۔ میں نے بجلی کی روشنی میں پڑھا اس کی ایک سائیڈ پر ریڈ کراس کا نشان بنا ہوا تھا اور نیچے تیلگو زبان اور انگریزی میں ایمبولینس لکھا تھا۔ مادھوی خود گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر مکان کے دروازے پر آئی تو غازی نے دروازہ کھول دیا۔ اندر آکر اس نے کہا۔

"میں گاڑی لے آئی ہوں۔ آپ لوگ خاموشی سے ویگن کے پیچھے جا کر بیٹھ جائیں۔ یہ ایک پرائیویٹ ہسپتال کی ایمبولینس ہے جہاں میری ایک سہیلی ڈاکٹر ہے۔ ایمبولینس میں اس لئے لائی ہوں کہ اس کو راستے میں کوئی چیک نہیں کرے گا۔"

میں اور کیپٹن جمشید مکان سے نکل کر ایمبولینس کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ مادھوی ہمارے ساتھ تھی۔ اس نے ایمبولینس کا دروازہ بند کرنے سے پہلے ہمیں مخاطب کر کے کہا۔

"تم لوگ الگ الگ سٹریچروں پر لیٹ جاؤ۔ اگر کسی وجہ سے راستے میں پولیس نے چیکنگ کر بھی لی تو تم اپنے آپ کو بے ہوش ظاہر کرنا۔ میں تمہیں نقلی ڈرپ لگائے دیتی ہوں۔"

ایمبولینس کے اندر آمنے سامنے دو سٹریچر پڑے تھے۔ ہم ان پر لیٹ گئے۔ مادھوی نے ہمیں گلوکوز کا ڈرپ اس طرح لگا دیا کہ سوئی بازو میں چبھونے کی بجائے ہمارے

بازوؤں سے لگا کر ٹیپ سے چپکا دی۔

"بس جب تک میں اندر نہ آؤں تم لوگ اسی طرح سٹریچر پر لیٹے رہنا۔"

وہ دروازہ بند کر کے اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ ایمبولینس سٹارٹ ہوئی اور ہم وہاں سے نکل پڑے اپنے غازی سے میں نے سائی لینسر والا ریوالور اور کچھ فالتو گولیاں لے کر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ ایمبولینس جھومرے پٹی کی آبادی سے نکل کر بڑی سڑک پر آئی تو اس کا سائرن بجنے لگا۔ اس سائرن کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اسے راستے میں کوئی روکتا نہیں۔ اس خیال سے کہ اس میں ایمرجنسی کا مریض ہسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ ایمبولینس ایلور شہر کی سڑکوں پر رات کے اندھیرے میں کافی دیر تک دوڑتی رہی۔ ایمبولینس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ عقبی دروازے میں جو دو گول شیشوں والے سوراخ تھے ان میں سے سڑکوں کی روشنیاں نظر آجاتی تھیں۔ کافی دیر تک سڑکوں پر دوڑنے کے بعد ایمبولینس کا سائرن خاموش ہو گیا۔ ایمبولینس کے اندر کوئی بتی نہیں جل رہی تھی اور اندھیرا تھا سڑک کی روشنیاں اندر آجاتی تھیں۔ اب یہ روشنیاں بھی نہیں آرہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ایمبولینس شہری آبادی سے باہر نکل کر غیر آباد علاقے میں آگئی تھی۔ ایمبولینس نے ایک جگہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دو تین موڑ کاٹے اور پھر اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایمبولینس رک گئی۔ مادھوی نے نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا اور کہا۔

"او کے۔ آجاؤ۔ سب ٹھیک ہے"

ہم نے نقلی ڈرپ اپنے بازوؤں سے الگ کئے اور گاڑی سے نکل آئے۔ رات کے اندھیرے میں اونچے اونچے درختوں کے درمیان ایک کاٹج کا خاکہ نظر آیا جس کے نہ اندر روشنی تھی نہ باہر کوئی بتی جل رہی تھی۔ مادھوی ہمیں ساتھ لے کر کاٹج کے دروازے پر لے آئی اور بولی۔

"اس سے زیادہ محفوظ علاقہ سارے شہر میں تمہارے لئے اور کوئی نہیں ہے۔ میری سہیلی کا جو پرائیویٹ ہسپتال ہے اس کا یہ سٹور ہے۔ یہاں پہلے دوائیوں وغیرہ کا سٹاک رکھا

جاتا تھا مگر اب یہ خالی پڑا ہے۔ سٹور ہسپتال کے ساتھ ہی بن گیا ہے۔"

اس نے چابی لگا کر دروازے کا تالا کھول دیا۔ اندر لکڑی کے پرانے کھوکھ
دوائیوں کی ہلکی بو آ رہی تھی۔ میں اور کیپٹن جمشید اندر چلے گئے۔ اندر اندھیر
مادھوی نے بٹن دبایا۔ دیوار کے ساتھ لگا ایک چھوٹا سا بلب روشن ہو گیا۔ اس ک
روشنی میں کمرے میں ادھر ادھر پڑے خالی کھوکھے اور گتے کے ڈبے بکھرے ہوئے د
دیئے۔ وہ ہمیں دوسرے کمرے میں لے گئی۔ یہاں بھی اس نے بتی جلا دی۔ یہ کمرہ
تھا۔ مگر اس میں لوہے کے دو پلنگ آمنے سامنے بچھے تھے جس پر ہسپتالوں والے بستر
ہوئے تھے۔ مادھوی نے چھت کا پنکھا چلا دیا۔ کہنے لگی۔

"باتھ روم اور کچن اس کمرے کے پیچھے ساتھ ہی ہیں۔ کچن میں میں نے کھانے
کا تمام سامان رکھوا دیا ہے۔ تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو گی۔"

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"لیکن میڈم ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رہنا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ جتنی جلدی ہو
اس شہر سے نکل جائیں۔"

مادھوی کہنے لگی۔

"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ لیکن ابھی شہر میں پولیس جگہ جگہ تمہاری تلاش
چھاپے مار رہی ہے۔ تمہیں حالات کے نارمل ہونے تک تو یہاں رہنا ہی ہو گا"

میں نے کہا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم ویسا ہی کریں گے جیسا تم کہو گی۔"

مادھوی نے کہا۔

"اب تم لوگ یہاں آرام کرو۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ میں کل کسی وقت آ
گی۔"

جب وہ ایمبولینس لے کر وہاں سے چلی گئی تو کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"مجھے اس عورت کی سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیا چاہتی ہے۔ کہیں یہ مجھ سے اپنی

کی وجہ سے میرے قیام کو یہاں لمبا تو نہیں کرنا چاہتی؟"

شک مجھے بھی تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہ کیا اور کیپٹن سے کہا۔

"اس کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں اپنی بات پھر دہراؤں گا کہ اگر اسے تم سے محبت بھی ہے تو وہ ایک مفرور محبوب کے ساتھ اپنا سارا کیریئر خطرے میں ڈال کر زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی۔"

کیپٹن جمشید نے لوہے کے پلنگ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں اپنے طور پر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ شہر کی حدود سے تو ہم نکل ہی آئے ہیں۔ تمہارے پاس ریوالور بھی ہے۔ راستے میں کوئی خطرہ ہوا تو ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں خوامخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ اس علاقے کے بارے میں بھی ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ کون سا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ ہمیں اس عورت کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ اگر ہمیں اتنی خطرناک جیل سے نکال لائی ہے تو یہاں بھی ہماری راہ نمائی کرے گی۔ میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ ہمیں صبر سے کام لینا چاہئے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم کمروں کی بتیاں بجھا کر اور اندر سے دروازوں کو چٹخنیاں لگا کر سو گئے۔ صبح اٹھ کر دن کی روشنی میں باہر ماحول کا جائزہ لیا۔ یہ چھوٹا سا کاٹیج نما سٹور غیر آباد جنگلی علاقے میں واقع تھا۔ چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تاڑ اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ کہیں کوئی کھیت نہیں تھا۔ کوئی جھونپڑا تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے درختوں پر کبھی کبھی بولنے والے پرندوں کی آواز کے دوسری کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

کیپٹن جمشید بولا۔

"دیکھنا چاہئے کہ یہاں دریا بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ دریا ہی یہاں سے فرار کا ایک

محفوظ ذریعہ ہے۔ اگر ہم اس کے اوپر کی طرف یعنی اپ سٹریم جائیں تو اس شہر کے علاقے سے باہر نکل سکتے ہیں۔ دریا میں پولیس وغیرہ کا بھی خطرہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"پہلے چل کر ناشتہ بناتے ہیں۔ یہ باتیں بعد میں کریں گے۔"

کمرے کے پیچھے درختوں میں ساتھ ساتھ بنے ہوئے باتھ روم اور کچن تھے۔ باتھ روم میں پانی بھی آرہا تھا۔ کچن میں گیس کا سلنڈر بھی پڑا تھا۔ ایک ریفریجریٹر بھی تھا جس میں دودھ کے ڈبوں کے علاوہ کھانے پینے کی تقریباً ساری چیزیں موجود تھیں۔ کچھ ضروری برتن بھی گیس کے چولہے کے پاس میز پر پڑے تھے۔ ہم نے مل کر ناشتہ بنایا۔ کافی بنائی اور وہیں کچن میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ وہاں کھانے پینے کا سامان دیکھ کر مجھے ایسے لگا تھا کہ جیسے اس عورت نے یہاں ہمارے دیر تک رہنے کا انتظام کر رکھا ہے۔

مادھوی نے جاتے وقت ہمیں تاکید کی تھی کہ ہم بلا ضرورت مکان سے باہر نہ نکلیں اور اگر نکلنا ضروری بھی ہو تو مکان کے قریب قریب ہی رہیں۔ ہمیں کہاں جانا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد کاٹیج کے عقب میں اونچی جھاڑیوں کی اوٹ میں لوہے کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور وہاں سے فرار کے منصوبوں پر غور کرنے لگے۔ دوپہر کو ہم نے کچن میں انڈے وغیرہ بنا کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد ہم کمرے میں ہی پڑے رہے۔ تیسرے پہر چائے بنا کر پی اور پانچ دس منٹ کاٹیج کے پیچھے درختوں میں ٹہلتے اور باتیں کرتے رہے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ کہ مادھوی ایمبولینس لے کر آگئی۔ اس وقت ہم کمرے کے اندر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مادھوی نے آتے ہی پہلی بات یہ پوچھی کہ تم لوگ کاٹیج سے باہر تو نہیں نکلے تھے؟ میں نے کہا۔

"ایک گھنٹہ پہلے تھوڑی دیر کے درختوں میں ضرور ٹہلتے رہے تھے"

مادھوی نے کمرے کی کھڑکی کا پردہ گراتے ہوئے کہا۔

"اب یہ غلطی دوبارہ نہ کرنا۔ پولیس کے ساتھ اب ملٹری انٹیلی جینس بھی تمہاری تلاش میں نکل آئی ہے۔ پورے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ میں نے بڑا اچھا کیا جو

رات تمہیں وہاں سے نکال کر لے آئی۔ میری ایمبولینس کی پولیس نے تین جگہوں پر تلاشی لی ہے۔"

میں نے مادھوی سے پوچھا۔

"پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔"

مادھوی نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ وہ کیپٹن جمشید کے پاس ہی لوہے کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں نے تو یہی سوچا تھا کہ تمہیں دریا کے ذریعے یہاں سے نکال دوں گی۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ دریا بھی محفوظ نہیں رہا۔ کوسٹ گارڈ کی کشتیاں دریا میں بھی گشت لگاتی ارتی ہیں۔"

کیپٹن جمشید بولا۔

"لیکن ان حالات میں یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔"

مادھوی نے کہا۔

"اس سے بہتر دوسری کوئی جگہ میری نظروں میں نہیں ہے۔ تمہیں صرف اتنی نیاط کرنی ہوگی کہ دن کے وقت کمرے سے ہرگز باہر نہ نکلو۔ رات کو بھی چوکس ہو کر ر نکلنا ہوگا۔ خفیہ پولیس کے آدمی کسی بھی بھیس میں یہاں نمودار ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کیپٹن جمشید کی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

"میڈم! میری رائے میں ہمیں یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہئے۔"

مادھوی نے کہا۔

"تمہیں کم از کم دو دن تو یہاں ضرور رکنا پڑے گا۔ اس دوران مجھے یقین ہے کہ ں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لوں گی۔"

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد مادھوی ایمبولینس لے کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"بھائی اس عورت کے بارے میں ہم نے غلط سوچا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ نیک

نیت عورت ہے اور واقعی یہاں سے فرار ہونے میں ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔"

میں بھی اب اسی لائن پر سوچنے لگا تھا۔ مادھوی کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سب سے زیادہ جو فکر ہے وہ یہی ہے کہ ہمیں کس طرح وہاں سے نکال کر حیدر آباد کی طرف روانہ کردیا جائے۔

رات کو ہم نے مادھوی کی ہدایت کے مطابق کسی کمرے کی بتی روشن نہ کی۔ جس کمرے میں ہم سوتے تھے۔ اس میں ایک موم بتی روشن کرکے زمین پر کونے میں لگادی تھی۔ کھانا بھی ہم نے موم بتی کی روشنی میں ہی پکا کر کچن میں بیٹھ کر کھایا اور پھر کمرے میں آکر بستروں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ کاٹج کے سامنے والے دروازے پر مادھوی تالا ڈال گئی تھی۔ اگر اس طرف سے کوئی آدمی آکر دیکھے تو اسے یہی لگتا کہ کاٹج خالی پڑا ہے اور یہاں کوئی نہیں رہتا۔ رات کو اگر ہمیں باہر جانے کی ضرورت پڑتی تو ہم کمرے کی عقبی کھڑکی میں سے باہر چلے جاتے تھے۔ اور اسی کھڑکی سے اندر آجاتے تھے۔

ہمیں اس ویران کاٹج میں یہ دوسری رات تھی۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب رات گہری ہوگئی اور ہمیں بھی نیند آنے لگی تو موم بتی بجھا کر ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ کمرے میں پنکھا چل رہا تھا۔ جس کی وجہ سے مچھر بھی نہیں کاٹتے تھے اور کمرے میں گرمی اور حبس بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میرا ذہن ہر قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے کیپٹن جمشید کو وہاں سے نکال کر انڈیا کا بارڈر کراس کرا کر پاکستان میں داخل کرنا تھا۔ اور خود واپس کشمیر کے محاذ پر بھی جانا تھا۔ وہاں سے انڈیا کا بارڈر بہت دور تھا۔ راستے میں کسی بھی جگہ پولیس اور خفیہ پولیس ذرا سا شبہ ہونے پر ہمیں دبوچ سکتی تھی۔ میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ میری نیند غائب تھی۔ مجھے کیپٹن جمشید کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آئی تو مجھے خوشی ہوئی کہ پاکستان کا یہ غازی مجاہد آرام کی نیند سو رہا ہے۔ بھارتی فرعونوں نے نہ جانے کتنی راتیں اسے ٹارچر کرکے جگائے رکھا تھا۔ باہر کی فضا پر گہری خاموشی طاری تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھ پر ابھی ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے ہی لگی تھی کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ کسی آدمی کی آواز تھی جو کچھ فاصلے پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر دو تین آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ باتیں کرتے کاٹج کی طرف آرہے ہیں۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ سرہانے کے نیچے سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ کیپٹن جمشید کو میٹھی نیند سے جگانے کو میرا دل نہ چاہا۔ میرے کان باہر سے آتی آوازوں پر لگے تھے۔ یہ آوازیں ہمارے کاٹج کے پاس آکر رک گئیں۔ پھر کسی کے دروازے کو اپنی طرف کھینچنے کی آواز آئی میں بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں ساتھ والے کمرے میں آگیا۔ جس کے دروازے کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ باہر کوئی آدمی اسی دروازے کو اندر کی طرف دھکیل رہا تھا۔ یہ دو آدمی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی زبان میں دوسرے کو کچھ کہا۔ یہ زبان شاید تلیگو تھی۔ کیونکہ آندھرا پردیش میں تلیگو زبان ہی بولی جاتی ہے۔ تامل زبان صوبہ تامل ناڈو میں بولی جاتی ہے۔ میں سمجھ نہ سکا کہ یہ لوگ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اتنا معلوم ہوگیا تھا کہ وہ دروازے پر لگے ہوئے تالے کو کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے کیپٹن جمشید کو جگا دیا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا اور کچھ بولنے لگا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ باہر والے آدمی تالے میں مختلف چابیاں لگا رہے تھے مگر تالا نہیں کھل رہا تھا۔ میں نے اپنے سرہانے کے نیچے سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور ہم تیزی سے دروازے کی دونوں جانب اسی طرح کھڑے ہوگئے کہ اگر تالا کھل گیا اور جیسے ہی کوئی اندر داخل ہو اس کو وہیں دبوچ لیا جائے۔

باہر خاموشی چھا گئی۔ دونوں نے آپس میں کچھ بات کی اور پھر ان کے قدموں کے واپس جانے کی آواز آئی۔ وہ واپس چلے گئے تھے۔ جب قدموں کی آواز دور چلی گئی تو کیپٹن جمشید نے آہستہ سے کہا۔

"یہ خفیہ پولیس کے آدمی ہی ہو سکتے ہیں اس کا مطلب ہے انہیں ہمارے ٹھکانے کا علم ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی چور ڈاکو ہوں اور گھر کو خالی دیکھ کر چو کرنے آئے ہوں۔ کیپٹن نے کہا۔"

"چور ہوتے تو تالا توڑ دیتے۔ یہ چور نہیں تھے۔ یقیناً خفیہ پولیس کے آدمی تھے۔"

میں نے کہا۔

"خفیہ پولیس والے بھی تالا توڑ سکتے تھے۔ یہ واپس کیوں چلے گئے ہیں؟"

کیپٹن جمشید بولا۔

"بھائی جی! یہ جگہ ہمیں بدل دینی چاہئے۔ کوئی پتہ نہیں یہاں کب پولیس پ مارنے آجائے۔"

کیپٹن کا خیال درست تھا۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا میں نے اسے کہا۔

"یہاں سے اسی وقت باہر نکل کر درختوں میں چھپ جاتے ہیں۔ یہاں خطرہ ہے۔"

ہم اس وقت کمرے کی کھڑکی میں سے دوسری طرف نکل گئے۔ اندھیری رات تھی۔ ہم درختوں میں ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گئے۔ جہاں سے اگر کوئی آدمی مکان کے دروازے کی طرف جاتا تو ہمیں نظر آسکتا تھا۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ کیپٹن جمشید کچن میں سے ایک عام چاقو لے لیا تھا۔ درختوں کے نیچے ہمیں مچھروں نے تنگ شروع کردیا۔ مگر ہم وہیں بیٹھے رہے اور مچھروں کو بھی مارتے رہے۔ جب وہاں بیٹھے ہوئے کافی وقت گزر گیا اور کاٹج کی طرف کوئی نہ آیا تو جمشید کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ اب نہیں آئیں گے ہمیں کمرے میں چلے جانا چاہئے۔"

میں نے بھی سوچا کہ اگر یہ خفیہ پولیس کے آدمی ہوتے تو اب تک پولیس کو وہا پہنچ جانا چاہئے تھا۔ یہ کوئی چور اچکے تھے۔ مکان کا تالا نہ کھل سکا تو انہوں نے چوری کر کا ارادہ بدل لیا اور چلے گئے۔

میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کچھ دیر اور یہاں بیٹھے رہنا چاہئے۔"

کیپٹن جمشید نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ہم درختوں کی اوٹ میں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ اتنے میں ہمیں کچھ فاصلے پر انسانوں کے سائے مکان کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ میں نے کیپٹن جمشید کو وہ انسانی سائے دکھائے۔ وہ بھی غور سے دیکھنے لگا۔ یہ تین انسان تھے جو جھک کر بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے مکان کی طرف آرہے تھے۔ ان کا اور ہمارا فاصلہ بیس پچیس قدموں کا ہوگا۔ تینوں آدمی دروازے کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ ساتھ ہی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے وہ ہتھوڑی سے تالا توڑ رہے ہوں۔ تالا ٹوٹ گیا تو دو آدمی اندر داخل ہوگئے۔ اور ایک آدمی باہر ہی کھڑا رہا۔

کیپٹن جمشید آہستہ سے بولا۔

"مجھے تو یہ چور لگتے ہیں۔"

میں نے ان لوگوں کو اندھیرے میں بڑے غور سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے ان کی پولیس کی وردی نظر نہیں آئی تھی اور ان میں سے کسی کے پاس بندوق یا رائفل بھی نہیں تھی۔ میں نے جمشید کو مشورہ دیا کہ ہمیں ان لوگوں کے باہر نکلنے کا انتظار کرنا چاہئے۔

"اگر تو یہ کچھ سامان وغیرہ لے کر باہر آئے تو ان کا چور ہونا ثابت ہو جائے گا۔"

باہر جو آدمی پہرے پر کھڑا تھا اس کے پاس بھی اندھیرے میں کوئی بندوق وغیرہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بندوق یا رائفل ہوتی تو اندھیرے میں بھی اس کا دھندلا سا خاکہ نظر آسکتا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد جو آدمی اندر گئے تھے وہ بھی باہر آگئے۔ انہوں نے ایک ایک گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ باہر آتے ہی تینوں آدمی دوڑ پڑے اور دیکھتے دیکھتے رات کے اندھیرے میں ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

ہم بھی اٹھے اور تیز تیز چلتے مکان میں داخل ہوگئے۔ میں نے ماچس جلا کر دیکھا۔ پہلے کمرہ میں پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔ لکڑی کے خالی کھوکھے وغیرہ تھے جو ویسے کے ویسے فرش پر ادھر ادھر پڑے تھے۔ ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔ میں نے یہاں موم بتی روشن کی تو دیکھا کہ دونوں پلنگوں کے بستر غائب تھے۔ وہاں بستروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہم

کچن میں گئے۔ وہاں موم بتی جلا کر دیکھا۔ کچن کا تقریباً سارا سامان غائب تھا۔ صرف مٹی کی ایک ہانڈی ایک صراحی ایک پرانی کیتلی اور ایک گلاس ہی باقی رہ گیا تھا۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ یہ چور نکلے۔ خفیہ پولیس کے آدمی نہیں تھے۔"

ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور لوہے کے بغیر بستر کے پلنگوں پر ہی لیٹ گئے۔ پنکھا اسی طرح چل رہا تھا۔ ان چوروں نے چھت کا پنکھا نہیں اتارا تھا۔ اس کے بعد ہم سو گئے۔ صبح اٹھ کر دروازے کو دیکھا تالا زمین پر ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میڈم مادھوی آگئی۔ اسے صورت حال کا علم ہوا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"یہاں کبھی کوئی چور نہیں آیا۔ ان چوروں کا آنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ لوگوں کو اب یہاں نہیں رہنا چاہئے۔"

میں نے مادھوی سے کہا۔

"میڈم! ہمارا ویسے بھی اس شہر میں زیادہ دیر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم کسی طرح ہمیں اس شہر سے باہر نکلنے کی کوئی محفوظ ترکیب بتادو پھر تمہیں بھی اس پریشانی سے نجات مل جائے گی۔"

مادھوی کہنے لگی۔

"میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔ لیکن حالات ابھی نارمل نہیں ہوئے۔ تامل ناڈو کی پولیس بھی یہاں پہنچ گئی ہے۔ ان میں انٹیلی جینس کے آدمی بھی ہیں۔"

کیپٹن جمشید بولا۔

"ان حالات میں تو ہمارا اس شہر میں ٹھہرنا اور بھی خطرناک ہے۔ کیا دریا کے علاوہ کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جو جنگل اور پہاڑیوں میں سے ہوتا ہوا دوسرے شہروں کی طرف نکل گیا ہو؟"

مادھوی کچھ غور کر رہی تھی کہنے لگی۔

"آپ لوگ آج کا دن یہاں گزاریں۔ میں آج آفس نہیں جاؤں گی۔ اور کوئی دوسرا

راستہ تلاش کروں گی۔ مگر تم لوگ اس مکان میں نہیں رہو گے۔ پیچھے درختوں کے ذخیروں میں کسی جگہ چھپ کر دن گزارو گے میں شام کا اندھیرا ہوتے ہی آجاؤں گی۔ مجھے یقین ہے میں کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈھ لوں گی۔"

مادھوی تھیلے میں ہمارے لئے کھانے کے لئے چاول وغیرہ لائی تھی۔ وہ ایمبولینس میں بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ ہم نے کچن میں بیٹھ کر تھوڑے بہت چاول کھائے۔ صراحی میں سے پانی پیا اور کچن سے نکل کر پیچھے کچھ فاصلے پر املی اور سنبل کے گھنے درختوں کا جو ذخیرہ تھا وہاں جھاڑیوں میں تھوڑی سی جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں وہاں سارا دن بیٹھنا تھا۔ وقت بڑی ست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ کسی کسی وقت دھوپ بھی نکل آتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ہم نے سارا دن گھنے درختوں میں بیٹھ کر کبھی لیٹ کر اور کبھی ادھر ادھر ٹہل کر گزار دیا۔ جب سورج غروب ہو گیا اور شام کے سائے آہستہ آہستہ اترنے لگے تو ہم پچھلی طرف سے ہو کر سب سے پہلے کچن میں گئے۔ وہاں ہانڈی میں ہم نے کچھ چاول بچا کر رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے چاول کھائے اور کچن میں ہی بیٹھ کر مادھوی کا انتظار کرنے لگے۔

جب شام کا ملگجی اندھیرا رات کے سرمئی سایوں میں ڈھل گیا تو دور سے ویگن کی آواز سنائی دی۔ مادھوی اسی ایمبولینس میں آئی تھی۔ ایمبولینس کی چھت والی سرخ اور زرد روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اس کا سائرن بھی خاموش تھا۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ایمبولینس مکان کی ایک جانب کھڑی ہوئی تو اس کی ہیڈ لائٹس بھی بجھ گئیں۔ مادھوی ویگن کی فرنٹ سے اتر کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھی تو ہم بھی کچن سے نکل کر اس کے سامنے آگئے۔ مادھوی کہنے لگی۔

"اندر آجاؤ"

ہم دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ مادھوی کے ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا تھا۔ اس نے تھیلے میں سے چائے سے بھری ہوئی تھرمس نکالی اور تھرمس کے پیالہ نما ڈھکن میں ڈال کر سب سے پہلے کیپٹن جمشید کو دی۔ پھر بولی۔

"چائے پینے کے بعد آپ لوگ میرے ساتھ جائیں گے۔ میں نے ایک اور جگہ کا انتظام کرلیا ہے۔ دن کے وقت تو یہاں کوئی نہیں آیا؟"

میں نے کہا۔

"کوئی نہیں آیا۔ وہ لوگ چور ہی تھے بستر اور برتن اٹھا کر لے گئے"

"ہاں" مادھوی نے کہا۔

"اگر پولیس کے آدمی ہوتے تو اب تک یہاں چھاپہ پڑ چکا ہوتا۔"

ہم نے باری باری گرم چائے پی۔ پھر ایمبولینس میں اسی طرح سٹریچروں پر لیٹ گئے۔ مادھوی نے ہمیں نقلی ڈرپ لگا دیئے۔ ایمبولینس وہاں سے چل پڑی۔ ایک بار پھر وہ مختلف سڑکوں پر سے گزر رہی تھی۔ ایمبولینس آدھ گھنٹے تک چلتی رہی۔ اس کے بعد ایک طرف کو گھوم کر رک گئی۔ مادھوی نے آکر دروازہ کھولا۔ ہم نے ڈرپ اتار دیئے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"آجاؤ"

یہ جگہ ایک ایسا جنگل تھا جہاں قریب ہی دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ مادھوی نے بتایا کہ ہم لوگ دریا کے اوپر کی جانب بدردائی گھاٹ سے چھ سات میل آگے نکل آئے ہیں۔

"اس طرف دریا تھوڑے فاصلے پر بہہ رہا ہے۔"

ایک جگہ اندھیرے میں دو تین جھونپڑے تھے۔ مادھوی نے کہا۔

"یہ جھونپڑے ویران ہیں۔ یہاں کوئی نہیں رہتا۔ تم لوگ یہاں رہو گے میں تمہیں صبح شام کھانا وغیرہ پہنچا دیا کروں گی۔"

ہم واقعی اس بک بک جھک جھک سے تنگ آگئے تھے۔ میں نہ رہ سکا میں نے مادھوی سے کہا۔

"میڈم اس چوہے بلی کے کھیل سے تو بہتر ہے کہ ہم دریا کے ساتھ ساتھ جنگل میں نکل پڑتے ہیں۔ میرے پاس ریوالور ہے کیپٹن کے پاس چاقو ہے۔ ہم اپنا دفاع کر سکتے

گے۔"

مادھوی نے جھونپڑے میں موم بتی روشن کر کے ایک اینٹ پر جمادی تھی۔ کہنے لگی۔

"میری طرف سے بے شک ابھی نکل پڑو۔ میں تمہیں بالکل نہیں روکوں گی۔ آخر مجھے کیا ضرورت ہے کہ تمہارے لئے ایمبولینس لے کر ماری ماری پھرتی رہوں؟ ٹھیک ہے مجھے کیپٹن جمشید اچھا لگتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ یہ دوبارہ بھارتی پولیس کے ٹارچر سنٹر میں جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں نے جان بوجھ کر تم لوگوں کو روکا ہوا ہے"

میں نے معذرت کے انداز میں کہا۔

"میڈم! پلیز ایسا نہ سمجھو۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تم نے جان بوجھ کر ہمیں روکا ہوا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم بار بار جگہ بدلی کرنے سے بور ہو گئے تھے۔"

کیپٹن جمشید نے بھی مادھوی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میڈم! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں تم نے ہمارے لئے خاص طور پر میرے لئے جس طرح اپنا کریئر اور اپنی جان تک خطرے میں ڈالی ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

مادھوی کی کافی دل جوئی ہو گئی وہ مسکرانے لگی۔

"کیپٹن جمشید میں بڑی صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ یقین کرو مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ اگر محبت نہ ہوتی تو میں کبھی یہ قدم نہ اٹھاتی۔"

مادھوی اٹھ کر جھونپڑی سے باہر چلی گئی۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"تم خوش قسمت ہو کیپٹن کہ یہ عورت تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ ورنہ تمہیں جیل کے جزیرے سے فرار کروانے میں کافی مشکلات پیش آسکتی تھیں اور ہم پکڑے بھی جا سکتے تھے۔"

مادھوی جھونپڑے میں آئی تو اس نے اخبار میں لپٹا ہوا ایک پارسل اٹھا رکھا تھا۔ کہـ
لگی۔

"اس میں بریانی ہے۔ یہ میں نے تمہارے لئے خاص طور پر خریدی ہے۔ تھرم
میں چائے بھی موجود ہے۔ تمہاری رات آرام سے گزر جائے گی۔ میں کل شام کے وق
آؤں گی اور مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں کے یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرے
ہی آؤں گی۔ مادھوی تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ ہم نے کاغذ کا پارسل کھولا اخبار ے
کاغذوں کے اندر کیلے کے پتوں میں گرم گرم بریانی تھی۔ آپ ضرور سوچیں گے کہ ا
علاقے میں بریانی کہاں سے آگئی۔ میں اس علاقے میں رہا ہوں اور میری داستان پڑ
والوں میں سے جو حضرات جنوبی ہند کے شہروں میں رہ چکے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ جنو
ہند میں بریانی بہت عام پکائی جاتی ہے۔ ہوٹلوں ریستورانوں یہاں تک کہ چھوٹے چھو
ریلوے سٹیشنوں پر بھی بریانی کے پارسل مل جاتے ہیں۔ گاڑی کھڑی ہوتی ہے تو پھیر
والے لڑکے پارسل پارسل کی آوازیں لگاتے پلیٹ فارم پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ انہو
نے کیلے کے پتوں میں لپٹی ہوئی بریانی کے پارسل ٹوکری میں رکھے ہوتے ہیں۔ آپ ک
کے پتے ہٹائیں تو اس کے نیچے گرم گرم بریانی نکل آتی ہے جس میں گوشت کے چھو
چھوٹے ٹکڑوں کے علاوہ خوب مصالحے ڈالے ہوتے ہیں یہ کھانا وہ عرب تاجر اپنے سا
لائے تھے جو قدیم زمانے میں بصرے کی بندرگاہ سے مال لے کر جہازوں کے ذریعے آ
تھے اور ہندوستان کے جنوبی ساحلی شہروں سے ہوتے ہوئے ملایا اور انڈونیشیا اور فلپا
تک تجارت کی غرض سے جاتے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد ان تاجروں کے ساتھ مسلما
بزرگ علماء حضرات بھی ضرور آتے تھے۔ ان علاقوں میں ان مسلمان بزرگوں کے ذر
اسلام کی شمعیں روشن ہوئیں۔ مالدیپ اور سنگل دیپ اور جنوبی ہندوستان کے سا
علاقوں میں آج بھی اس زمانے کی قدیم مسجدیں آباد ہیں اور ان مسجدوں سے پانچ و
اذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

وہ رات ہم نے ایک جھونپڑے میں بڑی مشکل سے گزاری۔

مچھروں نے جھونپڑے کی اندر اور باہر یلغار کر رکھی تھی۔ اتنے مچھر میں نے آج تک کسی جنگل میں نہیں دیکھے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ ہم مچھروں کے کارخانے میں آگئے ہیں جہاں ایک سیکنڈ میں ایک ہزار مچھر پیدا ہو رہے ہیں۔ ہم ان خونی مچھروں سے بچنے کے لئے وہاں آگ بھی نہیں جلا سکتے تھے۔ خطرہ تھا کہ آگ دیکھ کر کوئی ادھر نہ آجائے۔ خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی اور مچھروں سے پیچھا چھوٹا۔ صبح ہم نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا چہرے مچھروں کے کاٹے سے سوج ہوئے تھے۔ دن کے دس بجے کے قریب مادھوی آئی۔ ہم اس وقت جھونپڑے کے اندر چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے لئے کھانا وغیرہ لائی تھی۔ ہمارے چہرے دیکھ کر اور مچھروں کے حملے کا سن کر کہنے لگی۔

"تم لوگوں نے بڑی عقلمندی سے کام لیا کہ آگ روشن نہیں کی۔ یہ جگہ بدروائی سٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہے اور آگ کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی ضرور ادھر آجاتا۔ سٹیشن پر ایلور پولیس نے ناکہ بندی کی ہوئی ہے۔"

اس نے ہمیں اتنا ڈرا دیا کہ دوسری رات بھی ہم نے آگ نہ جلائی اور مچھروں سے ہاتھا پائی کرتے رہے۔ دوسری رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی۔ دوسرے دن مادھوی دن کے بارہ بجے آئی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی کہنے لگی۔

"بدروائی گھاٹ سٹیشن پر رات پولیس ایک ٹرین کو روک کر دو گھنٹے تلاشی لیتی رہی۔"

اس نے کیپٹن جمشید کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مائی ڈیئر کیپٹن جمشید! مجھے معلوم ہی نہیں تھا پولیس کے پاس تمہاری تصویر موجود ہے۔ یہ تصویر جیل میں لی گئی تھی۔ اب تم لوگوں کا یہاں سے فوری طور پر نکلنا اور مشکل ہو گیا ہے۔"

کیپٹن جمشید یہ سن کر ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا کہ جیل کے حکام نے اس کی تصویر پولیس کو دے دی ہے۔ کہنے لگا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جیل میں میری کبھی کوئی تصویر نہیں اتاری گئی۔"

مادھوی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ تمہیں وہاں اتنا ٹارچر کیا گیا تھا کہ تمہیں تو اپنی ہوش نہیں تھی۔ تم کئی بار بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جیل کے لوگ تمہاری تصویر کسی وقت بھی اتار سکتے تھے۔"

ہم پر مادھوی کی باتوں نے مایوسی طاری کر دی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس جہنم کے جھونپڑے میں ہمیں اور کتنی راتیں گزارنی ہوں گی تو وہ بولی۔

"میں ابھی اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ پولیس چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ پیچھے بدروائی گھاٹ سٹیشن پر تو پولیس نے چھاؤنی ڈال دی ہے اور میری اطلاع کے مطابق پولیس کے گشتی دستے دریا کی دونوں جانب تمہاری تلاش میں گشت لگا رہے ہیں۔"

یہ سن کر ہم پر مزید مایوسی چھا گئی۔ مادھوی اگلے روز آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ دن ہم نے جھونپڑی کے اندر اور کبھی جھونپڑی سے باہر نکل کر ادھر ادھر جھاڑیوں اور درختوں کے نیچے چھپ کر گزار دیا۔ تیسری رات کو آسمان پر بادل چھا گئے۔ بجلی چمکنے لگی۔ بادل گرجنے لگے اور موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ ہم جھونپڑی میں بیٹھے تھے۔ بارش کی وجہ سے مچھروں سے تھوڑی سی نجات مل گئی تھی مگر ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ جھونپڑے کی چھت جگہ جگہ سے ٹپکنے لگی۔ پہلے ٹپکتی رہی۔ پھر پرنالوں کی طرح بارش

جھونپڑی کے اندر ہمارے اوپر گرنے لگا۔ ہم کبھی ایک طرف ہو جاتے کبھی دوسری طرف ہو جاتے۔ جھونپڑی نشیبی جگہ پر تھی۔ اس کے اندر بھی پانی آگیا۔ ہم جھونپڑی سے نکل کر بارش میں بھیگتے ہوئے ذرا اوپر ایک اونچی جگہ پر درختوں کے نیچے چلے گئے۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ درخت بری طرح ٹپک رہے تھے۔ مگر ہمارے سامنے دوسری کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہیں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے رہے۔ اور رات گزر گئی۔

بارش پچھلے پہر رک گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے درخت سے ٹیک لگا کر بارش میں ٹپکتے درختوں کے نیچے کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے سو بھی گئے تھے۔ دن کی روشنی میں دیکھا کہ نیچے جھونپڑے بارش کے پانی میں تیر رہے تھے۔ ناچار اسی اونچی جگہ پر بیٹھے رہے۔ آدھا دن گزر گیا۔ مادھوی کی گاڑی کہیں نظر نہ آئی۔ بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے پچھلی شروع رات کو تھوڑے سے چاول کھائے تھے اور پانی پیا تھا اور اب دن آدھا گزر گیا تھا۔ میں تو اس سے بھی زیادہ دیر تک بھوک اور پیاس برداشت کر سکتا تھا مگر کیپٹن جمشید کے ہونٹ پیاس سے خشک ہو رہے تھے۔ کہنے لگا۔

"میں بارش کا پانی پینے لگا ہوں"

میں نے اسے کہا۔

"جسے تم بارش کا پانی کہتے ہو اس میں گندا پانی بھی شامل ہے۔ یہ پینے سے بیمار پڑ جاؤ گے۔"

تیسرے پہر جا کر کہیں بارش کا پانی اترا اور ہم کیچڑ میں سے گزرتے ہوئے جھونپڑی میں آ گئے۔ ٹھیک اس وقت مادھوی کی ایمبولینس آگئی۔ اس وقت مجھے مادھوی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس عورت نے جان بوجھ کر ہمیں روک رکھا ہے اور ہمیں پولیس کا خوف دلا کر آگے نہیں جانے دے رہی۔ وہ ہمارے لئے کھانا اور گرم کافی سے بھرا ہوا تھرمس لائی تھی۔ کہنے لگی۔

"رات کی بارش نے ہر طرف جل تھل ایک کر دیا ہے۔ میں تمہارے لئے قیمے کی

کھچڑی پکوا کر لائی ہوں۔ یہ حیدر آباد کی خاص سوغات ہے۔"

میں نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

"مس مادھوی! پلیز ہمیں واضح طور پر بتا دو کہ آخر ہم کب تک یہاں پڑے رہیں گے۔"

مادھوی سنجیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ ڈرامہ کر رہی ہوں؟ ٹھیک ہے اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں رہا تو بے شک یہاں سے چلے جاؤ۔ لیکن اگر پولیس نے تمہیں یہاں سے نکلتے ہی پکڑ لیا تو ہرگز ہرگز میرا نام کسی کے آگے نہ لینا"

کیپٹن جمشید نے نرم لہجے میں معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں میڈم۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں ہمیں یہاں مچھروں نے پریشان کر رکھا ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

مادھوی کا چہرہ ابھی تک سنجیدہ تھا۔ ہم کافی پی رہے تھے کہنے لگے۔

"میں جو کچھ کر رہی ہوں تمہارے بھلے کے لئے ہی کر رہی ہوں۔ اپنے شوق کے لئے نہیں کر رہی۔"

میں نے مایوسی کے ساتھ پوچھا۔

"ہمیں تمہارے اندازے کے مطابق یہاں مزید کتنے دن رکنا ہو گا؟"

وہ پہلے تو کچھ نہ بولی پھر کہنے لگی۔

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہاں سے میں سیدھی بدروائی گھاٹ کے سٹیشن کر حالات کا جائزہ لوں گی۔ کل کسی وقت آ کر تمہیں بتاؤں گی۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"کیپٹن! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں میڈم مادھوی کی باتوں پر نہیں جانا چاہئے۔ یہاں سے اپنے طور پر نکل جانا چاہئے۔"

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"میں تو پہلے بھی تمہیں یہی کہتا تھا اور اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ ہمیں اس عورت پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے"

میں نے کہا۔

"یہ عورت تمہاری محبت میں ایک عجیب کھیل کھیل رہی ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ عورت تمہیں اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتی۔ یہ محبت کا منفی کھیل کھیل رہی ہے۔"

کیپٹن جمشید کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھرنے لگیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے تو پھر تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے جواب میں کہا۔

"کل کا دن دیکھ لیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کل یہ عورت آ کر ہمیں کیا بتاتی ہے۔"

وہ دن اور رات بھی ہم نے جھونپڑے میں اور کبھی جھونپڑے سے باہر درختوں میں گزار دی۔ دوسرے دن بارش نہ ہوئی جس کے لئے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت مادھوی آئی۔

وہ گھبرائی ہوئی تھی یا گھبراہٹ کی اداکاری کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"بدروائی گھاٹ پر تو پولیس کی بھاری نفری موجود ہے۔ پولیس کے پاس کیپٹن جمشید کی تصویروں کی کاپیاں موجود ہیں اور پولیس ہر مسافر کو غور سے دیکھنے کے بعد سٹیشن سے باہر جانے کی اجازت دیتی ہے۔"

اس کے بیان کے مطابق حالات زیادہ سنگین تھے۔ اس نے ہمیں خاص طور پر تاکید کی کہ ہم رات کے وقت بھی جھونپڑی سے باہر نہ نکلیں۔ وہ ہمارے لئے جو تھوڑا بہت کھانا لائی تھی وہ ہم نے کھایا۔ ہمارے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مادھوی دوسرے روز آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ جب وہ چلی گئی تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ہمارے چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے ہیں میں نے کیپٹن سے پوچھا۔

"کیا خیال ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک خیال ہے۔ ہمیں آج رات یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

میں نے اپنی پتلون کی جیبوں کی تلاشی لی۔ میرے پاس انڈین کرنسی کے چالیس پینتالیس روپے تھے۔ ریوالور بھی تھا اور کچھ فالتو گولیاں بھی تھیں جو میں نے پتلون کی عقبی جیب میں ڈال رکھی تھیں۔

ہمیں مادھوی کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ بدروائی گھاٹ کا سٹیشن وہاں سے پیچھے کی جانب زیادہ دور نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہاں سے برانچ لائن پر گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"بدروائی سٹیشن پر پولیس موجود ہے۔ ہمیں یہاں سے آگے جا کر کسی سٹیشن پر سے گاڑی پکڑنی چاہئے۔"

میں نے بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا۔

"کیپٹن جمشید! مادھوی جھوٹ بولتی ہے۔ مجھے یقین ہے بدروائی سٹیشن پر پولیس نے کوئی ناکہ بندی نہیں کر رکھی اور پولیس کے پاس تمہاری کوئی تصویر بھی نہیں ہے۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر ہم بدروائی گھاٹ سٹیشن کی بجائے یہاں سے لائنوں لائن آگے کی جانب جا کر کسی چھوٹے سٹیشن سے گاڑی پکڑیں گے۔"

"تو پھر ابھی یہاں سے نکل پڑتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ ابھی دن کی روشنی باقی ہے شام ہونے کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔"

اس وقت سورج غروب ہونے والا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سورج بادلوں کے پیچھے غروب ہو گیا اور شام کا اندھیرا بادلوں کی وجہ سے جلدی چھا گیا۔ ہمارے پاس کوئی سامان وغیرہ تھا نہیں۔ تین کپڑوں میں تھے۔ کیپٹن جمشید کے کپڑے بوسیدہ ہو رہے تھے۔ اس آدھے بازوؤں والی قمیض اور پرانی پتلون پہن رکھی تھی۔ جیل میں بھی اس کا یہی لباس

رہا تھا۔ یہاں آ کر اس نے ایک بار دونوں کپڑے دھو کر تھوڑے بہت صاف کر لئے تھے۔ میں نے قمیض کے اوپر ٹھنڈی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اگرچہ دھوپ میں مجھے گرمی لگتی تھی مگر میں اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے آگے کشمیر جانا تھا جہاں جنوبی ہند کے مقابلے میں موسم زیادہ ٹھنڈا تھا۔

ہم اللہ کا نام لے کر جھونپڑے سے نکل کر اس طرف روانہ ہو گئے جس طرف مادھوی نے کہا تھا کہ بدروائی گھاٹ کا سٹیشن ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ ریلوے لائن پر کسی طرح پہنچ جائیں۔ دریا بائیں جانب تھا۔ اندھیرا ابھی اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا۔ جھونپڑے کے آس پاس جو درختوں کے ذخیرے تھے ہم بہت جلد ان میں سے نکل گئے۔ آگے ایک پگ ڈنڈی مل گئی۔ یہاں کھیت تھے کچھ فاصلے پر ہمیں ریل کے سگنل کی سرخ بتی نظر آ گئی میں نے کیپٹن جمشید کو بتی دکھا کر کہا۔

"اچھا ہوا۔ ریلوے لائن ہمیں مل گئی ہے۔"

کھیتوں میں سے گزرنے کے بعد ہم ریلوے لائن پر چڑھ گئے۔ پیچھے کی جانب دیکھا تو بدروائی گھاٹ ریلوے اسٹیشن کی بتیاں جھلملا رہی تھیں ہم نے آگے کی طرف ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آگے جو سٹیشن ہے وہ کتنی دور ہو گا۔ اتنا ضرور اندازہ تھا کہ اس علاقے میں ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن کا فاصلہ تین چار میل سے زیادہ نہیں رہتا۔ کیپٹن جمشید نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اگلا سٹیشن کوئی معمولی سا سٹیشن ہو اور گاڑی وہاں نہ رکتی ہو"

میں نے اسے جواب دیا۔

"بھائی جی! ریلوے والوں نے اگر وہاں کوئی سٹیشن بنایا ہے تو کوئی نہ کوئی گاڑی تو وہاں ضرور رکتی ہو گی۔ ہم کسی ایسی ہی گاڑی کا وہاں انتظار کریں گے۔"

میرا خیال ہے ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کوئی تین چار میل تک چلتے گئے۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ بادل جھکے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ اس دوران پیچھے سے ایک گاڑی آ گئی۔ ہم ریلوے لائن سے نیچے اتر آئے۔ گاڑی

شور مچاتی زمین ہلاتی گزر گئی۔ ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ مسافروں کے چہرے بھی نظر آرہے تھے۔ ٹرین گزر گئی جمشید نے کہا۔

"یہ کوئی میل ٹرین لگتی تھی۔"

میں نے کہا۔

"پسنجر ٹرین بھی ہوتی تو ہمیں کوئی فائدہ نہیں تھا"

ٹرین کے پچھلے ڈبے کی سرخ بتی دور تک نظر آتی رہی۔ پھر اسے رات کے اندھیرے نے اپنے اندر جذب کر لیا۔ ہم بہت دیر تک چلتے رہے۔ ہمارے جسم پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ بارش نہیں شروع ہو گئی تھی۔ ورنہ وہاں بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ راستے میں ندی نالوں کے تین چار چھوٹے چھوٹے بھی آئے۔ ایک جگہ ہم نے تھوڑی دیر بیٹھ کر ذرا آرام بھی کیا۔ اس کے بعد پھر لگے۔

کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد ہمیں دور سے سرخ بتی دکھائی دی۔ میں نے کہا جمشید سے کہا۔

"یہ سٹیشن کے سگنل کی بتی ہے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

اس کے باوجود ہمیں سگنل تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا جس کا ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ چھوٹا سا ایک کمرہ تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی اور ایک آدمی بیٹھا بڑے سے رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کا گیٹ بھی کھلا تھا۔ ہم لائن پر چلتے ہوئے آئے تھے۔ چنانچہ سیدھا پلیٹ فارم پر چڑھ گئے تھے۔ گیٹ کے آگے چھوٹا سا برآمدہ تھا جہاں ایک قلی کونے میں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"تم پلیٹ فارم پر ہی رہو۔ میں قلی سے گاڑی وغیرہ کا پتہ کرتا ہوں"

مجھے اس علاقے کے لوگوں کا کافی تجربہ تھا۔ میں نے قلی کے پاس جا کر پوچھا کہ بدروائی گھاٹ سے اگلی گاڑی کب آئے گی۔ چونکہ یہ علاقہ حیدر آباد دکن کی ریاست

علاقہ تھا اس لئے یہاں کے لوگ تلیگو زبان کے علاوہ خاص طور پر مسلمان بڑی اچھی اردو بول لیتے تھے۔ اگرچہ وہ قاف کو خاف بولتے تھے۔ یا ہمیں ایسا لگتا تھا کہ قاف کو خاف بول رہے ہیں۔ میں نے قلی سے اردو میں ہی پوچھا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"تمہیں کہاں جانا ہے بابو؟"

مجھے تو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس لائن پر آگے کون کون سے شہر آتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"بھائی مجھے حیدر آباد جانا ہے۔ یہاں ایک دوست کے پاس آیا تھا۔ وہ نہیں ملا۔ سوچا بدروائی گھاٹ پر جا کر گاڑی پکڑنے کی بجائے یہاں سے کوئی گاڑی پکڑ لیتا ہوں۔"

قلی مسلمان تھا کہنے لگا۔

"بابو! یہاں کوئی میل ٹرین نہیں ٹھہرتی اور حیدر آباد تو یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی نہیں جاتی۔"

میں نے کہا۔

"بھائی صاحب کوئی پسنجر ٹرین بھی نہیں جاتی؟"

قلی نے کہا۔

"میاں جی! رات گیارہ بجے ایک پسنجر ٹرین بدروائی سے آئے گی اس میں بیٹھ جائیں۔ وہ آپ کو گدوپا سٹیشن پر پہنچا دے گی۔ وہاں سے آپ کو کرنول جانے والی دوسری گاڑی پکڑنی پڑے گی۔ وہ گاڑی آپ کو حیدر آباد لے جائے گی۔ سمجھ گئے؟"

میں نے کہا۔

"شکریہ بھائی صاحب یہ بتائیں کہ حیدر آباد کا ٹکٹ کہاں سے لیں؟"

"اسی سٹیشن سے لے لیجئے۔ جی ہاں"

"اندر بابو بیٹھا ہے۔"

سٹیشن کے آفس کا ایک ہی کمرہ تھا جہاں ایک آدمی بڑا سا رجسٹر کھولے اس میں کچھ اندراج کر رہا تھا۔ میں نے جا کر آداب عرض کیا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ کیا

بات ہے؟

میں نے کہا۔

"حیدر آباد کے دو ٹکٹ چاہئیں"

"سیکنڈ کے فسٹ کے یا تھرڈ کے"

میں نے کہا۔

"تھرڈ کلاس کے"

وہ میری طرف دیکھے بغیر اٹھ کر ایک الماری کے پاس گیا۔ اس میں سے زرد رنگ کے دو ٹکٹ نکال کر ایک مشین میں ڈال کر اس پر تاریخ ڈالی اور میری طرف بڑھا ہوئے جتنے پیسے بنتے تھے وہ بتائے۔ اس وقت اس نے میری طرف دیکھا۔ مگر میرے لبا اور میرے حلیئے نے اس پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ میں نے پوری رقم گن کر اس کے حوالے اور ٹکٹ جیب میں ڈال کر پلیٹ فارم پر آگیا۔ پلیٹ فارم بالکل خالی پڑا تھا۔ میں کیپٹ جمشید کو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ فاصلے پر اندھیرے میں سے نکل کر بجلی کے کھمبے روشنی میں گیا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔

میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

"ٹکٹ تو میں لے آیا ہوں۔ گاڑی رات گیارہ بجے کے بعد آئے گی۔ پسنجر ہوگی۔ اس میں بیٹھ کر ہم گڈوپا سٹیشن تک جائیں گے۔"

"وہاں سے ہم کرنول جانے والی گاڑی پکڑیں گے۔ وہی گاڑی ہمیں حیدر آباد لے جائے گی۔"

"اور حیدر آباد سے آگے کہاں جانا ہوگا؟"

میں نے کہا۔

"بھائی جی پہلے حیدر آباد تو پہنچ جائیں اس کے بعد ظاہر ہے وہاں سے دلی اور دلی جموں کشمیر کی طرف ہی جانا ہوگا"

کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ کشمیر کے محاذ پر جا کر اپنے حریت پرست کشمیری جانبازوں کے ساتھ مل کر بھارتی قابض فوج کے خلاف لڑوں۔ لیکن میری ایک مجبوری ہے۔"

"مجبوری کون سی ہے؟" میں نے پوچھا۔

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"میں پاکستان کی جانباز فورس کا کیپٹن ہوں۔ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے بھارت کی قید میں چلا گیا تھا۔ اب قید سے فرار ہوا ہوں تو فوجی ڈسپلن کا تقاضا ہے کہ میں سب سے پہلے اپنے یونٹ میں جا کر یونٹ کمانڈر کو رپورٹ کروں۔"

میں نے کہا۔

"پھر تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم پہلے پاکستان جا کر یونٹ کمانڈر کو رپورٹ کرو۔"

"ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔ میرے خیال میں مجھے راجستھان کے علاقے سے بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونا چاہئے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے پوچھا۔

"کیا تم اس بارڈر سے واقف ہو؟"

"پینسٹھ کی جنگ میں میں راجستھان کے محاذ پر لڑ چکا ہوں۔ یہ بڑا وسیع بارڈر ہے۔ وہاں سے میں پاکستان میں داخل ہو جاؤں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ پھر ایسا ہے کہ ہم حیدر آباد سے سیدھا جے پور کی طرف نکل چلیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں انڈیا کا بارڈر کراس کرانے کے بعد میں کشمیر کے محاذ پر جاؤں۔"

کیپٹن جمشید نے کہا۔

"یہ تمہاری مجھ پر خاص عنایت ہوگی۔ کیونکہ تم راجستھان کے بھارت والے علاقے سے بہت زیادہ واقف ہو۔"

"عنایت کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ میرا فرض ہے۔"

ہم اس چھوٹے سے مضافاتی سٹیشن پر رات کی خاموشی میں ایک خالی بنچ پر بیٹھے

باتیں کر رہے تھے۔ رات گیارہ بجے کے بعد پسنجر ٹرین آ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ آ کر سٹیشن پر کھڑی ہو گئی کچھ مسافر ٹرین سے اترے۔ ٹرین پر چڑھنے والے مسافروں میں ہم صرف دو ہی تھے۔ گاڑی دیر تک کھڑی رہی۔ پھر انجن نے سیٹی بجائی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کافی مسافر تھے۔ تقریباً سبھی مسافر اپنی اپنی جگہ پر یا سو رہے تھے اور یا اونگھ رہے تھے۔ میں اور کیپٹن جمشید ڈبے کے کونے میں بیٹھے تھے۔ ٹرین کی رفتار تیز نہیں تھی۔ بس ایک خاص رفتار سے چل جا رہی تھی۔ راستے میں کوئی بھی سٹیشن آتا تو کھڑی ہو جاتی۔

ساری رات گزر گئی۔ دن نکلا تو ٹرین نیم پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ یہ دکن کی سطح مرتفع کا علاقہ تھا۔ زمین پتھریلی تھی سرمئی اور سرخ رنگ کی پہاڑیاں تھیں۔ پہاڑیاں ختم ہوتیں تو میدان شروع ہو جاتے۔ کہیں جنگل آ جاتا۔ دریا بھی آئے ندی نالے بھی آئے۔ برانچ لائن تھی۔ کئی سٹیشن آئے جن کے نام مجھے کبھی یاد نہیں رہ سکتے تھے۔ سارا دن ٹرین چلتی رہی۔ پھر شام ہو گئی۔ پھر رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ کرنول ابھی تک نہیں آیا تھا۔ رات کے گیارہ بجے جا کر کہیں کرنول کا سٹیشن آیا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ کافی بڑا جنکشن تھا۔ یہاں سے ہمیں حیدر آباد جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔ یہ ٹرین ہمیں ڈیڑھ گھنٹے بعد ملی۔ وہاں سے حیدر آباد کافی دور تھا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ باقی پوری رات اور دوسرے روز کا آدھا دن گزر گیا۔ تب کہیں جا کر حیدر آباد کا سٹیشن آیا۔

حیدر آباد کا سٹیشن بڑا بارونق اور خوبصورت تھا۔ چونکہ ہمارے سفر کا پروگرام تبدیل ہو گیا تھا اور اب ہمیں کشمیر کی طرف نہیں بلکہ راجستھان کی طرف جانا تھا۔ اس لئے میں نے سٹیشن کے باہر نکل کر حیدر آباد سے اجمیر شریف کے دو ٹکٹ خریدے اور واپس آ ایک ٹکٹ کیپٹن جمشید کو دیا اور ایک ٹکٹ اپنے پاس رکھ لیا۔ حیدر آباد سے اجمیر شریف تک کا ریل کا سفر بڑا لمبا سفر تھا۔ سارے وسطی ہندوستان میں سے گزر کر انڈیا کے ش مغربی علاقے میں جانا تھا۔ راستے میں بھوپال کے علاوہ اور بھی کئی بڑے بڑے شہر آ۔ اجمیر تک پہنچنے میں ہمیں ایک رات اور دو دن لگ گئے۔ اجمیر شریف راجستھان میں د

ہے اور انڈیا کا مشہور شہر ہے۔ یہ چونکہ انڈیا کے بارڈر کا شہر تھا اس لئے ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ اجمیر شریف میں میں اس سے پہلے دو تین مرتبہ آ چکا تھا۔ ہم جس وقت یہاں پہنچے دن ڈھل رہا تھا۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"ہمیں یہاں رکنا نہیں ہوگا۔ یہاں سے ہمیں بیکانیر جانا ہوگا۔ بیکانیر سے بارڈر کا قصبہ گنگا نگر اوپر کی جانب زیادہ دور نہیں ہے۔"

میرے پاس پیسے بہت کم رہ گئے تھے۔ میں نے اجمیر شریف سے بیکانیر کے تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ لے لئے اس کے بعد میرے پاس دس بارہ روپے ہی باقی رہ گئے۔ اجمیر سے ہمیں کافی دیر بعد بیکانیر جانے والی گاڑی ملی یہ صحرا کا سفر تھا۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ نظر آ جاتے تھے۔ ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ صبح کے وقت ہم بیکانیر پہنچے۔ بیکانیر کے سٹیشن سے ہم باہر نکل آئے۔ کیپٹن جمشید نے مجھ سے کہا۔

"گنگا نگر یہاں سے کتنی دور ہے اور کیا ہمیں اسی وقت گنگا نگر کی طرف روانہ ہو جانا ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ ہم یہاں کسی ہوٹل میں ٹھہر کر تھوڑی دیر آرام کر سکیں۔ اس لئے ہمیں اسی وقت آگے چلنا ہوگا۔"

گنگا نگر کے لئے بیکانیر سے اوپر کی جانب کوئی سو میل کے فاصلے پر مہاجن نام کا ایک سٹیشن ہے۔ وہاں سے ہمیں گنگا نگر کے بارڈر کے قصبے تک اونٹوں پر سفر کرنا تھا۔ چنانچہ ہم نے بیکانیر سے دوپہر کے وقت ایک ٹرین پکڑی اور دو گھنٹوں کے سفر کے بعد مہاجن نام کے ریلوے سٹیشن پر اتر گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ سٹیشن کے باہر ایک جانب چھوٹی سی آبادی تھی۔ دائیں بائیں دور دور تک ریت کے ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ ان ٹیلوں پر سورج غروب ہوتے ہوئے جھلکتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسی قصبے سے مغرب کی جانب دو کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سرائے ہے جہاں سے اونٹوں پر سوار ہو کر لوگ گنگا نگر کو جاتے ہیں۔ میں نے کیپٹن جمشید کو ساری بات سمجھائی اور ہم سرائے

تک جانے کے لئے ریت کے ٹیلوں کی طرف چل پڑے۔ صحرا میں چھوٹی سی کچی سڑک تھی جس پر ہم آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ سورج ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو گیا تھا او ٹیلوں کے سائے شام کے سایوں میں گھل مل رہے تھے۔ صحرائی شام کی خوشگوار ہوا چلنے لگی تھی۔ گرمی کی شدت ختم ہو رہی تھی ۔ اس وقت مجھے چندریکا کی بدروح کا خیال آگیا۔

ایک مدت ہوئی اس سے میرا پیچھا چھوٹ چکا تھا۔ اب اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اس کے خیال کو دل سے نکال دیا اور سوچنے لگا کہ میرے پاس صرف تین چار روپے ہی باقی بچے ہیں۔ ان پیسوں میں میں سری نگر تک تو کیا دلی میں اپنے آدمی گل خان تک بھی نہیں پہنچ سکوں گا۔ میں نے اس خیال کو بھی اپنے ذہن سے نکال دیا۔ کمانڈو اگر اپنے مشن کے دوران اس قسم کی باتیں سوچنے لگے تو وہ اپنے مش میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ کمانڈو ہر حالت میں اپنے مشن کی کامیابی کے امکانات کے بارے میں ہی سوچتا ہے اور وہ جہاں جاتا ہے وہاں ضروری وسیلے پیدا کر لیتا ہے۔ ابھ رات کا اندھیرا پوری طرح سے نہیں چھایا تھا کہ ہم ایک ٹیلے کے پاس چھوٹی سی سرا میں آگئے۔

یہاں کچھ اونٹ کھڑے تھے جن پر تیل کے کپے اور دوسرا سامان لادا جا رہا تھا دو تین اونٹ بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ میں شکل وصورت اور پہناوے سے راجستھان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو پہچان لیتا تھا۔ راجستھان کے مسلمانوں کی ڈاڑھیاں اور مونچھ ایک خاص وضع کی ہوتی ہیں۔ میں کیپٹن جمشید کو لے کر کچھ فاصلے پر کیکر کے چھوٹے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں ایک طرف پانی سے بھرا ہوا مٹکا رکھا ہوا تھا ہم نے اس میں نکال کر پیا۔ تاہم سٹیشن سے کھا کر چلے تھے۔ کیپٹن جمشید کہنے لگا۔

"ہمارے لباس یہاں کے لوگوں ایسے نہیں ہیں۔ کہیں انہیں شک تو نہیں ہو گا کہ بارڈر کراس کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں لوگ بارڈر کراس کرتے ہی رہتے ہیں۔ خطرہ صرف اس بات کا ہے کہ یہاں کوئی بارڈر سیکورٹی فورس کا خفیہ آدمی نہ بیٹھا ہو۔ اسے اگر شک پڑ گیا تو وہ ہمیں پکڑوا سکتا ہے۔ لیکن میرے پاس ریوالور موجود ہے۔ اتنی آسانی سے ہم پکڑے جانے والے نہیں ہیں۔"

تین چار دیہاتی آدمی اونٹوں پر سامان وغیرہ لاد کر اسے رسیوں سے باندھ رہے تھے۔ سرائے ایک کچا کوٹھا سا تھا۔ اس کے باہر بانس کے ساتھ ایک لالٹین روشن کر دی گئی تھی۔ میں نے کیپٹن سے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں"

میں اٹھ کر سرائے کے پاس آگیا سرائے کے باہر دوسری جانب دیہاتی عورتیں بچے اور مرد بیٹھے تھے۔ شاید یہ مسافر تھے اور آگے بارڈر کے کسی گاؤں جا رہے تھے۔ ایک بوڑھا قریب ہی ریت پر بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مزے سے چلم پیتا رہا۔ میں نے کہا۔

"بابا! یہاں سے راج گڑھ کو قافلہ کب جائے گا؟"

مجھے معلوم تھا کہ گنگا نگر جانے کی بجائے وہاں سے اگر ہم راج گڑھ کی طرف نکل جائیں تو راج گڑھ سے ایک راستہ بارڈر کی طرف جاتا ہے۔ یہ بارڈر بڑا وسیع تھا اور انڈیا لی سیکورٹی فورس کی جیپیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بارڈر کے ساتھ ساتھ گشت کرتی ہتی تھیں۔ اس بوڑھے نے کہا۔

"تھوڑی دیر میں تین چار اونٹ اس طرف جانے والے ہیں۔ یہ مسافر بھی راج ڑھ جانے کے لئے ہی بیٹھے ہیں۔ تم بابو ہو۔ راج گڑھ چونگی میں نوکر ہو کیا؟"

میں نے کہا۔

"میرا بھائی چونگی میں ملازم ہے میں اور میرا ایک دوست اس کے پاس ضروری کام ے جا رہے ہیں۔"

"بیٹھے رہو۔ گھڑی پل میں تین اونٹ جانے والے ہیں۔"

میں نے ساری بات کیپٹن جمشید کو جا کر بتائی اور پھر ہم دونوں سرائے کی دوسری جانب آکر پہلے جو مسافر وہاں بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ جب سامان بردار اونٹ تیار ہو گئے تو دوسرے تین چار اونٹوں پر عورتوں اور بچوں کو پہلے بٹھایا جانے لگا۔ اس کے بعد تین اور اونٹ وہاں آگئے۔ وہاں سے راج گڑھ کا کرایہ دو روپے فی سواری تھا۔ میرے پاس چھ روپے تھے۔ میں نے چار روپے اونٹوں والے کو دے دیئے۔ ہمیں ایک اونٹ کے اوپر تین بچوں اور ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ پھر چھ سات اونٹوں کا یہ قافلہ راج گڑھ کی طرف چل پڑا۔ اس علاقے میں قافلے عام طور پر رات کو ہی سفر کرتے ہیں۔ کیونکہ رات کے وقت صحرا میں گرمی کی وہ قیامت خیز شدت نہیں ہوتی دن کے وقت ہوتی ہے۔ دن کے وقت تو دھوپ میں صحرا آگ برسا رہا ہوتا ہے۔ اون بڑے مزے مزے سے ریت کے ٹیلوں کے درمیان اپنی منزل کی طرف جا رہے تھے۔

ہمارا قافلہ آدھی رات کے بعد راج گڑھ پہنچا۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں ایک محصول چونگی بھی تھی۔ بارڈر سے جو مال سرکاری طور پر ادھر آتا تھا یہاں اس کا محصول ادا کیا جاتا تھا۔ چونگی کے سٹاف کے لئے یہاں ایک طرف چار پانچ چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ یہ کوارٹر میں پہلے د چکا تھا۔ ان کوارٹروں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دوسرے مسافر اونٹوں پر سے اتر کر گاؤں طرف چل دیئے۔ اونٹوں کو اس کا مالک ہانک کر دوسری طرف لے گیا۔ جدھر ان کے پانی اور چارے کا بندوبست پہلے سے کیا ہوتا تھا۔

میں نے کیپٹن جمشید کو ساتھ لیا اور کوارٹروں کے پیچھے آگیا۔ یہاں ایک ٹیلے عقب میں ایک جگہ کھجوروں کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس جھنڈ میں میں پہلے بھی رات بسر کر چکا تھا۔ یہاں آکر میں نے کیپٹن سے کہا۔

"ہمیں رات یہیں گزارنی ہوگی۔"

ہم ٹھنڈی ریت پر لیٹ گئے۔ کیپٹن کہنے لگا۔

"یہاں سے بارڈر میرا خیال ہے زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"تین چار میل اندر کی طرف جانے کے بعد بارڈر کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہم اس وقت ادھر نہیں جائیں گے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ ہم آج کی رات اور کل کا دن یہاں کسی جگہ چھپے رہیں گے کل رات کو تمہیں بارڈر کراس کرادوں گا۔ جب تم بارڈر کراس کر کے دوسری طرف پہنچ جاؤ گے تو میں واپس جاؤں گا۔"

کیپٹن جمشید بولا۔

"تمہیں اتنا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ بارڈر پر ہر طرف خطرہ ہوگا۔ تم صرف انڈیا کے بارڈر کے قریب پہنچا کر واپس چلے جانا۔ آگے میں خود ہی پاکستان پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

وہ رات اور دوسرا دن ہم نے وہیں کھجوروں کے درختوں کے نیچے ہی گزار دیا۔ میرے پاس جتنے پیسے تھے ان میں سے دو ڈھائی روپے کی میں گاؤں میں جا کر روٹیاں اور دال وغیرہ لے آیا۔ جو ہم نے کھا کر اپنی بھوک مٹائی۔ پانی کوارٹروں کے باہر لگے ہوئے نلکے پر جا کر پی لیتے تھے۔ جب سورج غروب ہونے لگا تو میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"اب ہمیں چل پڑنا چاہئے۔"

اس راستے سے میں ایک بار بارڈر کراس کر چکا تھا۔ کیپٹن جمشید کو بھی تھوڑی بہت علاقے کی شناخت ہو گئی تھی۔ کہنے لگا۔

"پینسٹھ کی جنگ میں ہم نے اس سارے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا"

ہم ریت کے ٹیلوں کے درمیان چل رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد میں کسی ٹیلے پر چڑھ کر راستے کا تعین کر لیتا تھا کہ ہم ٹھیک راستے پر ہی جا رہے ہیں۔ کیونکہ صحرا میں آدمی ریت کے ٹیلوں میں اگر بھٹک جائے تو پھر اس کا وہاں سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے ریت کے ٹیلے ختم ہو گئے اور سامنے کھلا صحرا آگیا۔ دور ہمیں کچھ بتیاں جھلملاتی نظر آئیں

تو ہم نے انہیں پہچان لیا۔ یہ انڈیا کے بارڈر کی روشنیاں تھیں۔ وہاں سے ہم دائیں جانب ہو گئے۔ کوئی ایک میل چلنے کے بعد ہمیں زمین میں سے ابھرے ہوئے پتھر دکھائی دیئے جن پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ یہ انڈیا کے بارڈر کے نشان تھے۔ اس کے آگے دونوں سرحدوں کے درمیان کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں ریتلی زمین میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"ہم انڈیا کے بارڈر پر آگئے ہیں۔ یہاں محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ دور سے کسی ٹرک کی بتیاں نظر آئیں ساتھ ہی ٹرک کے انجن کی آواز بھی آنے لگی۔ ہم جلدی سے ایک گڑھے میں اتر کر چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹرک ہمارے قریب سے گزر گیا۔ یہ بارڈر سیکورٹی فورس کا بھاری ٹرک تھا۔ کیپٹن جمشید نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے کہا۔

"دوست! تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اب تم واپس جا سکتے ہو۔ مجھے معلوم ہے آگے کس طرف کو جانا ہے۔ یہ ساری جگہ میری جانی پہچانی ہے۔"

میں نے کیپٹن جمشید سے کہا۔

"اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے میں نے جو کچھ کیا ہے اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہاں سے بارڈر کراس کر کے نکل سکو گے؟"

کیپٹن جمشید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دوست! مجھے پورا یقین ہے تم بس یوں سمجھ لو کہ تم نے مجھے پاکستان پہنچا دیا ہے خدا حافظ!"

میں گڑھے میں ہی رہا اور کیپٹن جمشید گڑھے میں سے باہر نکل آیا۔ اس نے باہر ہی دونوں جانب دیکھا۔ وہاں بارڈر فورس کی کسی گاڑی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ بارڈر فورس کی جیپیں اور ٹرک وقفے وقفے کے بعد گزرتے تھے۔ آسمان پر تارے نہیں ہوئے تھے۔ آسمان کو ہلکے ہلکے بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کیپٹن جمشید نے جھک

منے کی جانب دوڑنا شروع کردیا۔ وہ جب تک صحرا کی دھندلی رات میں نظر آتا رہا۔ میں دیکھتا رہا۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا پھر بھی میں اسی گڑھے میں سر باہر لے دور پاکستان کے بارڈر کی طرف دیکھتا رہا۔ جس طرف پہلے انڈین بارڈر سیکورٹی رس کا ٹرک گیا تھا۔ اس طرف سے کسی گاڑی کے انجن کی آواز اور روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں کیپٹن ان کی نظروں میں نہ آجائے۔ مگر بارڈر رس کی گشتی جیپ تیزی سے میرے سامنے سے گزر گئی۔ میں اس کے بعد بھی کچھ دیر گڑھے کے اندر بیٹھا رہا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ کیپٹن بارڈر کراس کر گیا ہوگا اور دوران مجھے فائرنگ کی بھی کوئی آواز نہ آئی تو میں گڑھے میں سے نکل آیا اور واپس روانہ ہوگیا۔

اس وقت میری جیب میں ایک روپیہ اور کچھ پیسے ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس حساب ے میرے پاس سرائے والے راج گڑھ سے آگے مجھے مہاجن نام کے ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا جہاں سے بیکانیر جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔ اس کے لئے میرے پاس ریل کا کوئی کرایہ نہیں تھا۔ لیکن میں چلتا رہا۔ جب سرائے والے قصبے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں ے اب منہ اندھیرے ہی کوئی اونٹ راج گڑھ کے واسطے مل سکے گا۔ رات میں نے وہیں سرائے کے باہر ریت پر لیٹ کر کھلے آسمان تلے گزاری۔ صبح صبح تین بار بردار اونٹوں کا قافلہ راج گڑھ سے آگے بیکانیر کو جا رہا تھا۔ میں نے اونٹوں کے مالک کو ایک کہانی گھڑ کر سنادی کہ راج گڑھ میں کسی نے میری جیب سے پیسے نکال لئے ہیں اب مجھے بیکانیر پہنچنا ہے اور میرے پاس صرف ایک روپیہ ہی ہے۔ راجستھان کے لوگوں کو میں نے بڑا فراخ دل پایا ہے۔ وہ آدمی ہنس کر بولا۔

"بابو اس اونٹ پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ روپیہ اپنے پاس ہی رکھو۔ تمہارے کام آئے گا"

تیسرے اونٹ پر بڑے بڑے گٹھڑے لدے ہوئے تھے۔ اونٹ ابھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تینوں اونٹ صحرا کی خوشگوار صبح کی فضا میں بیکانیر کی طرف سفر کر رہے تھے۔

بس کسی نہ کسی طرح میں بیکانیر پہنچ گیا مگر اس وقت رات گہری ہو چکی تھی۔ او
ریل گاڑی اجمیر بھوپال کی طرف نہیں جاتی تھی۔ میں نے ٹرین میں دلی تک بغیر ٹکر
کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صبح کے وقت مجھے ایک ٹرین مل گئی۔ بیکانیر سے دلی تک کا
طویل سفر تھا۔ میں نے یہ سفر دو دن اور ایک رات میں مختلف گاڑیاں بدل بدل ک
ٹکٹ کے طے کیا۔ راستے میں کھانا وغیرہ کہاں سے کھایا؟ یہ میں آپ کو نہیں بتاؤ
بہرحال میں دلی گل خان کے پاس پہنچ گیا۔

اسے ساری داستان سنائی۔ اس کے گھر دو دن آرام کیا۔ پتلون قمیض وغیرہ د
اور گرم جیکٹ خرید کر پہنی۔ ریوالور ابھی تک میرے پاس ہی تھا۔ تیسرے دن شا
وقت میں گل خان سے رخصت ہوا اور دلی کے ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ پنجاب میل
ابھی نہیں ہوا تھا۔ یہ گاڑی دلی سے امرتسر جاتی تھی۔ اور اس روز دو گھنٹے لیٹ تھی
سٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے بعد گاڑی آئی تو اس کے ایسے ڈبے میں
ہو گیا جو مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے میں ہم لوگ
آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔ وہاں خفیہ پولیس والے کم ہی آتے ہیں۔ اگر آبھی
تو ہمیں ادھر ادھر چھپنے میں آسانی ہوتی ہے۔

دلی سے جالندھر تک کا سفر اطمینان سے گزر گیا۔ جالندھر سے میں جموں جا
ٹرین میں سوار ہو گیا اور خیریت سے جموں پہنچ گیا۔ جموں میں رات ایک ہوٹل میں
پڑا۔ کیونکہ رات کو وہاں سے کوئی بس سری نگر نہیں جاتی تھی۔ دوسرے روز
ایک لاری میں بیٹھ گیا اور جموں کے نیم پہاڑی علاقے سے نکل کر وادی بانہال اور
کی دلکشا پہاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے سری نگر پہنچ گیا۔ سری نگر پہنچنے کے ایک گ
میں کمانڈو شیروان کی خفیہ کیمپ گاہ میں اس کے سامنے بیٹھا اسے اپنی طویل روداد
تھا۔

کمانڈو شیروان کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میں نے جانباز فورس کے کیپٹن کو بھا
کی قید سے نکال کر پاکستان کی طرف روانہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد کمانڈو شیروان نے

ارتی فوجیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ کشمیری مجاہدوں نے کمانڈوز کے ساتھ مل
ر کپواڑہ کے جنگل میں پندرہ بھارتی فوجی ہلاک کر دیئے تھے اور ان کے گولہ بارود کے
خیرے کو آگ لگا دی تھی۔ میں نے شیروان سے پوچھا کہ بھارتی فوج کی سپلائی لائن کی کیا
پزیشن ہے۔

کمانڈو شیروان نے جیب سے تہہ کیا ہوا مومی کاغذ نکالا اور اسے کھول کر سامنے رکھتے
ئے بولا۔

"بھارتی فوجیوں کی یہاں صرف دو سپلائی لائنیں ہیں۔ یہ دونوں سڑکیں پہاڑیوں میں
ے گزرتی ہوئی کشمیر کی وادی میں داخل ہوتی ہیں۔ یہاں ہمارے مجاہد گھات لگا کر بھارتی
پلائی کی گاڑیوں پر حملے کر کے انہیں تباہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن بھارت ان کی جگہ فوراً
سری گاڑیاں اور دوسرے فوجی لے آتا ہے۔ اس کے پاس کٹوانے کے لئے بہت فوجی
ں۔"

کاغذ پر نیلی اور سرخ لکیروں کے ساتھ پہاڑی علاقے کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ کمانڈو
یروان نے ایک جگہ پنسل کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔

"اس پہاڑی سڑک پر یہاں ایک پل ہے ان پہاڑیوں میں بانہال سے سری نگر کی
ادی تک صرف دو سڑکیں بھارتی فوجیوں کے لئے گولہ بارود کی سپلائی لے کر آتی ہیں
لی سڑک پہاڑی کے پہلو سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے۔ وہاں ہمارے مجاہد کمانڈو گھات لگا کر
نڈین فوج کی سپلائی کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس دوسری سڑک پر جو یہ پل ہے یہ
ی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پل کے ذریعے بھارت کی سپلائی بھاری تعداد میں وادی میں
تی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انڈین فوج نے یہاں سیکورٹی کا زبردست انتظام کر
کھا ہے۔"

میں نے کمانڈو سے پوچھا۔

"کیا یہ پل لکڑی کا ہے؟"

اس نے کہا۔

"نہیں یہ لوہے کا پل ہے اور بے حد مضبوط ہے۔ اس کی دونوں جانب ایک ٹینک ہروقت موجود رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پل کی دونوں جانب مشین گنو مورچے بھی ہیں اور پل کے آس پاس ڈھلان کی جھاڑیوں میں بھی بھارتی فوجیو مورچے ہیں جہاں مارٹر گنیں بھی ہیں۔ ہمارے مجاہدوں نے کئی بار اس پل کو تباہ کر کوشش کی ہے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارے کئی مجاہد یہاں شہید ہو چکے ہیں۔ اگ طرح یہ پل مکمل طور پر تباہ ہو جاتا ہے تو سری نگر میں ڈمپلائے انڈین فوج کو ا سپلائی آدھی رہ جائے گی۔"

میں نے نقشے کو غور سے دیکھتے ہوئے کمانڈو سے پوچھا۔

"یہ پل پہاڑیوں میں کس مقام پر ہے"

اس نے مجھے پل کا پورا حدود اربعہ سمجھایا اور کہا۔

"اس پل کے نیچے کوئی دریا وغیرہ نہیں ہے۔ کافی گہرائی میں ایک برساتی نالہ صرف برسات کے موسم میں بارش کے پانی سے بھر جاتا ہے۔ آج کل یہ نالہ خشک پل کے نیچے بھی بھارتی فوج کی چوکیاں ہیں۔ اس نالے میں سے کوئی پرندہ بھی اُ جائے تو بھارتی فوجی مشین گنوں کا فائر کھول دیتے ہیں۔ یہ پل وادی میں انڈین فو اسلحہ اور فوجیوں کی کھیپ پہنچانے میں بے حد اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اگر ہم کس اس پل کو مکمل طور پر تباہ کر دیتے ہیں تو یہ ہماری بہت بڑی فتح ہوگی اور بھارتی فو کمانڈ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ کیونکہ یہاں نیا پل بنانا بڑا دقت طلب کام ہے"

میں نے کمانڈو شیروان کی طرف پراعتماد نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کمانڈو! اگر میں یہ پل تباہ نہ کرسکوں تو پھر میرا جینا کسی کام کا نہیں اور پھر کمانڈو کی ٹریننگ کس دن کے لئے لی تھی؟"

کشمیر کی پہاڑیوں کا یہ اہم ترین پل ایک ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں صرف ایک ہی ڑی سڑک تھی۔ یہ سڑک پیچھے کی طرف سے ایک اونچی پہاڑی کے سانپ کی طرح چکر تی ہوئی اوپر سے ہو کر دوسری پہاڑی کی طرف آتی تھی۔ یہ پل دونوں پہاڑیوں کے میان بنا ہوا تھا۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چل کر اس پل کو دیکھو۔ اس کا اچھی طرح سے زہ لو۔ اس کے بعد ہم اس پل کو اڑانے کا کوئی قابل عمل اور موثر پلان بنا سکیں گے۔"

ہماری خفیہ کیمپ گاہ سے یہ پل خچروں پر آدھے دن کی مسافت پر تھا۔ ہم نے سرے دن کشمیری کسانوں والا لباس پہنا اور خچروں پر بیٹھ کر منہ اندھیرے پل کی طرف ں پڑے۔ سارا رستہ پہاڑی تھا۔ ہم کئی گھاٹیوں اور برساتی نالوں میں سے گزرے۔ پہر کے بعد ایک ٹیلے کی اترائی اترے تو کمانڈو شیروان نے تھیلے میں سے دوربین نکال کر ے دی اور دور ایک جانب اشارہ کیا۔

"وہ پل ہے۔"

میں نے دوربین کے بغیر اس طرف دیکھا۔ دور دو پہاڑیوں کے درمیان کافی بلندی پر یک اونچی گھاٹی کے درمیان ایک پل کا دھندلا خاکہ نظر آرہا تھا۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ دوربین میں سے پل تھوڑا صاف مگر دھندلا نظر آرہا تھا۔ یہ لوہے کا پل تھا اور ڑی بڑی قینچیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ کمانڈو شیروان کہہ رہا تھا۔

"پہلے یہاں ایک لکڑی اور رسوں کا پل ہوا کرتا تھا مگر بھارتی فوج نے جب کشمیر پر

قبضہ کیا تو یہاں فوج نے بڑا مضبوط لوہے کا پل بنا دیا اس پل کو اڑانے کی کوشش ہمارے کئی مجاہد اب تک شہید ہو چکے ہیں۔ مگر پل کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا پائے

میں نے کہا۔

"ہمیں پل کو قریب سے جا کر دیکھنا ہوگا۔"

"ہم اس طرف والی پہاڑی کی گھاٹی میں جائیں گے۔ آگے تک نہیں جاسکتے۔ بھارتی فوج کے مورچے ہیں جہاں ابزروز دوربینیں لگائے چوبیس گھنٹے علاقے پر رکھتے ہیں۔"

ہم خچروں پر بیٹھ گئے اور خچروں کو ایک ٹیلے کی چڑھائی پر ڈال دیا۔ یہ خاص کشمیر کی پہاڑیاں تھیں۔ چیڑھ اور چنار کے درختوں کی قطاریں پہاڑیوں کی ڈھلانوں چوٹیوں تک چلی گئی تھیں۔ بہار کا موسم تھا۔ مگر بھارتی غاصب فوج نے کشمیر کی ب حسن کو خاک وخون میں رلا دیا تھا۔ جس پہاڑی پر ہماری خچریں جا رہی تھیں وہاں چنا درختوں کے علاوہ اخروٹ اور خوبانیوں کے گھنے درخت بھی تھے۔ ہم عام کشمیری کـ کے بھیس میں تھے۔ ہم نے لمبے لمبے پھٹے پرانے فرن پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں مـ سوئیاں تھیں۔ خچر بھی مریل سے تھے۔ کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کشمیری کسان ہیں۔

کمانڈو شیروان ان پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھا۔ ہم اس دو پہاڑیوں پر سے گزر کر اس پہاڑی پر آگئے جہاں پل بنا ہوا تھا۔ کمانڈو شیروان ایک خچر سے اتر گیا کہنے لگا۔

"یہاں خچر باندھیں گے"

میں بھی خچر سے اتر پڑا۔ ہم نے دونوں خچر ایک درخت کے ساتھ باندھ د کمانڈو نے دوربین اپنے لمبے کرتے کے پیچھے چھپا رکھی تھی۔ اس لمبی آستینوں او دامن والے کرتے کو کشمیری میں فرن کہتے ہیں۔ وہ ایک جگہ درختوں کے پیچھے سامنے دیکھنے لگا۔ میں بھی اس کے پاس بیٹھ کر سامنے دیکھنے لگا۔ یہاں سے لوہے کا بھر کم پل کچھ فاصلے پر دن کی روشنی میں بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ کمانڈو شیروا

ربین مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"پل کو غور سے دیکھو۔"

میں نے دوربین لگا کر دیکھا۔ یہاں سے پل کا منظر دوربین میں بے حد قریب دکھائی ا۔ یہ بڑی بڑی آہنی قینچیوں والا بڑا زبردست اور مضبوط پل تھا جو دو پہاڑیوں کو ایک رے سے ملاتا تھا۔ نیچے گہرائی میں برساتی نالہ تھا جو بالکل خشک تھا اور جھاڑیاں اگی ی تھیں۔ پل کی دونوں جانب لوہے کے بہت بڑے بڑے گارڈروں نے اسے سہارا دیا ا تھا۔ یہ چار چار گارڈر تھے جو بالکل ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے اور نیچے پہاڑی کے لو میں دیوار کے اندر دھنسے ہوئے تھے۔ کمانڈو شیروان کہہ رہا تھا۔

"اس پل کو جس شے نے اٹھا رکھا ہے وہ دونوں طرف کے لوہے کے چار چار بڑے رڈر ہیں جو پہلو کی پہاڑی کی دیواروں کے اندر دھنسے ہوئے ہیں۔ دیواروں کے اندر ں کے گول بہت بڑے ستون ہیں جن کے اندر یہ گارڈر بنیادوں تک چلے گئے ہیں۔ ستونوں میں ایک روایت کے مطابق سیمنٹ میں لوہے کے ٹکڑے جلا کر ڈالے گئے جس کی وجہ سے پل کی بنیادیں فولاد کی مانند ہو گئی ہیں۔ اگر اوپر سے ہم پل پر امیٹ لگا کر دھماکے بھی کریں تو پل کا جنگلہ اڑ جائے گا مگر پل اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ وجہ سے ہمارے مجاہد اس پل کو ابھی تک تباہ نہیں کر سکے۔"

میں دوربین لگائے پل کی ایک ایک جزئیات کو غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پل کو تباہ کرنے کے لئے کس قسم کی حکمت عملی تیار کرنی چاہئے۔ اس وقت تک ے ذہن میں کوئی ترکیب نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دوربین کمانڈو شیروان کو دے دی کہا۔

"پل کی صرف ایک جانب ٹینک کھڑا ہے۔ دوسرا ٹینک مجھے نظر نہیں آیا۔"

کمانڈو شیروان نے دوربین آنکھوں پر لگا کر کہا۔

"دوسرا ٹینک ابھی آجائے گا"

ہم باری باری دوربین لگا کر پل کا جائزہ لیتے رہے۔ پل کے نیچے مجھے آمنے سامنے دو

مشین گن کے مورچے بھی دکھائی دیئے تھے۔ کچھ دیر بعد دوسرا ٹینک آکر پل ر سرے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ پل پر سے ایک فوجی کنوائے گزرنے لگا۔ کمانڈو شیروان بولا

"یہ کنوائے یقیناً کپواڑہ گیریزن کے لئے اسلحہ وغیرہ لا رہا ہے۔ کیونکہ پچھ ہمارے مجاہدوں نے شب خون مار کر اس گیریزن کا ایمونیشن ڈپو اڑا دیا تھا۔ اگر ہوتا تو کپواڑہ گیریزن کو ایمونیشن کی سپلائی دوسری سڑک پر سے آتی جو تین پہاڑ کاٹ کر وادی میں داخل ہوتی ہے اور وہاں ہمارے مجاہد گھات لگا کر اسے اڑ کوشش کر سکتے تھے۔ لیکن اس پل پر سے جو کنوائے سپلائی لے کر آتے ہیں ا اس پل کی وجہ سے بڑی جلدی کشمیر پہنچ جاتے ہیں دوسرے اس علاقے میں پہاڑ اتنے پیچیدہ نہیں ہیں کہ ہمارے مجاہد وہاں زیادہ دیر تک گھات لگا کر چھپے رہ ہر وقت بھارتی فوج کے گشتی دستے پٹرول کرتے رہتے ہیں۔"

میں دوربین کی مدد سے پل پر سے گزرتے فوجی ٹرکوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑے فوجی ٹرک تھے جو ترپالوں سے چاروں طرف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ٹرک مسلسل گزر رہے تھے۔ بعض ٹرکوں کے سامنے کی جانب فوجی مشین گنیں لگائے کی دوسری جانب پہاڑی ڈھلان پر مجھے کچھ بکریاں نظر آئیں جو جھاڑیوں کے تھیں۔ ان کے درمیان ایک چرواہا ہاتھ میں لمبی سوٹی پکڑے کھڑا انہیں دیکھ ر ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اوپر بھی چڑھتا جاتا تھا۔ میں نے دوربین کمانڈر کو دی اور

"یہ چرواہا وہاں کیسے آگیا؟ ذرا دیکھو"

کمانڈو شیروان نے دوربین لگا کر چرواہے کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ کشمیری چرواہا یہاں اکثر دیکھا گیا ہے۔ بکریاں چرانے آجاتا ہے۔ بھارتی کو کچھ نہیں کہتے۔ یقیناً انہوں نے اسے بے ضرر سمجھ کر یہاں بکریاں چرانے کی دے رکھی ہوگی۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے پوچھا۔

"کیا ہم اس طرف جا سکتے ہیں جہاں یہ چرواہا بکریاں چرا رہا ہے؟"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"جا تو سکتے ہیں مگر اس میں خطرہ ہے کیونکہ وہاں دو بھارتی فوجی مورچوں میں بیٹھے ہیں وہ اس چرواہے کو جانتے ہوں گے ہمیں دیکھ کر ضرور پکڑ لیں گے کہ ہم ادھر کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہم خاص اس جگہ پر نہیں جائیں گے۔ جہاں یہ چرواہا بکریاں چرا رہا ہے۔ ہم اس سے دور اوپر ہی رہیں گے۔ دراصل میں اس جگہ کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میرے ذہن میں ایک سکیم کا خاکہ تیار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جس کے متعلق میں نے کمانڈو کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا کمانڈو بولا۔

"چلیے چلتے ہیں"

ہم خچروں پر بیٹھ کر دوسری پہاڑی کی طرف چل پڑے جہاں پل کا دوسرا سرا تھا۔ ہمیں دوسری پہاڑی تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ہمیں کافی فاصلہ ڈال کر دو پہاڑیوں کے درمیان میں جو خشک برساتی نالہ تھا اس میں سے گزرنا پڑا۔ آخر ہم دوسری پہاڑی پر اس مقام پر آگئے جہاں سے ہمیں نیچے فوجی پل اور ڈھلان پر چرواہا بکریاں چراتا نظر آرہا تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے درخت تھے جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں اور ایک جانب سے پہاڑی پگڈنڈی پہاڑی کے پہلو کی جانب چلی گئی تھی۔ ہم خچروں سے اتر کر جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ میں نے پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کمانڈو سے پوچھا کہ یہ پگڈنڈی اوپر چوٹی پر جاتی ہے کیا؟ اس نے کہا۔

"نہیں یہ آگے پہاڑی کے اندر چھوٹی سی قدرتی سرنگ ہے اس طرف جاتی ہے۔ وہاں پہلے چرواہوں نے بکریوں کے لئے باڑا بنا رکھا تھا مگر بھارتی فوجیوں نے اسے وہاں سے ہٹا دیا ہے۔ اب اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کیا وہاں فوجی پہرہ لگا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ وہاں فوجی گارڈ نہیں ہوتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قدرتی

غار اندر تھوڑی دور جا کر بند ہو جاتی ہے۔ اور فوجیوں کے مورچے وہاں سے کافی آگے جا کر اوپر کی جانب ہیں۔"

میں نے کمانڈو شیروان کو اپنی سکیم کی تفصیل بتادی۔ اس وقت پہاڑی غار کا سن کر میرے ذہن میں جو منصوبہ بن رہا تھا وہ مکمل ہو گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پل کے اس سرے کے جو فولادی گارڈ پہاڑی دیوار کے اندر سے ہوتے ہوئے پختہ ستونوں کی بنیادوں میں دھنسے ہوئے ہیں وہ یقینی طور پر اس غار کے اندر ہوں گے یا ان کا ایک حصہ ضرور غار کے اندر نظر آتا ہوگا۔ جب میں نے کمانڈو کو اپنا پلان بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا کہنے لگا۔

"تمہارا منصوبہ قابل عمل نہیں لگتا۔ کیونکہ غار کے اندر جا کر سارا کام کرنا آسان نہیں ہے۔ اگرچہ یہاں مستقل طور پر کوئی فوجی گارڈ ڈیوٹی پر نہیں ہوتا لیکن فوجی ادھر گشت لگاتے رہتے ہیں۔ انہیں غار کے اندر ذرا سی بھی آواز آئی تو وہ غار میں فائرنگ کرتے داخل ہو جائیں گے۔"

میں نے کمانڈو سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوشش کر کے دیکھ لینے دو۔ آگے جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہوگا۔"

کمانڈو غور کر رہا تھا پھر کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے میں آج شام کو ہی اس کشمیری چرواہے کے گھر جا کر اس سے ملتا ہوں۔ میں نے اس کا گھر دیکھا ہوا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم حریت پسند مجاہد ہیں۔ اب یہاں سے نکل چلتے ہیں۔"

ہم خچروں پر سوار ہو کر پہاڑی کی دوسری طرف سے ہو کر نیچے اترنے لگا۔ اسی طرح کھڈوں نالوں اور گھاٹیوں میں سے گزرتے ہوئے ہم اپنی خفیہ کمیں گاہ میں واپس آگئے۔ شام کے وقت کمانڈو شیروان اس چرواہے کے گھر کی طرف چل دیا جس کو ہم نے فوجی پل کی دوسری جانب ڈھلان پر بکریاں چراتے دیکھا تھا۔ کمانڈو رات کے دس بجے واپس آیا۔ ہم کمیں گاہ کے اندر تہہ خانے میں بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"میں نے صمدو سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہر طرح سے تعاون کرے گا۔ لیکن ایک بار تمہیں بھی اس سے مل لینا چاہئے۔ میں کل رات کا وقت دے آیا ہوں۔ کل رات پڑتے ہی ہم اس کے گاؤں کی طرف چل پڑیں گے۔ رات کا وقت ہمارے لئے زیادہ موزوں ہوگا۔"

صمدو اس چرواہے کا نام تھا۔ دوسری رات ہم نے دوبارہ کسانوں والا حلیہ بنایا اور خچروں پر بیٹھ کر صمدو چرواہے کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ یہ کافی لمبا راستہ تھا۔ کوئی دو گھنٹے میں ہم وہاں پہنچے۔ اس کا مکان اسی پہاڑی کے عقب میں ایک چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں واقع تھا جس پر بھارتی فوجیوں نے پل بنا رکھا تھا۔ صمدو ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے ہمارے لئے ساگ چاول پکا رکھے تھے۔ چھوٹا سا لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ جس میں دونوں میاں بیوی رہتے تھے۔ ایک لالٹین جل رہی تھی۔ کمانڈو نے صمدو سے میرا تعارف کرایا۔ وہ مجھ سے گلے لگ کر ملا۔ ہم نے کھانا کھایا اس کے بعد اس کی بیوی ساوار میں گرم کشمیری چائے لے آئی۔ چائے پیتے ہوئے ہم نے اپنے اصل موضوع پر گفتگو شروع کردی۔ کمانڈو شیروان نے ساری بات اسے پہلے سے بیان کر رکھی تھی۔ میں نے صمدو سے کہا۔

"مجھے تمہاری صرف اتنی مدد کی ضرورت ہے کہ تم اس وقت باہر نگرانی کرتے رہو جب میں غار کے اندر جاؤں اور اگر کوئی خطرہ ہو تو مجھے خبردار کر سکو۔"

صمدو کشمیری لہجے میں ملی جلی پنجابی اردو میں بات کرتا تھا۔ اس کی زبان میں نہیں لکھوں گا۔ اس کی باتوں کو میں اپنی اردو زبان میں بیان کرتا جاؤں گا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں آپ کو اپنے منہ سے فاختہ کی آواز نکال کر خبردار کروں گا۔"

اس نے مجھے منہ سے فاختہ کی آواز بول کر سنائی۔ بالکل فاختہ کی آواز لگتی تھی۔ میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ اب ایسا ہے کہ کل سے مجھے تقریباً ہر روز دوپہر کے وقت وہاں آنا ہوگا۔ تم مجھے اپنی دو تین بکریاں دے دو گے جنہیں میں چراتے ہوئے وہاں تک آؤں

گا۔ اگر مجھے کوئی بھارتی فوجی گشت کرتا ہوا مل گیا تو میں اسے یہی کہوں گا کہ میں صمدو چرواہے کا بھائی ہوں اور اگر میرے بارے میں تم سے کسی فوجی نے پوچھا تو تم بھی اسے یہی بتانا۔"

صمدو کہنے لگا۔

"لیکن آپ کشمیری زبان ہماری طرح نہیں بول سکتے۔ کہیں بھارتی فوجی کو شک نہ پڑ جائے۔"

یہ نقطہ بڑا اہم تھا۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کمانڈو شیروان نے بھی اس نقطے پر قدرے تشویش کا اظہار کیا۔ میں نے کہا۔

"ظاہر ہے بھارتی فوجی مجھ سے کشمیری زبان میں تو بات نہیں کرے گا۔ وہ اپنی فوجی اردو میں بات کرے گا۔ میں بھی اسی زبان میں کچھ ملی جلی پنجابی اور کشمیری میں جواب دے لوں گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ لیکن اس بات کی طرف سے مجھے پورا اطمینان ہو چاہئے کہ جس وقت میں پہاڑی غار کے اندر اپنے کام میں لگا ہوں گا اور اگر باہر کوئی خط ہو تو مجھے تم وقت پر خبردار کردو گے۔"

صمدو بولا۔

"یہ بات تم یقینی سمجھو۔ جس وقت تم غار کے اندر جاؤ گے تو میں اس کے آس پا ہی منڈلاتا رہوں گا۔ اول تو دن کے وقت ادھر کوئی بھارتی فوجی نہیں آتا۔ اگر آ بھی گی وہ غار کی طرف کیا لینے جائے گا۔ اس کو کچھ شک ہوگا تو جائے گا۔ بفرض محال اگر اس غار کی طرف رخ کر بھی لیا تو میں فاختہ کی آواز نکال کر تمہیں خبردار کرلوں گا۔"

کمانڈو شیروان نے یہاں مجھ سے سوال کیا۔

"اگر فوجی غار میں آگیا اور اس نے تمہیں دیکھ لیا تو تم کیا کرو گے؟ وہ تو تم پر فورا جھونک دے گا۔"

میں نے کہا۔

"اگر ایسی صورت پیدا ہوگئی تو میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ آپ لوگ اس کی

نہ کریں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

دوسرے روز دوپہر کے بعد کا وقت طے کر کے میں اور کمانڈو شیروان صمدو کے گاؤں سے اسی طرح خچروں پر سوار ہو کر واپس روانہ ہو گئے۔ پہاڑی جنگل میں رات گہری اندھیری تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ پہاڑوں پر رات کے وقت میدانی جنگلوں کی راتوں کا گھپ اندھیرا نہیں ہوتا۔ پہاڑوں پر بغیر چاند کی راتوں میں بھی ہلکی ہلکی سلیٹی رنگ کی روشنی ضرور رہتی ہے۔ کمانڈو شیروان مجھے ساتھ ساتھ راستے کے نشان بتاتا جا رہا تھا۔ مجھے یہ راستہ اچھی طرح یاد ہوگیا تھا۔ پھر بھی کمانڈو شیروان نے کہا۔

"کل میں ایک بار تمہارے ساتھ ضرور آؤں گا۔ اس کے بعد تمہیں اکیلے وہاں تک جانا ہوگا۔ کیونکہ ہم دونوں کو بھیس بدل کر پل کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔"

کمانڈو کا خیال بالکل درست تھا۔ میں نے کہا۔

"تم بے شک کل بھی میرے ساتھ نہ آؤ۔ مگر کل میرا پہلا دن ہوگا اور راستے کے نشان میں نے رات کو دیکھے ہیں۔ اس لئے کل تو میرے ساتھ رہو گے تو مجھے آسانی ہوگی۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"کل میں ضرور تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔"

ابھی میں صرف موقع کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ابھی میرے ایکشن شروع کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ میری سکیم اور پلان کیا تھا؟ یہ جیسے جیسے میرا مشن آگے بڑھے گا آپ کو اس کا علم ہوتا جائے گا۔ اگلے روز دوپہر کے بعد میں اور کمانڈو شیروان ایک بار پھر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت ہمیں صمدو کے مکان کی طرف نہیں جانا تھا۔ بلکہ پل والی پہاڑی کے عقبی علاقے میں جانا تھا۔ جہاں صمدو پہلے سے وہاں بکریاں چرا رہا تھا۔ وہ ہمیں پہاڑی پر ہی ایک جگہ درختوں کے نیچے بیٹھا مل گیا۔ کمانڈو شیروان وہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ وہ اسی

وقت واپس چلا گیا۔ میں نے اپنا خچر وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے باندھ دیا۔ صمدو چرواہے نے تین بکریاں میرے حوالے کر دیں اور ایک درخت کی لمبی چھڑی بھی میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا۔

"نیچے گھاٹی کی طرف مت آنا۔ میں اسی جگہ نگرانی کروں گا۔"

میں نے بکریوں کو ساتھ لیا اور اسے منہ سے آواز نکال کر ہانکتا ہوا اس پگڈنڈی پر چلنے لگا جو پل کی پہاڑی والے قدرتی غار کی طرف جاتی تھی۔ میں نے صرف ایک بکری کی رسی تھام رکھی تھی۔ باقی دو بکریاں اپنے آپ ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ پگڈنڈی پر درختوں کے گرے ہوئے پتے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں رک رک کر اور بکریوں کو چراتا ہوا آگے چل رہا تھا۔ تاکہ کسی کو شک نہ پڑے۔ میری تیز نگاہیں پہاڑی پگڈنڈی کے سامنے کی جانب تھیں۔ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی پہاڑی کے دامن میں جا کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئی تھیں۔ میں بکریوں کو ساتھ لئے رک رک کر جا رہا تھا۔ جہاں پگڈنڈی جھاڑیوں میں غائب ہو جاتی تھیں۔ وہاں آ کر میں رک گیا اور گردن کو کھجانے کے بہانے ارد گرد گردن گھما کر جائزہ لیا۔ وہاں مجھے آس پاس اوپر پہاڑی کی چوٹی پر کوئی فوجی د نظر نہ آیا۔ میں نے رسی والی بکری کو وہیں ایک جھاڑی کی شاخوں سے باندھا اور خامو سے قدم اٹھاتا جھاڑیوں کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں مجھے اونچے سرکنڈوں کے پیچھے ا غار کا چھوٹا سا دہانہ دکھائی دیا۔

میں سرکنڈوں کو پیچھے ہٹاتا غار کے اندر چلا گیا۔ یہ غار دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ راستے کی طرح تھا جس کے اوپر چھت پڑی ہوئی ہو۔ دیواروں میں سے درختوں کی جڑیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ فضا میں مٹی کی مرطوب بو تھی باہر سے دن کی روشنی چند قد تک ساتھ رہی۔ پھر میں اندھیرے میں آ گیا۔ غار کی دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑ گیا۔ اچانک میرے پاؤں ایک تودے سے ٹکرائے۔ میں نے جھک کر ہاتھ لگا کر دیکھ آگے مٹی کے ڈھیر نے غار کو آدھے سے زیادہ بند کر دیا ہوا تھا۔ میں اس کے اوپر سے کر دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں بہت گہرا اندھیرا تھا۔ میں نے جیب سے ماچس نکال

جلائی۔ موم بتی میرے پاس ضرور تھی مگر میں اسے ابھی روشن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماچس کی روشنی میں تین چار قدموں کے فاصلے پر دیوار تھی یہاں غار بند ہو جاتی تھی۔ میں نے بائیں جانب دیوار پر نگاہ ڈالی۔ وہاں محراب کی شکل میں اور گولائی میں دیوار ایک جگہ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب آیا تو دیا سلائی بجھ گئی۔

اب میں نے موم بتی روشن کر کے زمین پر ایک جگہ لگا دی اور بیٹھ کر باہر کو نکلی ہوئی گول دیوار کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ یہ سیمنٹ کی گول دیوار کا ایک حصہ تھا جو غار سے باہر نکلا ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ اس بہت بڑے ستون یا کنوئیں کی گول دیوار کا ایک حصہ تھا جس میں پہاڑی کے پل کی ایک طرف کے ترچھے فولادی گارڈر دھنسے ہوئے تھے اور جس میں سیمنٹ پتھر اور لوہے کے ٹکڑے ڈال کر بھر دیا گیا تھا۔ یہ پہاڑی والے پل کی بنیاد کا ایک ستون تھا۔ دوسرا ستون سامنے والی پہاڑی کی دیوار کے اندر ہو گا۔ ان دونوں ستونوں میں سے ہر ایک ستون پل کی بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر یہ ستون آگے کی جانب گر جاتا ہے یا نیچے بیٹھ جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی فولادی گارڈز بھی نیچے بیٹھ جاتے اور پل ایک طرف سے نیچے برساتی نالے میں گر جاتا تھا۔ مگر یہ کوئی عام قسم کا ستون نہیں تھا کہ جس کے ساتھ بم باندھ کر اسے اڑا دیا جاتا۔ یہ ستون ایک قسم کا لوہے اور سیمنٹ سے منہ تک پلستر کیا ہوا کنواں تھا جس کے اندر لوہے کے چار گارڈر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے کم از کم پچاس فٹ تک دھنسے ہوئے تھے۔

میں نے ایک پتھر اٹھا کر اسے ستون کی محرابی دیوار پر آہستہ سے مارا۔ ایسی آواز آئی جس نے مجھے بتا دیا کہ ستون اندر سے خالی نہیں ہے بلکہ پتھر کی طرح سخت اور اندر سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ستون کا یہ گھیرا نیم گولائی شکل میں کم از کم بیس فٹ کا ہو گا۔ اس ستون میں شگاف ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس میں شگاف ڈال کر اندر دھنسے ہوئے لوہے کے گارڈروں تک پہنچنے کے لئے اس الیکٹریکل برمے کی ضرورت تھی جس سے یورپ اور امریکہ میں پہاڑوں کی چٹانوں کو توڑا جاتا ہے اور اس کی اتنی آواز ہوتی ہے کہ کم از کم ایک میل کے اندر کوئی شخص بات نہیں کر سکتا اور سونا چاہے تو

سو نہیں سکتا۔ یہاں تو میں ہتھوڑی اور چھینی کو بھی استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اوپر پل کا پہلا سرا تھا اور وہاں فوجی چھاؤنی بنا کر بیٹھے ہوئے تھے جو بڑی آسانی سے یہ آواز سن سکتے تھے اور غار میں آسکتے تھے۔

میں نے اس جگہ کو کریدا جہاں ستون کے سیمنٹ کی گولائی پہاڑی غار کی دیوار میں دھنسی ہوئی تھی۔ یہ پہاڑ مٹی کے تھے اور وہاں میرے کریدنے سے مٹی باہر گرنے لگی اچانک باہر سے فاختہ کے بولنے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے پھونک مار کر موم بتی بجھادی اور وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں غار کے دہانے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ غار کا دہانہ راستے میں مٹی کے تودے کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف اس میں سے داخل ہونے والی دن کی روشنی تھوڑی نظر آرہی تھی۔ باہر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فاختہ کی یہ آواز یقینی طور پر صمدو چرواہے کی تھی جس نے خطرے کی بو سونگھ کر مجھے اپنے منہ سے فاختہ کی آواز نکال کر خبردار کیا تھا۔ جب پانچ منٹ گزر گئے اور باہر سے دوبارہ کوئی آواز نہ آئی تو میں نے موم بتی اٹھا کر جیب میں ڈالی اور آہستہ آہستہ غار کے منہ کی طرف چلنے لگا۔ غار کے دہانے کے قریب آکر میں ایک بار پھر رک گیا۔ کان لگا کر باہر کی آوازوں کو سننے کی کوشش کی۔ باہر کسی کسی وقت درخت کسی پرندے کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ مگر یہ فاختہ کی آواز نہیں تھی۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ غار کے اندر سے نکل کر سرکنڈوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور سرکنڈوں میں سے دوسری طرف دیکھا۔ میری تینوں بکریاں جھاڑیوں کے پاس موجود تھیں۔ ایک بکری بندھی ہوئی اپنی جگہ پر کھڑی جھاڑیوں پر منہ چلا رہی تھی اور دوسری دو بکریاں فاصلے پر درختوں کے نیچے ادھر ادھر منہ مار رہی تھیں۔ صمدو چرواہا مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری سوئی جھاڑیوں کے پاس ہی تھی۔ میں آہستہ سے اٹھ کر سرکنڈوں سے نکل کر جھاڑیوں کے پاس آگیا اور منہ سے ہاہاو او کی آواز نکالتا بندھی ہوئی بکری کو کھولا۔ اٹھائی اور پگ ڈنڈی پر واپس چل پڑا۔ ذرا آگے گیا تو صمدو کو دیکھا جو ایک پتھر پر بیٹھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے پیچھے جانے کا کہہ رہا تھا میں تیزی سے الٹے پاؤں وا

جھاڑیوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد صمدو چلتا ہوا میری طرف آیا اور مجھے ایسا اشارہ کیا کہ میں بکریوں کو لے کر دوسری طرف پہاڑی کے اوپر ہموار تختے پر آجاؤں۔ وہ خود بھی بکریوں کو ہانکتا ہوا اوپر کی طرف لے گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی اپنی تینوں بکریوں کو ساتھ چلاتا لے کر اوپر کی طرف چل پڑا۔ اوپر درختوں کے درمیان ایک ہموار جگہ تھی جہاں صمدو زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی اس کے پاس جا کر چرواہوں کی طرح زمین پر بیٹھ گیا۔ صمدو کہنے لگا۔

"جس وقت میں نے تمہیں فاختہ کی آواز نکال کر خبردار کیا تھا اس وقت اوپر سے ایک ڈوگرہ فوجی نیچے اتر کر غار کے قریب سے گزرا تھا۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں وہ غار کے اندر تو نہیں جا رہا۔ وہ اندر تو نہیں آیا تھا؟"

میں نے کہا۔

"نہیں اندر نہیں آیا تھا۔ ویسے میں نے تمہاری آواز سنتے ہی موم بتی بجھا دی تھی اور چوکس ہو گیا تھا۔"

"صمدو کہنے لگا۔"

"اب تم ایسا کرو کہ میرے پیچھے پیچھے تھوڑا فاصلہ ڈال کر چلے آؤ۔ ہمیں اب یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ مجھے ڈر ہے کہیں کسی فوجی کو تم پر شک نہ پڑ گیا ہو۔"

وہ بکریوں کو لے کر آگے آگے چل پڑا۔ میں نے بھی اپنی تینوں بکریوں کو اپنے ساتھ لگایا اور صمدو کے پیچھے چلنے لگا۔ دوسری طرف تھوڑی سی اترائی اترنے کے بعد دوسرے ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ درختوں میں چشمہ بہہ رہا تھا۔ ہم وہاں آگئے بکریاں چشمے میں پانی پینے لگیں۔ ہم نے بھی تھوڑا تھوڑا پانی پیا اور پتھروں کے پاس بیٹھ گئے۔

صمدو نے کہا۔

"تھوڑی دیر میں ان کا تیسرا پہر ہو جائے گا۔ یہاں پہاڑیوں میں بڑی جلدی شام ہو جاتی ہے۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے جاتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے میں اسی وقت بکریاں لے کر گھر واپس جاتا ہوں تم بھی اب واپس چلے جاؤ۔ کیا تمہیں واپسی کا راستہ معلوم ہے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے سارے راستے یاد ہو گئے ہیں۔"

صمدو نے پوچھا۔

"کوئی مطلب کی بات معلوم ہوئی غار کے اندر سے؟"

میں نے اسے کچھ نہ بتایا صرف اتنا ہی کہا۔

"ابھی تو میں غار کو اندر سے اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکا۔ مجھے کچھ روز تک یہا آنا پڑے گا۔ پھر کچھ فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔"

ہم نے ایک بڑی عقلمندی کی بات کی تھی اور یہ ہمیں کرنی ہی چاہئے تھی اور ہم ا ایسا ہی کیا کرتے تھے کہ اپنا راز کسی دوسرے پر اس وقت تک ظاہر نہیں کرتے تھے ج تک کہ ہم مجبور نہ ہو جائیں اور دوسرے آدمی کے بارے میں ہمیں یقین ہو جائے اس کو راز بتانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ چنانچہ ہم نے صمدو چرواہے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اوپر پہاڑی پل کو اڑانا چاہتے ہیں۔ کمانڈو شیروان نے اسے یہی کہا تھا کہ ہم لوگ کش حریت پرست مجاہدوں کے لئے وہاں ایک خفیہ ٹھکانہ بنانا چاہتے ہیں جہاں ہم بھارتی فو سے چھینا ہوا اسلحہ وغیرہ بھی رکھ سکیں اور موقع ملنے پر اوپر جا کر گھات لگا کر پل پ گزرتے بھارتی فوجی سپلائی کے ٹرکوں پر حملہ بھی کر سکیں اور انہیں نقصان پہنچا صمدو چرواہے کے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ ہم نے بھارتی فوج کے اتنے اہم اور مضبوط ترین پل کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ صمدو اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا۔

"ابھی دن کی روشنی باقی ہے تمہیں دور جانا ہے۔ راستے میں اندھیرا نہ ہو جا وقت نکل جاؤ۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں کل اسی وقت پھر آؤں گا۔ اس نے کہا۔

"اسی چشمے پر آکر میرا انتظار کرنا میں تمہاری بکریاں لے کر اس جگہ آجاؤں نے بکریاں اس کے حوالے کیں اور واپس روانہ ہو گیا۔ شام کا اندھیرا چاروں طر ہو چکا تھا جب میں کمانڈو شیروان کی پہاڑی کمیں گاہ میں پہنچا۔ وہ بے چینی سے می

کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمانڈو مجاہدوں سے الگ ہو کر وہ مجھے نیچے تہہ خانے میں لے گیا اور اندر داخل ہوتے ہی بولا۔

"کوئی امید نظر آئی؟"

میں نے اسے غار کے اندر کی ساری تفصیل بتائی اور کہا۔

"وقت ضرور لگے گا لیکن ٹارگٹ مارنے کی پوری امید ہے۔"

کمانڈو نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں جس جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بتادو۔ ساری چیزیں مہیا کر دی جائیں گی۔ یا خیال ہے تم اکیلے یہ کام کر لو گے؟ تمہارے ساتھ کسی دوسرے مجاہد کو نہ بھیج دوں؟"

میں نے کہا۔

"ابھی کسی دوسرے مجاہد کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی وہاں دو آدمیوں کا جانا طرے سے خالی نہیں ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو پھر تمہیں میرے ساتھ جانا ہو گا۔"

"میں ہر وقت تیار ہوں"

کمانڈو شیروان نے مسکرا کر جواب دیا۔

دوسرے دن میں جس خچر پر سوار ہو کر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوا اس خچر پر یک گٹھڑی بھی لدی ہوئی تھی۔ اس گٹھڑی میں چار روٹیوں کے علاوہ لوہے کی بڑی مضبوط لد کھرپیاں اور ایک آہنی موٹی سلاخ بھی تھی۔ صمدو کو میں نے دوپہر کا وقت دیا ہوا تھا میں ٹھیک وقت پر پہاڑی کے چشمے پر پہنچ کر خچر ایک طرف باندھ کر چشمے کے پاس بیٹھ گیا اور گٹھڑی میں سے ایک روٹی نکال کر کھانے لگا۔ تاکہ اگر کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ چرواہے کو بھوک لگی تھی اور چشمے پر روٹی کھانے کے لئے بیٹھ گیا ہے۔ اتنے میں مجھے بکریوں کے گھروں کی ٹک ٹک اور ان کے ممیانے کی آوازیں آئیں۔ پھر صمدو ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ چھ سات بکریاں تھیں۔ ان میں سے تین بکریاں میری تھیں۔ یعنی میرے لئے تھیں۔ میں نے اپنی بکریاں اپنے ساتھ کرلیں اور اوپر غار کی طرف چڑھائی

چڑھنے لگے۔ جہاں سے پگڈنڈی غار کی طرف جاتی تھی وہاں میں اپنی تینوں بکریاں لے
صمدو سے الگ ہو گیا صمدو اپنی بکریاں لے کر پہاڑی کی اس ڈھلان کی طرف چلا گیا
فوجی پل نظر آتا تھا۔ اور جہاں وہ ہر روز بکریاں چرانے جاتا تھا۔

غار کے قریب آ کر میں نے کل کی طرح بکریوں کو ایک طرف چرنے کے لئے چھو
اور خود اچھی طرح سے چاروں طرف دیکھ بھال کر غار میں داخل ہو گیا۔ میں نے
والی گٹھڑی جھاڑیوں میں ہی چھپا دی تھیں۔ میں لوہے کی موٹی سلاخ اور دونوں کھ
اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ میں غار کے اندر سے واقف تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ا
آ گیا جہاں مٹی کا ڈھیر پڑا تھا۔ ڈھیر پر سے گزر کر میں غار میں اس مقام پر آ کر رک
جہاں پل کے ستون کی محرابی دیوار باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ میں نے موم بتی روشن
دیوار کے ساتھ اس طرح لگا دی کہ اس کی روشنی صرف دیوار کے ایک خاص حصے تک
پہنچ رہی تھی۔ میں نے کھرپی ہاتھ میں لے کر اس جگہ سے دیوار کو کریدنا شروع
جہاں ستون کی سیمنٹ والی دیوار پہاڑی غار کی مٹی اور پتھر کی دیوار کے ساتھ آ کر
تھی۔ میں کھرپی اس طرح سے چلانے لگا کہ اس کی آواز پیدا نہ ہو۔ پہاڑ چونکہ مٹی
اس لئے کھرپی چلاتے ہوئے ویسے بھی کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ستون کی
دیوار کی مٹی آہستہ آہستہ نیچے گر رہی تھی۔ درمیان میں کسی جگہ کوئی پتھر آ جاتا
لوہے کی موٹی سلاخ کو اندر ڈال کر اسے اکھیڑ کر باہر نکال لیتا اور دوبارہ کھرپی چلانی
کر دیتا۔ میرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور کان باہر بھی لگے ہوئے تھے کہ
آواز نہ آ جائے۔

ابھی تک سب خیریت تھی۔ باہر سے کسی کسی وقت بکری کے ممیانے کی ہلکی
آ جاتی تھی۔

مٹی میں پتھر ملے ہوئے تھے۔ جب کوئی پتھر آ جاتا تھا تو مجھے کھرپی کی جگہ
سلاخ استعمال کرنی پڑتی تھی۔ میں کافی دیر تک اپنے کام میں لگا رہا۔ اس دوران
کنوئیں کی محرابی دیوار کے ساتھ شگاف پڑ گیا تھا جو آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا تھا۔

کھرپی چلا رہا تھا کہ اس کی کم سے کم آواز پیدا ہوتی تھی۔ اچانک باہر سے فاختہ کی طرح کی آواز آئی۔ میرے ہاتھ وہیں رک گئے۔ میں دبے پاؤں چلتا غار میں جو مٹی کا تودہ تھا اس کی اوٹ میں بیٹھ کر غار کے دہانے کی طرف دیکھنے لگا۔ غار کے دہانے سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ مجھے باہر دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ ان میں ایک آواز صمدو چرواہے کی تھی لفظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ میں تودے کی دوسری طرف سے ہو کر غار کے دہانے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سر تھوڑا آگے کر کے دیکھا۔ جہاں میں اپنی تین بکریاں کھلی چھوڑ آیا تھا وہاں صمدو چرواہے کے پاس ایک بھارتی فوجی کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا وہ صمدو سے کہہ رہا تھا۔

"تم نے ان بکریوں کو ادھر کیوں چھوڑ رکھا ہے تمہیں معلوم نہیں یہ آؤٹ آف باؤنڈ ریا ہے؟"

صمدو چرواہے نے کہا۔

"صوبیدار جی جانور اپنے آپ ادھر آ گئے ہیں۔ میں ابھی انہیں یہاں سے لے جاتا ہوں میں تو خود ادھر نہیں آتا جی"

"ٹھیک ہے۔ ادھر سے بکریاں لے جاؤ اور خبردار اس طرف مت آنا"

"اچھا جی ٹھیک ہے سر!"

اور میں نے دیکھا کہ صمدو بکریوں کو ہانک کر پگڈنڈی پر دوسری طرف لے گیا مگر بھارتی فوجی کا صوبیدار جس نے ڈوگرہ ہیٹ پہن رکھا تھا اور کاندھے پر سلینگ کے ساتھ رائفل لٹک رہی تھی وہیں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا مجھے ایسے لگا جیسے اسے کچھ شک پڑ گیا ہے۔ غار کے دہانے کے آگے اونچے سرکنڈے تھے۔ مجھے بھارتی صوبیدار سرکنڈوں کے درمیان سے نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر ٹہلتا ٹہلتا سرکنڈوں کی طرف آیا۔ میں دوڑ کر مٹی کے تودے کے پیچھے ہو گیا۔ میری نظریں غار کے دہانے پر لگی تھیں میرا خیال تھا کہ وہ غار کے اندر آئے گا میرے پاس ریوالور ضرور تھا جس پر سائی لینسر لگا ہوا تھا اور ریوالور نہ بھی ہوتا تو میں اس بھارتی فوجی کو آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا مگر میں ایسا نہیں کر

سکتا تھا۔ یہ بھارتی فوجی پٹرول ڈیوٹی پر تھا اور اگر یہ واپس اپنی یونٹ میں نہیں جاتا تو کی تلاش میں دوسرے فوجی سارے علاقے کو کھنگال ڈالتے اور اگر اس کی لاش نہ بھی تب بھی وہ صمدو چرواہے کو ضرور پکڑ کر لے جاتے اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ صمدو برداشت نہ کرتے ہوئے میرا بھید کھول دیتا۔

چنانچہ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یہ صوبیدار دور ہی رہے اور غار کے اند آئے۔ خدا نے میری دعا سن لی اور صوبیدار وہیں سے واپس مڑ گیا۔ جب میں نے کہ وہ اوپر کی طرف پہاڑی پر چڑھ گیا ہے تو میں نے دوبارہ دیوار کھودنی شروع کر میں دن ڈھلے تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ جب غار میں آتی دن کی روشنی مدھم لگی تو میں نے کھرپی اور لوہے کی سلاخ اور بڑی کھرپی کو وہیں مٹی کے ڈھیر میں چھپا بڑی احتیاط سے چلتا ہوا غار سے باہر آ گیا۔ باہر میری بکریاں نہیں تھیں۔ بکریاں صمدو لے گیا ہوا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کے پاس پڑی ہوئی اپنی لمبی سوٹی اٹھائی اور چرواہ طرح درختوں اور جھاڑیوں کی طرف دیکھتا پگ ڈنڈی پر سے گزر کر نیچے چشمے پر آ گیا۔ چشمے کا پانی پیا۔ منہ دھویا اور وہیں بیٹھ کر صمدو کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد کو ہانکتا ہوا صمدو بھی آ گیا۔ وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ فوجیوں کو کچھ شک پڑ گیا ہے۔ بہتر ہے کہ تم کچھ دن یہاں میں نے کہا۔"

"صمدو بھائی یہ تمہارا خیال ہے۔ میں نے تمہیں بھارتی فوجی سے باتیں کر بھی لیا تھا اور تم دونوں کی باتیں بھی سنی تھیں میرے خیال میں تشویش کی کوئی با ہے۔ اگر خطرے کی بات ہوئی تو میں اپنے آپ یہاں سے غائب ہو جاؤں گا۔"

صمدو خاموش رہا۔

میں سورج غروب ہونے کے بعد کمانڈو شیروان کی کمین گاہ میں واپس آ گیا۔ ساری بات بتائی۔ وہ بولا۔

"صمدو بے چارے کو ڈر لگا ہے کہ کہیں اس پر کوئی مصیبت نہ آ جائے۔ میرا

ہے تم اس کو بتائے بغیر غار میں جانا شروع کر دو۔"

کمانڈو شیروان نے بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔ اب صمدو چرواہے کی مدد کی مجھے ضرورت نہیں رہی تھی۔ اگر خطرے والی صورت حال پیدا ہو بھی جاتی ہے تو میں اسے سنبھال سکتا تھا۔ کمانڈو شیروان نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں ابھی وہاں کتنا کام باقی رہ گیا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ جس رفتار سے دیوار میں سوراخ کیا جا رہا ہے اس کے مطابق ابھی مزید تین چار دن مجھے اکیلے ہی یہ کام کرتے رہنا ہو گا۔

"پہاڑی کی دیوار میں جیسے جیسے اندر کی جانب سوراخ ہو رہا ہے پتھر زیادہ آنے لگے ہیں۔"

کمانڈو شیروان بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں صمدو چرواہے کو پھر بھی اپنے اعتماد میں لئے رکھنا ضروری ہے میں اسے خود مل کر سمجھا دوں گا کہ اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں غار میں کام کرتا رہا۔ چوتھے دن دیوار میں کنوئیں کی گول دیوار کے ساتھ کافی بڑا شگاف پڑ چکا تھا۔ پانچویں دن ٹارگٹ کا معائنہ کرنے کے لئے کمانڈو شیروان بھی چرواہے کے بھیس میں میرے ساتھ غار میں آیا۔ ہم موم بتی کی روشنی میں دیوار کے شگاف میں رینگ کر اندر تک گئے۔ پہلے میں نے اندر جا کر کنوئیں کی دیوار کی گولائی کو ٹٹول کر دیکھا۔ پھر کمانڈو شیروان نے اندر جا کر دیکھا۔ وہ باہر آ کر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے پل کے گارڈز اسی کنوئیں کے اندر گئے ہوئے ہیں۔ باہر کوئی گارڈز نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"انجینئرنگ کے نقطہ نظر سے اس کنوئیں کے ساتھ نیچے کی جانب دوسرے کنوئیں کا ہونا لازمی ہے۔ ہمارا ٹارگٹ دوسرے کنوئیں کے گارڈز ہیں"

کمانڈو شیروان کچھ مایوس نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"تم مجھے صرف تین دن اور دے دو۔ مجھے یقین ہے کہ چوتھے روز میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ جاؤں گا۔"

کمانڈو شیروان خاموش رہا۔ اگلے روز میں اکیلا ہی غار میں آیا۔ صمدو چرواہے کو میں نے تھوڑا بہت حوصلہ ضرور دیا تھا کہ وہ فکر نہ کرے۔ لیکن وہ فکرمند لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے کام کی رفتار تیز کر دی۔ پانچویں دن میں نے دیوار میں اتنا شگاف ڈال لیا تھا کہ میں رینگنے کی بجائے گھٹنوں کے بل شگاف کے اندر جا سکتا تھا۔ پانچویں ہی دن تیسرے پہر میں دیوار میں کھرپی سے مٹی کھرچ رہا تھا کہ کھرپی دیوار میں لوہے سے ٹکرائی پہلے تو میں سمجھا کہ یہ پتھر کی کوئی سل ہے۔ جب مٹی ہٹائی تو موم بتی کی روشنی میں مجھے گارڈر کا ایک پاؤں نظر آ گیا۔ یہ لوہے کا اینگل تھا جو اوپر سے آتا ہوا نیچے چلا گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی نیچے سے مٹی ہٹانی شروع کر دی۔ نیچے سے دوسرے کنوئیں کا گول تھڑا نمودار ہو گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ اس کنوئیں میں پل کے دوسرے پاؤں دھنسے ہوئے تھے۔ یہ چار چار گارڈروں کا ایک ایک آہنی ستون تھا جو ترچھا ہو کر کنوئیں میں اتر گیا تھا۔ مجھے انہی گارڈروں کی تلاش تھی۔

اس روز جب میں نے کمیں گاہ میں واپس جا کر کمانڈو شیروان کو یہ خوشخبری سنائی تو اس کے چہرے پر اس مشن کے سلسلے میں جو مایوسی چھانے لگی تھی وہ ایک دم دور ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم ٹارگٹ مار لیں گے"

"انشاء اللہ! اب ہمارے مشن کا دوسرا ایکشن شروع ہو گا۔"

دوسرے روز کمانڈو شیروان میرے ساتھ غار میں گیا۔ موم بتی کی روشنی میں اس نے بھی شگاف کے اندر جا کر لوہے کے گارڈروں کو دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔

"یہ پل کا دوسرا پاؤں ہے۔ اصل میں یہی پل کے اس سرے کی بنیاد ہے۔ اگر ہوتا ہے تو پل ایک طرف سے نیچے نالے میں گر پڑے گا۔ اور ہم یہی چاہتے ہیں۔"

میں نے کمانڈو سے کہا۔

"ہمیں ڈائنامیٹ کی سٹکیں اور دوسرا ضروری سامان غار میں لا کر رکھ دینا چاہئے۔"

"یہ کام آج رات کو ہی ہم شروع کر دیں گے۔"

اس رات آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔

آدھی رات کو جب میں اور کمانڈو شیروان بارود کی سٹکیں، ڈیٹی نوٹر اور بجلی کے تاروں کی گٹھڑی خچر پر لاد کر ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوئے تو بجلی چمکنے لگی تھی اور ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ ہم حسب معمول چرواہوں کے بھیس میں تھے اور ہم نے سروں کے اوپر بوریاں ڈال رکھی تھیں۔ ایک لمبا کمانڈو چاقو کمانڈو شیروان کے پاس تھا۔ ایک ریوالور میرے پاس تھا۔

پہاڑی رستہ ہمیں زبانی یاد ہو گیا ہوا تھا۔ ہم ایک گھنٹے کا سفر طے کر کے پل والی پہاڑی کے عقب میں چشمے پر پہنچ گئے۔ اندھیرے میں چنار اور چیڑھ کے درخت خاموش کھڑے تھے۔ بوندا باندی رک گئی تھی۔ بادلوں میں ہلکی ہلکی بجلی بار بار چمک رہی تھی اور بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج سنائی دے جاتی تھی۔ ہم نے خچر کو چشمے پر ہی ایک درخت سے باندھا اور خود اوپر غار کی طرف آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنے لگے۔ یہ چڑھائی زیادہ نہیں تھی۔ ہم جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتے اس جگہ آ گئے جہاں سے پگ ڈنڈی غار کی طرف جاتی تھی۔ ہم وہاں جھاڑیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے اور اندھیرے میں اوپر کی طرف دیکھنے لگے۔

اوپر پہاڑی کی چوٹی زیادہ دور نہیں تھی۔ وہاں پل کی جانب روشنی ہو رہی تھی۔ ایک دو دفعہ اوپر سے کسی فوجی کے دوسرے فوجی کو بلانے یا کچھ کہنے کی آواز بھی آئی۔ ہم اندھیرے میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میں نے کمانڈو شیروان کو اشارہ کیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ اوکے۔ اور میں اٹھ کر غار کی طرف چل پڑا۔ چھوٹی سی گٹھڑی میرے ہاتھ میں تھی۔ شیروان میرے پیچھے آ رہا تھا۔ غار کے قریب آ کر میں رک گیا۔ شیروان بھی رک گیا۔ مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ یہ چاپ ایسی تھی جیسے کوئی فوجی جھاڑیوں میں پاؤں رکھتا چلا آ رہا ہوں۔ میں نے شیروان کو اشارہ کیا اور ہم دونوں وہیں بیٹھ

گئے۔

قدموں کی چاپ قریب آ رہی تھی۔

میں نے جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ یہ وقت کوئی خطرہ مول لینے کا نہیں تھا۔ درختوں میں گہرا اندھیرا تھا۔ میں آنکھیں پوری کھول کر اس طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے درختوں کے اندھیرے میں ایک انسانی ہیولا آگے بڑھتا نظر آیا۔ یہ ہیولا شیروان نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے میرے بازو کو دبایا۔ ہم جھاڑیوں کی اوٹ میں تھے۔ ہماری نگاہیں انسانی ہیولے پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بھارتی فوجی تھا جو رات کو پٹرول ڈیوٹی پر تھا وہ ہم سے کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر ہمارے آگے سے گزر گیا۔ اس وقت ہم نے سانس روک رکھے تھے۔ جب بھارتی فوجی اندھیرے میں غائب ہو گیا اور اس کے بوٹوں کی آواز بھی گم ہو گئی تو میں ذرا سا اٹھا اور جھک کر غار کے آگے جو سرکنڈے اگے ہوئے تھے ان کی طرف دبے پاؤں بڑھا کمانڈو شیروان بھی اسی پوزیشن میں میرے پیچھے آ رہا تھا۔ سرکنڈوں کے پیچھے آتے ہی میں اور میرے پیچھے کمانڈو شیروان غار کے اندر چلے گئے۔

شیروان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں دیوار کے ساتھ ہاتھ لگائے آہستہ آہستہ اندھیرے میں غار میں بڑھنے لگا۔ جہاں مٹی کا تودہ تھا وہاں ہم آہستہ سے اس کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف چلے گئے۔ کچھ فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں میں نے دیوار میں شگاف ڈال رکھا تھا۔ یہاں مٹی میں نے زمین پر بکھیر دی تھی تاکہ اس کا ڈھیر نہ بننے پائے۔ میں موم بتی جلانے لگا تو کمانڈو شیروان نے سرگوشی میں کہا۔

"یہاں موم بتی نہ جلاؤ۔ شگاف کے اندر جا کر آگے کر کے موم بتی روشن کرو۔"

اس نے صحیح مشورہ دیا تھا شگاف کے باہر موم بتی جلانے سے اس کی روشنی غار کے باہر سے دیکھی جا سکتی تھی۔ میں نے گٹھڑی باہر رکھ دی اور گھٹنوں کے بل دیوار کے شگاف میں داخل ہو گیا۔ چند قدموں کے بعد وہ جگہ آگئی جہاں پل کی بنیادوں کے آہنی گارڈر دوسرے کنوئیں کے فرش میں گڑے ہوئے تھے۔ میں نے وہیں موم بتی روشن کر کے ایک طرف لگا دی اور اسی طرح پیچھے ہٹتا ہوا باہر آیا اور شیروان سے کہا۔

"تم جا کر دیکھ آؤ"

وہ بھی گھٹنوں کے بل شگاف کے اندر تک گیا اور اسی طرح الٹا چلتا ہوا واپس آکر سرگوشی میں کہنے لگا۔

"آہنی گارڈر کی قینچیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ تم جا کر اپنا کام شروع کر دو میں غار کے دہانے کے پاس بیٹھتا ہوں اگر کوئی بھارتی فوجی اس طرف آیا تو میں تمہیں خبردار نہیں کروں گا۔ خود ہی اس فوجی سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے کہا۔

"خدا کے لئے شیروان ایسا نہ کرنا۔ جو فوجی پٹرول ڈیوٹی پر ہوتا ہے اگر وہ وقت پر واپس نہ پہنچے تو اس کے ساتھی اس کی تلاشی میں نکل پڑتے ہیں۔ اگر تم نے اسے ہلاک کر ڈالا تو صورت حال زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"تو پھر دعا کرو کہ اس طرف کوئی بھارتی فوجی نہ آئے۔"

یہ کہہ کر کمانڈو شیروان خنجر ہاتھ میں لئے غار کے دہانے کی طرف چلا گیا۔

میں نے ڈائنا مائیٹ کی چوبیس سٹیکس اور ریموٹ ڈیوائس اور بجلی کے باریک تار گٹھڑی میں سے نکالے اور گھٹنوں کے بل چلتا شگاف کے اندر پل کی بنیادوں کے آہنی گارڈروں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ موم بتی کی روشنی میں مجھے گارڈروں کی تینوں قینچیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ میں نے بارود کی انتہائی طاقتور سٹکوں اور ڈیٹی نویٹروں کو بڑے حساب سے گارڈروں کی قینچیوں کے ساتھ تاروں سے باندھنا شروع کردیا۔ یہ کام کرتے ہوئے میں پسینے میں شرابور ہوگیا۔ شگاف کے اندر گرمی اور حبس تھا۔ بارودی سٹکیں باندھنے کے بعد میں نے ان کے ساتھ ریموٹ ڈیوائس لگا کر اس کے اندر سے نکلی ہوئی ایریل کی تار کے ساتھ دوسری تار کو جوڑ کر ٹیپ لگادی۔ یہ ایریل کی تار میرے پاس ایک گچھے کی شکل میں تھی۔ میں اسے شگاف میں لٹاتا ہوا شگاف سے باہر آگیا۔ باہر آکر میں نے منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکالی۔ کمانڈو شیروان جو غار کے منہ کے قریب بیٹھا تھا۔ جلدی سے میرے پاس آگیا میں نے اسے کہا۔

”کام مکمل ہوگیا ہے“

ہم نے دونوں کھرپیاں لوہے کی سلاخ کپڑے میں باندھیں اور بموں کے ساتھ لگے ریموٹ کی تار نے گچھے کو غار کی دیوار کے ساتھ رکھ دیا اور مٹی اور پتھروں سے دبا کے شگاف کو بھرنا شروع کردیا۔ آدھے گھنٹے میں ہم نے دیوار کے شگاف کو صرف آگے سے پر کردیا۔ اب دیوار میں دیکھنے سے کوئی شگاف وغیرہ نظر نہیں آتا تھا۔ کمانڈو شیروان نے کپڑے کی گٹھڑی اٹھالی اور میں ایریل کی تار کو غار کی دیوار کے ساتھ لگاتا ہوا غار کے

دہانے سے باہر آگیا۔ باہر آکر ہم نے ایریل کے تار کو غار کے اس طرف موڑ دیا جدھر پل کا رخ تھا۔ ایریل کے تار کو جھاڑیوں میں چھپا کر اس کے سرے کو جھاڑیوں میں سے ذرا سا باہر نکال دیا۔ اور اس کا رخ بھی پل کی جانب موڑدیا۔ اس ایریل کے تار نے ہمارے ریموٹ کنٹرول کے سگنل پکڑ کر شگاف کے اندر پل کی بنیادوں میں آہنی گارڈروں کے ساتھ لگے بموں میں قیامت خیز دھماکہ کرنا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے ایک بار پھر جھاڑیوں کا جائزہ لیا۔ تار ہم نے سبز رنگ کا خریدا تھا تاکہ وہ جھاڑیوں کا ہم رنگ ہو اور قریب سے بھی نظر نہ آئے۔ اور یہی معلوم ہو کہ جھاڑیوں کی شاخ ہے۔ ہم نے ادھر ادھر سے مٹی اور گھاس وغیرہ توڑ کر اس تار پر ڈال دیا جو غار کے باہر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی جھاڑیوں میں آئی ہوئی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اس طرف کو بھارتی فوجی نہیں آتا۔ صمدو نے بھی ہمیں بتایا تھا کہ یہ غار ویران پڑا ہے اور یہاں کبھی کسی بھارتی فوجی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اس کے باہر سے صرف رات کے وقت روزانہ پٹرول پارٹی کا ایک آدھ فوجی گشت لگاتا تھا اور دن کے وقت بھی کبھار ہی کوئی سپاہی ادھر آنکلتا تھا۔ ورنہ یہ علاقہ خالی پڑا رہتا تھا۔

ہم نے اندھیرے میں ایک دوسرے کے ہاتھوں کو دبا کر وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا اور اندھیرے میں درختوں اور جھاڑیوں کے عقب سے ہو کر ہم جھک کر چلتے پگڈنڈی کے آخری موڑ پر آکر نیچے ڈھلان پر آگئے۔ ڈھلان پر ہم آہستہ آہستہ کھسک کر اتر رہے تھے۔ نیچے چشمے پر پہنچ کر شیروان نے چھوٹی سی گٹھڑی جس میں دونوں کھرپیاں اور لوہے کی موٹی سلاخ تھی خچر پر رکھی خچر کی باگ تھامی اور اسے لے کر پہاڑی کی دوسری طرف سے گھاٹی اترتے چلے گئے۔ اب آسمان پر بجلی نہیں چمک رہی تھی مگر بادلوں میں دھیمی دھیمی گرج سنائی دینے لگی تھی۔ ہم گھاٹی اتر کر نیچے وادی میں آئے تو پہلے موٹی موٹی بوندیں گریں پھر مسلسل بارش شروع ہوگئی۔ شیروان نے خچر کو اس پہاڑی پگ ڈنڈی پر ڈال رکھا تھا جو دوسرے پہاڑی کی طرف جاتی تھی۔ ہمیں اس پہاڑی کے دامن سے گزر کر اس سے اگلی وادی میں پہنچ کر اس راستے پر پہنچنا تھا جو ہماری کیمپ گاہ کے پہاڑوں کی

طرف جاتا تھا۔ یہ کافی لمبا سفر تھا۔

بارش شروع ہوئی تو کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہمیں خچر پر بیٹھ جانا چاہئے۔"

ہم احتیاط کے طور پر اپنے ساتھ ایک ہی خچر لائے تھے کہ دو خچروں کا شور نہ ہو۔ ہم خچر پر آگے پیچھے بیٹھ گئے۔ گٹھڑی کھول کر کھرپیاں اور آہنی سلاخ وہیں جھاڑیوں میں پھینکی اور چادر کو اپنے اوپر کر لیا۔ اس سے بارش سے تھوڑا بہت بچاؤ ہو گیا مگر وقتی طور پر کیونکہ سفر لمبا تھا اور بارش ہمارے اوپر برابر برس رہی تھی۔ ہم کسی جگہ رکنا نہیں چاہتے تھے۔ خچر اندھیرے میں سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ مگر ان خچروں کو پہاڑی راستوں پر اور بارشوں میں اور اندھیرے میں بھی چلنے کی عادت ہوتی ہے۔ رات کے وقت وہ آہستہ آہستہ اور راستہ دیکھ دیکھ کر یا محسوس کر کے ضرور چلتے ہیں۔ رات کے تین بج چکے تھے جب ہم واپس اپنی کیمپ گاہ میں پہنچے ہم دونوں بارش میں شرابور تھے۔ کپڑے بدل کر ہم اپنی اپنی جگہوں پر پڑتے ہی سو گئے۔ صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی میں اپنی جھونپڑی سے نکل کر باہر آیا تو دیکھا کہ اپنا ایک مجاہد برین گن اٹھائے میری طرف آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کمانڈو نے بلایا ہے تہہ خانے میں"

میں سیدھا کمانڈو شیروان کے پاس تہہ خانے میں آ گیا۔ کمانڈو سبز چائے کا سماوار قریب رکھے چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے میز پر رکھے نقشے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"

اس نے پہلے ہی سے دوسری پیالی میں سماوار میں سے سبز چائے ڈال رکھی تھی۔ میں نے سبز چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور اس کے پاس سٹول پر بیٹھ گیا۔ لالٹین جل رہی تھی نقشہ وہی پہاڑی پل کا تھا۔

میں نے کہا۔

"کیا کوئی خاص بات دیکھ رہے ہو کمانڈو؟"

کمانڈو شیروان نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نہیں خیال کہ صرف ایک طرف کی بنیادوں کے اڑانے سے سارا پل گرے گا۔"

میں نے اسے سمجھایا کہ بارودی سٹکیں بے حد طاقتور اور انتہائی دھماکہ خیز ہیں اور پھر انہیں پل کی بنیادوں میں گارڈروں سے لگایا گیا ہے۔ ریموٹ کنٹرول کے بٹن دباتے ہی دھماکہ ہوگا اور پہاڑی پل ایک طرف سے نیچے گر جائے گا اور اس کے جھٹکے اور دباؤ سے پل کا دوسری طرف کا حصہ بھی نیچے آن پڑے گا۔ کمانڈو شیروان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم اس پل کی مضبوطی سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ایک سائیڈ کا دھماکہ پل کو اس طرف سے نیچے ضرور جھکا دے گا مگر گرائے گا نہیں اور اگر گر بھی گیا تو دوسری طرف سے پل کو کچھ نہیں ہوگا۔ ادھر سے پل اپنے گارڈروں پر کھڑا رہے گا اور بھارتی انجینئرنگ کور کے افسر اسے ایک ہی دن میں پھر سے ٹھیک کر دیں گے اور ہماری ساری محنت بھی ضائع ہو گی اور نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلے گا۔"

کمانڈو شیروان کی گفتگو سے میں بھی سوچ میں پڑ گیا کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"تم یہ سمجھ لو کہ اگر اس دوران بھارتی فوجیوں کو ہماری لگائی ہوئی تاروں کا سراغ نہ ملا تو آدھے پل کو ہم نے تباہ کر دیا ہے۔ اب باقی کا آدھا پل تباہ ہونا باقی ہے اور جب تک باقی کا آدھا پل تباہ نہیں ہوگا پورا پل نہیں گرے گا"

میں نے شیروان سے پوچھا۔

"پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

"ہمیں دوسری طرف سے بھی پل کو اڑانا ہوگا۔"

یہ ایک دوسرا اور بالکل نیا مشن تھا جس کے لئے ہمیں پل کی دوسری طرف کی پہاڑی کا پورا سروے کرنا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہاں پر کوئی ایسا غار نہ ہو جس کی دیوار کھود

کر ہم پل کی بنیادوں میں بم لگا سکیں۔ اس کام میں وقت بھی لگ سکتا تھا اور جو بم ہم لگا
چکے تھے اس کے بارے میں خطرہ تھا کہ اس کے ایریل کے تار پر کسی وقت بھی بھارتی
فوجیوں کی نظر پڑ سکتی ہے۔ میں نے جب ان خدشات کا اظہار کیا تو کمانڈو شیروان نے
بڑے ٹھنڈے دل کے ساتھ کہا۔

"دوست ٹارگٹ کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے لئے ہمیں یہ خطرات تو مول لینے ہی
پڑیں گے۔ اب تم یہاں بیٹھو گے میں پل کے دوسرے سرے کے سروے خود کروں گا۔"

اسی روز ناشتے کے بعد کمانڈو شیروان بکروان کے بھیس میں خچر پر سوار ہوا' ایک بکری
کا بچہ گود میں اٹھایا اور پہاڑی والے پل کے دوسرے سرے کا جائزہ لینے نکل پڑا۔ بارش
رات بھر ہوتی رہی تھی اور صبح کے وقت رک گئی تھی۔ کمانڈو شیروان دن ڈھلے واپس
آیا۔

اس نے بتایا کہ پل کے دوسرے سرے پر بھارتی فوج کی دو مشین گن پوسٹیں؛
اور ایک ٹینک پل کے شروع میں ایک طرف ہر وقت پوزیشن میں کھڑا رہتا ہے۔ شیروان
نے کہا۔

"پل کے دوسرے سرے پر گارڈروں کی قینچیاں محراب کی شکل میں پہاڑی چٹان
کے اندر تک گئی ہوئی ہیں۔ ان کے نیچے فوج کی مشین گن پوسٹیں ہیں۔ وہاں کوئی ایک
سرنگ بھی نہیں ہے کہ جس کی دیوار میں شگاف ڈال کر ہم پل کے گارڈروں تک پہنچ
سکیں"

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اسی طرف سے پل کو تباہ کرنے کے لئے ہمیں کوئی دوسرا
منصوبہ سوچنا پڑے گا۔"

شیروان بولا۔

"ابھی تک ایسا کوئی منصوبہ میرے ذہن میں نہیں آسکا۔ لیکن ہمیں ہر حال میں
جانب سے پل کو دھماکے سے اڑانا ہوگا۔ ورنہ پورا پل کبھی تباہ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈو شیروان! یہ تم بھی بخوبی جانتے ہو کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہم
نے پل کے ایک سرے میں ڈائنامائیٹ لگا دیا ہوا ہے اور ریموٹ کی تار بھی جھاڑیوں میں
باہر نکال رکھی ہے۔ یہ صورت حال ایسی ہے کہ کسی بھی وقت بھارتی فوج کو اس کا علم ہو
سکتا ہے۔ اور ایریل کی تار کی مدد سے وہ بڑی آسانی سے غار کے اندر دیوار کے شگاف میں
پہنچ کر گارڈروں سے ڈائنامیٹ کی سٹکیں اتار سکتے ہیں۔"

کمانڈو شیروان گہری سوچ میں تھا کہنے لگا۔

"میں اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہوں۔ مجھے تم صرف آج کی رات اور کل کا
دن دے دو اس دوران تم چرواہے کے بھیس میں غار کے باہر جھاڑیوں کا ایک بار معائنہ
کر آؤ کہ ایریل کی تار وہاں محفوظ ہے یا نہیں"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آج رات ہی وہاں جا کر پوزیشن چیک کروں گا۔"

"میں پل کی دوسری جانب جا کر وہاں کے علاقے کا تفصیل سے جائزہ لوں گا۔"

اسی دن رات کو جب کشمیر کی پہاڑیوں میں اندھیرا چھا گیا تو کمانڈو شیروان اپنے مشن
پر اور میں اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ ہم دونوں اپنے اپنے ٹارگٹ کی طرف الگ الگ خچر
پر سوار ہو کر گئے تھے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ بادلوں کے باوجود بارش رکی ہوئی تھی۔
میں دو گھنٹے کی پہاڑی مسافت طے کرنے کے بعد پہاڑی غار کے نیچے چشمے پر پہنچا۔ خچر میں
نے وہیں باندھ دیا اور خود اندھیرے میں جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو کر غار کے سرکنڈوں
کے قریب پہنچ کر زمین پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ پہاڑی کے اوپر فوجی چوکی پر حسب معمول
رات کو روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ خطرہ صرف رات کو گشت لگانے والی پٹرول پارٹی کا تھا۔
میں دیر تک جھاڑیوں کے پیچھے زمین پر لیٹا فضا کا اندھیرے میں جائزہ لیتا رہا۔ جب مجھے
یقین ہو گیا کہ اس طرف کوئی پٹرول پارٹی نہیں آ رہی تو میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا اس
جھاڑی کی طرف بڑھا جس میں ہم نے انتہائی طاقتور دھماکہ خیز بموں کا ریموٹ کا تار غار

کے اندر سے لا کر جھاڑیوں کی ایک شاخ کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ زمین گھاس جھاڑیاں گزشتہ روز کی بارش کی وجہ سے گیلی اور مرطوب تھیں جس کے باعث پر رینگنے سے سرسراہٹ کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ میں مطلوبہ جھاڑی کے پاس اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر ایریل کے تار والی جھاڑی کو نیچے جھک کر سبز رنگ کا باریک تار آگے سے چھپلا ہوا تھا اور جس طرح ہم اسے باندھ گئے تھے طرح بندھا ہوا تھا۔ میں نے اسے تھوڑا سا اور نیچے کر کے جھاڑی کی شاخوں میں چھ مجھے معلوم تھا کہ ریموٹ کنٹرول کے سگنل یہ تار پکڑ لے گا۔

جب مجھے تسلی ہو گئی کہ ایریل کا تار محفوظ ہے اور دن کی روشنی میں بھی نظر نہ آسکتا تو میں پیچھے کو گھوم کر کہنیوں کے بل رینگتا ہوا پگڈنڈی کے درختوں کے نیچے اور وہاں سے جھک کر چلتا ہوا ڈھلان اتر کر چشمے پر آگیا۔ خدا کا شکر ہے کہ خچر ابھی خاموش تھا اور اندھیرے میں گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ میں نے اس کی باگ پکڑی اور گھاٹی کی جنگلی جھاڑیوں میں سے گزار کر اس جگہ پر لے آیا جہاں چنار کے گھنے در کے درمیان میں سے نیچے وادی کو راستہ جاتا تھا۔ اس وادی میں سے نکل کر مجھے پہاڑی کے اوپر سے ہو کر اس جگہ پہنچنا تھا جو ہماری خفیہ کمیں گاہ کا خاص نشان تھا۔

میں خچر پر بیٹھ گیا تھا۔

خچر اندھیری رات میں پہاڑی گھاٹی پر بڑی احتیاط سے نیچے اترائی اتر رہا تھا۔ و بھی گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہاں چاول اور جوار کے دو چار کھیت تھے۔ ان کی فصل تھی۔ میں کھیتوں میں کھڑی فصل کو اوٹ بنا کر دو کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی مینڈھ رہا تھا کہ خچر نے منہ سے خرخرانے کی عجیب سی آواز نکالی۔ جانور کو قدرت نے خاص حس عطا کی ہوئی ہے جس کی مدد سے وہ اردگرد کسی انسان کی موجودگی کو محسو لیتا ہے۔ مجھے ان جانوروں کا اپنے کمانڈو آپریشنز کے دوران کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ میں گیا کہ کوئی انسان آس پاس موجود ہے۔ میں خچر سے نیچے اتر آیا۔ میں نے چرواہ جو لمبا کرتہ یعنی فرن پہنا ہوا تھا اس کے نیچے میں نے صدری بھی پہن رکھی تھی

صدری کی جیب میں سائی لینسر والا بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ وادی کشمیر کی رات خنک تھی۔ اندھیرا ضرور تھا مگر اونچی فصل دکھائی دے رہی تھی۔ فضا میں فصل کی مرطوب خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے خچر کو ایک جگہ فصلوں کی اوٹ میں کھڑا کر دیا اور یہ دیکھنے کے لئے دبے پاؤں آگے بڑھا کہ اگر خچر نے کسی انسان کی موجودگی کا احساس کیا ہے تو کیا یہ صحیح ہے؟

جوار کی فصل تھی یا باجرے کی یہ مجھے اچھی طرح معلوم نہ ہو سکا۔ بہرحال اونچی ضرور تھی۔ کھیت چند قدم چلنے کے بعد ختم ہو گیا۔ ابھی میں فصل کی اوٹ میں ہی تھا کہ مجھے عورت کے رونے بلکہ سسکیاں بھرنے کی دبی دبی سی آواز آئی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے ذرا آگے ہو کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے انسانی سایوں کا جو منظر نظر پڑا وہ یہ تھا کہ یہ دو آدمی تھے دونوں فصل کی مینڈھ پر کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک عورت زمین پر بیٹھی بین کرنے کے انداز میں دبی دبی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اتنے میں جو دونوں آدمی کھڑے تھے ان میں سے ایک نے خاص ڈوگرہ فوجی زبان میں کہا۔

”اس کا منہ کیا دیکھ رہے ہو حوالدار مرلی رام تیری چاچی نہیں لگتی۔“

اس جملے کو سن کر دوسرے آدمی نے زمین پر بیٹھی ہوئی عورت کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچنا بلکہ گھسیٹنا شروع کر دیا۔ عورت گھسٹتے ہوئے بھی روئے جا رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ دونوں آدمی ڈوگرہ فوج کے جوان تھے۔ ان میں ایک حوالدار تھا جس کا نام مرلی رام تھا۔ دوسرا بھی سپاہی یا نائیک یا لانس نائیک ہو گا اور دونوں ہندو ڈوگرے تھے اور عورت یقینی طور پر مسلمان مظلوم کشمیری خاتون تھی جس کو یہ لوگ پکڑ کر اپنی چوکی پر لے جا رہے تھے۔ حوالدار مرلی رام نے غصے میں اپنے ساتھی سے کہا۔

”اوئے گیان چند تمہیں فوج میں کس نے بھرتی کر لیا تھا؟ اس کو اٹھا کر کاندھے پر ڈالو۔ یہ گن مجھے دے دو“

ان دونوں کے پاس میں نے اندھیرے میں دو رائفلیں دیکھ لی تھیں۔ میں نے

صدری کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ گیان چند سپاہی نے واقعی کشمیری عورت کو اٹھالیا۔ عورت تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل کر زمین پر گر پڑی۔

اس دوران معلوم نہیں کیسے ان دونوں ڈوگروں کو میری موجودگی کا پتہ چل گیا۔ حوالدار مرلی رام نے رائفل سیدھی کر لی۔ اس کا رخ اندھیرے میں میری طرف تھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا وہ بولا۔

"گیانے شاہ ادھر کوئی آدمی ہے۔"

دوسرے فوجی نے بھی رائفل سیدھی کر لی۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں حوالدار مرلی رام چھلانگ لگا کر میرے سامنے آگیا۔

"کون ہو اوئے تم؟"

میں نے بیٹھے بیٹھے پہلا کام یہ کیا کہ ریوالور کو لمبے کرتے کی سائیڈ والی جیب میں ڈال دیا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے ڈوگرے کو پتہ نہ چل سکا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے اور دہائی دینے لگا۔

"صوبیدار جی میں کسان ہوں کھیت میں پانی لگانے آیا تھا حضور! مجھے گولی نہ مارنا۔"

میں نے ایک ڈرے ہوئے کسان کی پوری پوری اداکاری کی۔ دوسرا ڈوگرہ بھی اس دوران کشمیری لڑکی کو گھسیٹتا ہوا میرے پاس آگیا۔

"یہ جھوٹ بکتا ہے حوالدار۔ یہ کشمیری کمانڈو ہے اس کی تلاشی لو۔"

اب میرے فل ایکشن کا وقت آگیا تھا۔ بلکہ دونوں ڈوگرے خود اپنی موت کو بلا کر وہاں لے آئے تھے۔ ظاہر ہے میرے لمبے کرتے کی پہلو والی جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا اور میری تلاشی لینے کی صورت میں وہ یہ ریوالور نکال لیتے اور پھر انہیں یقین ہو جاتا کہ میں کشمیری کسان نہیں ہوں بلکہ کمانڈو ہوں۔ میرے پاس تین چار سیکنڈ ہی تھے۔

حوالدار میری تلاشی لینے کے لئے آگے بڑھا۔ میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"صوبیدار جی! میری جیب میں چار روپے ہیں۔ وہ لے لیں بے شک تلاشی لے کر

دیکھ لیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس طرح لمبے فرن کی پہلو والی جیب میں ہاتھ ڈالے جیسے جیب میں سے چار روپے نکال کر انہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میری جیب میں سائی لینسر والا بھرا ہوا ریوالور ہوگا۔ میں نے ان کی منتیں کرتے اور عاجزی سے گڑگڑاتے ہوئے جیب میں سے ریوالور نکالا اور یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ میں نے کوئی خاص نشانہ نہیں باندھا تھا۔ ایسا کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ بس ایک فائر حوالدار مرلی رام کے جسم کو ٹارگٹ بنا کر اور دوسرا فائر دوسرے ڈوگرے کے جسم کو ٹارگٹ سمجھ کر فائر کر دیا۔ اتنا خیال میں نے ضرور رکھا تھا کہ گولی ان کے سینے میں دل کی طرف لگے۔ میں حیران رہ گیا۔ دونوں ڈوگرے گولیاں کھانے کے بعد اپنی جگہوں پر کھڑے رہے لیکن ان کے ہاتھوں سے رائفلیں نیچے کو ہو گئی تھیں۔ میں نے ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر ان پر ایک ایک فائر اور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تو آگے کو گر پڑا اور دوسرا پہلو کے بل فصل میں گر گیا۔ کشمیری عورت پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ زمین پر جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ میں نے دونوں ڈوگروں کی رائفلیں اٹھا کر کھیت کی طرف اچھال دیں اور عورت سے کہا۔

"بہن! فکر نہ کرو۔ میں تمہارا مسلمان بھائی ہوں۔ تمہیں جہاں جانا ہے مجھے بتاؤ۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

کشمیری عورت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں مجھے اس کے کانوں میں پھولوں کے گچھے سے نظر آئے۔ یہ پھولوں کے گچھے نہیں تھے۔ چاندی کی ڈنڈیاں تھیں جو اس نے اپنے کانوں میں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر عورت نے کشمیری زبان میں خدا سے کچھ کہا۔ شاید وہ خدائے عزوجل کا شکر ادا کر رہی تھی کہ جس نے عین وقت پر ایک مسلمان کو بھیج کر اس کی عزت کو داغ دار ہونے سے بچا لیا میں نے کہا۔

"مجھے جلدی سے بتاؤ تمہیں کہاں چھوڑنا ہے۔ میرے پاس ایک خچر ہے۔"

میں پیچھے جا کر خچر کو آگے لے آیا۔ کشمیری دیہاتی عورت نے ٹوٹی پھوٹی اردو پنجابی اور کشمیری میں بتایا کہ اس کا گھر پیچھے گاؤں میں ہے۔ یہ ڈوگرے اسے گاؤں سے اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ میں نے اس کشمیری عورت کو خچر پر بٹھایا اور اسے اس کے ماں باپ کے پاس گاؤں میں پہنچانے کے بعد وہیں سے کمانڈو شیروان کی خفیہ کمیں گاہ کی طرف چل پڑا۔

وہاں تک پہنچتے پہنچتے آسمان پر صبح کا نور پھیلنے لگا تھا۔ کمانڈو شیروان بھی ابھی تک اپنے مشن سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ دن چڑھے آیا میں نے اسے رات والا واقعہ سنانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اسے کہا کہ میں پل کے غار کا پورا جائزہ لے آیا ہوں اور سب کچھ ٹھیک حالت میں ہے اور ابھی تک اس طرف کسی انڈین فوجی کی نظر نہیں گئی کمانڈو شیروان نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر اس نے اپنے مشن کی روئیداد سناتے ہوئے کہا۔

"پل کے دوسرے سرے پر سیکورٹی کا انتظام بے حد سخت ہے۔ رات کے وقت پل پر بڑی سرچ لائٹ روشن رہتی ہے اور فوجی کانوائے کی گاڑیاں رات کے وقت بھی پل پر سے گزرتی رہتی ہیں۔"

میں نے ساری تفصیل سننے کے بعد کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس طرف سے تمہارا پل کو اڑانے کا جو منصوبہ تھا اس پر عمل نہیں ہو سکے گا۔"

کمانڈو نے کہا۔

"میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اگر اس طرف سے ہم نے پل کو بارود لگا کر نہ اڑایا تو صرف ایک طرف کے دھماکے سے پل پوری طرح تباہ نہیں ہو گا۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہو گا؟"

میرے اس سوال پر کمانڈو شیروان نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھا اور میری طرف تھوڑا سا جھک کر کہنے لگا۔

"صرف ایک طریقہ رہ گیا ہے جس پر اگر ہمارا کمانڈو آپریشن کامیاب ہو گیا تو پل کا

نام و نشان باقی نہ رہے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ طریقہ کون سا ہے؟"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"میں نے اپنے اس کمانڈو مشن میں بہت سی مفید اور خفیہ معلومات حاصل کی ہیں۔ پل کی اس جانب درختوں کے درمیان فوجی لنگر ہے جہاں اس پل پر تعینات ڈوگرہ فوجیوں کے لئے کھانا وغیرہ پکتا ہے اور چائے کا بڑا پتیلا ہر وقت چڑھا رہتا ہے۔ مجھے اپنے خفیہ ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہفتے میں دوبار آدھی رات کے بعد پل پر سے گولہ بارود اور اسلحہ سے بھرے ہوئے ٹرک گزرتے ہیں۔ یہ ٹرک رات کے وقت اس لئے گزارے جاتے ہیں کہ کشمیری حریت پرستوں کو ان کی خبر نہ ہو سکے۔ کیونکہ پیچھے کانواؤں پر ہمارے مجاہد دن کے وقت ہی گھات لگا کر اٹیک کرتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان ٹرکوں پر ٹینکوں اور مارٹر گنوں کے گولوں کی بھاری تعداد لدی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے آگے پیچھے ہر دوسرے ٹرک کے درمیان حفاظت کے طور پر ایک آرمرڈ گاڑی بھی ہوتی ہے۔"

جب کمانڈو ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ ہمیں ان ٹرکوں کو اڑانا ہو گا؟ یہ کیسے ممکن ہے تم خود کہتے ہو کہ اس کانوائے پر سیکورٹی بے حد سخت ہوتی ہے اور کوئی پرندہ بھی ان کے نزدیک نہیں آ سکتا۔"

کمانڈو شیروان بولا۔

"میں نے تم سے ایک رات اور ایک دن کی مہلت مانگی تھی۔ رات گزر گئی ہے ابھی دن کی مہلت کا ٹائم باقی ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد اس قریبی گاؤں میں جا رہا ہوں۔ جہاں کے گوالے اس فوجی لنگر کو دودھ اور مکھن وغیرہ سپلائی کرتے ہیں۔"

کمانڈو شیروان ایک گھنٹے بعد دوبارہ کمیں گاہ سے نکل گیا۔ اس نے سارا دن لگا دیا۔

جب شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے تو وہ واپس آیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"آج رات تم میرے ساتھ گوالوں کے گاؤں میں جاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں تمہارے سامنے ساری باتیں ہوں۔"

ہم نے رات کا کھانا کھایا اور خچروں پر بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں پل والی پہاڑی کے قریب گوالوں کا جو گاؤں تھا اس طرف چل پڑے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں باہر باڑے میں مویشی بندھے ہوئے تھے۔ کمانڈو مجھے ایک مکان میں لے گیا جہاں تنگ سا لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا کمرہ تھا۔ ایک نوجوان کشمیری گوالے نے دروازہ کھول کر ہمارا مقدم کیا۔ کوٹھڑی میں لالٹین روشن تھی۔ گوالے نے اپنی بیوی کو دوسری کوٹھڑی میں جانے کے لئے کہا۔ ہمیں سبز چائے پیالوں میں ڈال کر پیش کی اور باتیں شروع ہو گئیں۔ کمانڈو شیروان اس گوالے سے ساری بات کر چکا تھا۔ یہ کشمیری گوالا ہماری مدد کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ہفتے میں ہر بدھوار اور ہفتے کی رات کو پل پر سے گولہ بارود اور اسلحہ سے بھرے ہوئے ٹرکوں کا کانوائے گزرتا ہے یہ سارا ایمونیشن جموں چھاؤنی سے آتا ہے اور وادی میں مقیم بھارتی فوج کو سپلائی ہوتا ہے جسے وہ مسلمان کشمیریوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور ان کا بے دریغ خون بہاتے ہیں۔"

کمانڈو شیروان نے گوالے سے کہا۔

"کیا یہ کانوائے پل کے پیچھے کسی جگہ ٹھہرتا بھی ہے؟"

یہ سوال کرتے ہوئے کمانڈو شیروان نیم متبسم چہرے کو میری طرف کئے ہوئے تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ اس کا جواب وہ مسلمان کشمیری گوالے سے پہلے سن چکا ہے اور میرے سامنے اس جواب کو دہرانا چاہتا ہے۔ گوالے نے کہا۔

"یہ کانوائے پل سے تھوڑا پیچھے آکر پہاڑی سڑک پر ایک طرف ہو کر رکتا ہے۔ ساری گاڑیاں ایک دوسرے کے آگے پیچھے پہاڑی دیوار کے ساتھ لگی ہوتی ہیں

فوجی ٹرکوں سے اتر کر اس کے سامنے رائفلیں اور برین گنیں لے کر پہرے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ کانوائے یہاں کس لئے رکتا ہے؟"

گوالا کہنے لگا۔

"یہاں چونکہ فوجی کینٹین یعنی لنگر ہے اس لئے پیچھے بانہال اور بٹوت سے مسلسل چلے آرہے کانوالے کے فوجیوں کو چائے اور ایک ایک پراٹھا دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ تازہ دم ہو جاتے ہیں"

میں نے اس سے سوال کیا۔

"کانوائے پہاڑی سڑک پر کتنی دیر تک رکا رہتا ہے اور کانوائے میں گولہ بارود کے کتنے فوجی ٹرک ہوتے ہیں؟"

کشمیری گوالے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک طرح سے تو نہیں بتا سکتا۔ ایک بار ہفتے کی رات کو میں دودھ کے ولٹوہے لے کر فوجی لنگر خانے گیا تھا تو بارش بڑی تیز شروع ہو گئی تھی اور مجھے رات فوجی لنگر کے چھپر تلے ہی گزارنی پڑی تھی۔ اس رات میں نے اس فوجی کانوائے کی گاڑیوں کو آکر پیچھے سڑک پر رکتے دیکھا تھا۔ لنگر کے ڈانگریوں نے مجھے بھی کانوائے کے ڈوگرہ اور سکھ فوجیوں کو چائے پراٹھے سپلائی کرنے پر لگا دیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ کانوائے کے ٹرک کتنے ہی تھے۔ میں نے گنے تو نہیں تھے لیکن میرا اندازہ ہے کہ پندرہ بیس ٹرک تو ضرور ہوں گے۔"

کشمیری گوالے نے ہمیں مزید بتایا کہ یہ فوجی ٹرک پل سے آدھا فرلانگ پیچھے کوئی آدھے گھنٹے تک کھڑے رہتے ہیں۔ اس دوران کانوائے کے ڈرائیور اور دوسرے فوجی گاڑیوں سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے کے ساتھ گرم پراٹھے کھاتے ہیں۔ سگریٹ اڑاتے ہیں اور آپس میں بڑا فحش مذاق کرتے رہتے ہیں۔ آدھے

گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور کانوائے پل پر سے گزرنا شروع ہو جاتا ہے۔

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟"

"میرا پلان یہ ہے کہ جب ان دھماکہ خیز اسلحہ بارود سے لدے ہوئے ٹرکوں کا کانوائے ٹھیک پہاڑی والے پل کے اوپر سے گزر رہا ہو تو ان ٹرکوں کے گولہ بارود کو آگ لگ جائے اور سارے ٹرکوں کا ایمونیشن پھٹ جائے۔ اس کے ساتھ ہی بم ریموٹ کنٹرول سے پل کے دوسرے سرے کی بنیادوں کے گارڈروں سے لگائے ہوئے بم بلاسٹ کر دیں گے۔ ایک طرف سے زبردست دھماکے کے بعد پل کا ایک حصہ نیچے بیٹھ جائے گا جب کہ دوسری جانب پل پر لاکھوں ٹن ایمونیشن کے دھماکوں کے ساتھ ہی پل کے جلتے اور پھٹتے ہوئے فوجی ٹرکوں کے ساتھ ہی پرخچے اڑ جائیں گے۔"

کمانڈو شیروان کی ان حالات میں یہی ایک قابل عمل سکیم تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"اس کے سوائے مجھے کوئی منصوبہ ایسا نظر نہیں آتا کہ جس پر عمل کرنے سے پورے کا پورا پل اڑ سکے۔ ہم انگریزی میں اس لئے باتیں کرنے لگے تھے کہ منصوبے کی تفصیلات اس کشمیری گوالے سے بھی خفیہ رہیں۔ اگرچہ وہ کشمیری مجاہدوں کے ساتھ تھا اور حریت پسند کشمیریوں کے ساتھ مل کر دو چار کمانڈو آپریشنز میں بھی حصہ لے چکا تھا۔ لیکن منصوبے کے اصل متن کی رازداری بہرحال ضروری تھی۔ اس خیال سے کہ اسے یہ محسوس نہ ہو کہ ہم انگریزی میں اس لئے باتیں کر رہے ہیں کہ کچھ باتیں اس سے چھپانا چاہتے ہیں میں نے اردو میں گفتگو کرتے ہوئے گوالے سے کہا۔"

"معاف کرنا بھائی! ہمیں کچھ عادت سی پڑ گئی ہے کہ جب ہم کسی ٹارگٹ پر ایکشن کرنے کی باتیں شروع کرتے ہیں تو اپنے آپ انگریزی میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ ہم تم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔"

کمانڈو شیروان نے بھی اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہم بھارتی فوج کے ایمونیشن کے کانوائے کو عین اس وقت دھماکوں سے اڑانے کی کوشش کر رہے تھے جب کانوائے کی ساری گاڑیاں پل پر پہنچ گئی ہوں"

گوالے نے کہا۔

"یہ کام مجھے مشکل لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے ایسا کیسے ممکن ہے کہ ہم فوجی گاڑیوں میں اس وقت دھماکے کروانے میں کامیاب ہو سکیں جب وہ پل کے اوپر سے گزر رہی ہوں؟"

میں نے گوالے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بھائی غلام محمد یہ سارا کام ہم خود ہی کر لیں گے۔ تمہیں صرف ہماری تھوڑی سی مدد کرنا ہو گی۔"

گوالے کا نام غلام محمد تھا کہنے لگا۔

"میں آپ لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔ بھارتی غاصب فوجیوں کے کانوائے اور پل کو اڑاتے ہوئے اگر میں خود بھی اڑ جاؤں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

میں نے اس سے کہا۔

"ایسی نوبت نہیں آئے گی۔ ایمونیشن کے ٹرکوں کے ساتھ نہ تم اڑو گے نہ ہم اڑیں گے صرف فوجی ٹرک اڑیں گے۔ بھارتی فوجی اڑیں گے اور پل اڑے گا۔"

"مجھے کیا کرنا ہو گا۔ آپ مجھے حکم کریں"

گوالے غلام محمد نے بڑے جذبے کے ساتھ کہا۔ اسے کیا کرنا تھا کمانڈو شیروان نے پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا۔ یہ سارا پروگرام کمانڈو شیروان کے ذہن میں پہلے ہی تیار تھا۔ میں نے بھی کمانڈو ایکشن کی تفصیل کو بڑے غور سے سنا۔ میرے حساب سے کمانڈو شیروان نے کانوائے کو اڑانے کا جو پلان بنایا تھا وہ اس اعتبار سے حرف آخر تھا کہ اس کے سوائے ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ گوالے مجاہد نے کمانڈو شیروان کی پوری توجہ سے سنا۔ جب شیروان نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔

"تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتادو۔ کوئی دقت ہو تو بتادو"

گوالے مجاہد نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ صرف آپ لوگوں کو گوالوں کے بھیس میں ملٹری کی میں جانے کے بعد ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی ہوگی کہ کسی فوجی کو آپ پر ذرا سا بھی پڑے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

بات یہ تھی کہ جس رات پل پر سے فوجی کانوائے نے گزرنا ہوتا تھا اس روز کینٹین یعنی لنگر میں شام کے وقت بھی فالتو دودھ سپلائی ہوتا تھا کیونکہ دس پندرہ کے فوجیوں کے لئے چائے بنانی ہوتی تھی۔ اس روز جمعے کا دن تھا۔ دوسرے روز اور ہفتے کی رات کو ایمونیشن لے کر بھارتی فوجیوں کے کانوائے نے پل پر سے گزر اور پل سے آدھی فرلانگ پیچھے کانوائے نے آدھ گھنٹے کے لئے پہاڑی سڑک کے ک رکنا تھا اور کانوائے کے پچاس کے قریب فوجیوں کو پراٹھے اور چائے سپلائی کرنا جس رات کانوائے نے گزرنا ہوتا تھا اس شام کو غلام محمد گوالا دودھ کے تین ولٹو لے کر جاتا تھا۔ یہ ولٹوہے اس نے ایک خچر پر رکھے ہوتے تھے اور اس کے ساتھ ایک بھائی بھی ہوتا تھا۔ طے یہ ہوا کہ کل شام کو اس کے ساتھ فالتو ولٹوہے لے اور کمانڈو شیروان گوالوں کے بھیس میں جائیں گے۔ غلام محمد وہاں یہ ظاہر کرے گا کا بھائی بیمار تھا اس لئے یہ اس کے خالہ زاد گوالے بھائی ہیں جو اس کے ساتھ د ولٹوہے اٹھا کر لائے ہیں۔ ہمیں دوسرے روز شام کو گوالے غلام محمد کے گھر پہنچنا پورا منصوبہ طے کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ میں نے کمیں گاہ میں آ شیروان سے کہا۔

"اب ہمیں ریموٹ کنٹرول کے ذریعے پھٹنے والے ایسے دھماکہ خیز مواد کی ہے جو بارود کی سنکوں کی شکل میں نہ ہو۔ کیونکہ ہمیں اتنا موقع نہیں ملے گا کہ باری دس پندرہ ٹرکوں میں بارودی سنکیں لگا سکیں۔ اس کے لئے چھوٹے انتہائی طاقتور ڈیوائس ہونا چاہئے کیا آپ لوگ ایسا کوئی انتظام کر سکیں گے؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہم بھارتی فوجیوں کو جہنم رسید کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے ٹھکانوں پر بھی شب مارتے رہتے ہیں۔ ہم ان سے حاصل کیا ہوا اسلحہ ہی ان کے خلاف استعمال کرتے ہمارے پاس انتہائی طاقتور اور جدید ترین ایسے ڈیوائس موجود ہیں میں تمہیں دکھاتا "

کمانڈو شیروان اٹھ کر تہہ خانے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبے کا ڈھکنا کر میرے سامنے رکھ دیا ڈبے کے اندر نسواری رنگ کے کیپسول تھے۔ کمانڈو ن نے ایک کیپسول نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور کہنے لگا۔

"یہ چھوٹا سا کیپسول اس قدر طاقتور بم ہے کہ اس کا دھماکہ پوری بلڈنگ کے پرخچے تاہے۔ یہ ایک کیپسول ہم ایمونیشن کے ہر ٹرک میں موقع پا کر ڈال دیں گے۔ اس ت ہمارے ریموٹ کنٹرول کے ساتھ ہوگا۔ یہ ریموٹ ریڈیو ویوز سے کنٹرول ہوتا "

اس نے مجھے ڈبے کے نیچے سے ایک چھوٹے کیلکولیٹر کی طرح کا ریموٹ کنٹرول ر دکھایا۔ اس پر سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے کتنے ہی بٹن بنے ہوئے تھے۔ کمانڈو ا۔

"یہ بیس پوائنٹ ہیں۔ ان کو باری باری دبا کر ہم بیس کیپسول بموں کے دھماکے کر یں۔ یہ ہائی ٹیکنیکل ڈیوائس بھارتی فوج کو بھی پچھلے سال ہی سپلائی ہوئے ہیں۔ یہ کا نے بھارت کو دوسرے جدید اسلحے کے ساتھ دیئے ہیں جسے بھارت کشمیر میں یوں کے گھروں کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔"

ڈو نے جیب میں سے اپنا وہ ریموٹ کنٹرول نکالا جس کے ساتھ پل کے دوسرے کے نیچے گارڈروں کے ساتھ لگے ہوئے بموں کا رابطہ تھا اور جس کے ایک بٹن ے ان بموں نے پھٹ جانا تھا۔ یہ ریموٹ پرانے ماڈل کا تھا اور اس کے لئے

ایریل کے تار کا ہونا ضروری تھا۔ جب کہ کمانڈو شیروان کے ریموٹ کنٹرول سے
شعاعیں نکال کر کیپسول کے بموں میں دھماکہ پیدا کرتی تھیں۔ ان کے لئے ایر
تاروں کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"ہم یہ سارے کیپسول بم ساتھ لے چلیں گے ہو سکتا ہے کانوائے میں بر
ہی ہوں"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

اس روز ہم دونوں نے اپنا حلیہ کشمیر کے دیہاتی گوالوں جیسا بنا لیا۔ کمانڈو
خود بھی کشمیری تھا۔ اسے کشمیر کے گوالوں کے کلچر کا پورا علم تھا۔ ہم نے ویسا ہی
بنایا۔ ہاتھوں میں ایک ایک چھڑی رکھ لی جس سے گوالے بھینسوں وغیرہ کو ہانکا کرتے
سر پر گوالوں والی پرانی میلی کچیلی ٹوپیاں رکھ لیں۔ اس روز ہم نے شیو بھی نہ بنائی
میں بان یعنی پیال کے بنے ہوئے جوتے پہن لئے اور خچروں پر بیٹھ کر دن کے دس
گوالے غلام محمد کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم اس کے گھر پہنچے تو دن کے چار بج رہے تھے۔ کیپسول بموں کا ڈبہ کمانڈو
کے لمبے فرن کی جیب میں تھا۔ ریموٹ کنٹرول بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس
اس نے ایک پستول بھی رکھ لیا تھا جو آٹو میٹک تھا اور ایک بار ٹریگر دبانے سے بیر
تھا۔ یہ آٹو میٹک پستول آج کل کے کلاشنکوف کی طرح کا تھا مگر اس کا سائز چھوٹا تھا
لینسر والا ریوالور اور پل کے دوسرے سرے کی بنیادوں میں لگے ہوئے بموں کا ر
کنٹرول میری جیب میں تھا۔ گوالہ غلام محمد ہمارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ کمانڈو نے
کیپسول بموں کا ڈبہ کھول کر دکھایا اور کہا۔

"ان میں سے ایک ایک کیپسول ہمیں کانوائے کے ہر ٹرک میں ڈال دینا ہو گا
کے بعد ریموٹ کے بٹن دبانے سے یہ بم پھٹتے چلے جائیں گے اور ان کے ساتھ ٹرک
بھرا ہوا گولہ بارود بھی دھماکوں سے پھٹنا شروع ہو جائے گا۔"

والے غلام محمد بڑے غور سے کیپسول بموں کو دیکھنے لگا۔

"مجھے تو یہ دوائی کی گولیاں لگتی ہیں۔"

کمانڈو شیروان مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ اتنے طاقتور بم ہیں غلام محمد کہ اگر اسے کسی چار منزلہ عمارت کی بنیادوں میں رکھ دیا جائے تو بٹن دبانے سے دھماکے کے ساتھ پوری بلڈنگ کے پرخچے اڑ جائیں گے۔"

غلام محمد نے بڑی عقلمندی کی بات کی کہنے لگا۔

"تو پھر یہ بم آپ لوگوں نے پل کے اوپر چھپا کر کیوں نہیں ڈال دیئے؟؟"

کمانڈو شیروان نے جواب دیا۔

"صرف پل کے اوپر رکھ دینے سے اتنے طاقتور فولادی پل پر دھماکہ تو ضرور ہو گا مگر پل کو اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا اسلحہ سے بھرے ہوئے ٹرکوں کے پھٹنے سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ٹرکوں کے دھماکوں کے ساتھ پھٹنے سے پورا پل اڑ جائے گا۔ تمہیں یہاں ایسا انتظام کرنا ہو گا کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو اتنا موقع مل جائے کہ ایک ایک کیپسول ہم ایک ایک ٹرک میں ڈالتے چلے جائیں۔"

غلام محمد کہنے لگا۔

"اس کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ ٹرک ڈرائیوروں اور ٹرکوں کی ساتھ چلنے والے دوسرے بھارتی فوجیوں کو چائے پراٹھے تقسیم کرنے والے لانگریوں کے ساتھ تم میں سے بھی کوئی ایک شامل کر دیا جائے۔"

"کیا ایسا ہو سکے گا؟" میں نے پوچھا۔

غلام محمد نے کہا۔

"میں کینٹین کے انچارج صوبیدار ہری کرشن سے کہہ کر تم میں سے کسی ایک کو چائے پراٹھے فوجیوں میں بانٹنے کی اجازت دلا دوں گا"

اس دوران غلام محمد کی بیوی بھینسوں اور گائیوں کا دودھ دوہتی رہی۔ سورج غروب ہونے تک دودھ کے تین ولٹوہے دودھ سے بھر کر تیار ہو چکے تھے۔ غلام محمد نے ہماری

طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"تم لوگ بالکل گوجر لگ رہے ہو"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ہم ایسا ہی حلیہ بنانا چاہتے تھے۔"

"تمہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم گوجر نہیں ہو۔"

سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی دو خچروں پر ولٹوہے لاد دیئے گئے۔ ایک خچر کمانڈو شیروان کو ہم نے دودھ والے ولٹوہے کے پاس بٹھادیا۔ دوسرے خچر پر دو ولٹو لدے ہوئے تھے۔ میں اور غلام محمد خچروں کے آگے آگے پیدل ہی چل پڑے۔ غلام گوالے کے گھر سے بھارتی فوجی کینٹین زیادہ دور نہیں تھی اور راستہ بھی زیادہ دشوار گ نہیں تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہم فوجی کینٹین کے باہر کھڑے خچروں پر سے دودھ ولٹوہے اتار رہے تھے۔ لنگر خانے میں سے ایک ڈوگرہ صوبیدار نکل کر ہماری طرف اس نے غلام محمد کے ساتھ ہم دونوں کو دیکھا تو اس سے پوچھا۔

"غلام محمد یہ لوگ کون ہیں آج تمہارا بھائی ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

غلام محمد نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"صوبیدار صاحب جی! میرا بھائی بیمار ہو گیا ہے یہ میرے خالہ کے لڑکے ہیں ہندواڑے میں دودھ بیچتے ہیں۔ ہم سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ میں نے کہا آج زیادہ پہنچانا ہے تم ہی میری مدد کرو۔"

میں اور کمانڈو شیروان بڑے معصوم سے چہرے بنا کر کھڑے تھے۔ ہم نے ڈوگر صوبیدار کو بڑے ادب سے سلام کیا اور بیوقوفوں کی طرح ہنسنے لگے۔ صوبیدار نے غلام سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو دودھ کے ولٹوہے اندر لنگر خانے میں رکھواؤ اور یہیں رہنا را تمہاری ضرورت ہوگی۔"

غلام محمد کانوائے گزرنے کی رات کو لنگر خانے میں ہی رہتا تھا اور لنگر کے

نوکروں کے ساتھ کانوائے کے سپاہیوں کو چائے اور پراٹھے تقسیم کرنے میں ان کی مدد کرتا تھا۔ ہم نے ولٹوہے باری باری اٹھا کر لنگر خانے کے اندر ایک طرف رکھ دیئے۔ لنگر خانے میں تنور گرم تھا اور ایک آدمی تنور پر بیٹھا چھوٹی چھوٹی روٹیاں لگا رہا تھا۔ تین چار چولہے تھے۔ ایک چولہے پر بڑا سا کالا دیگچہ رکھا ہوا تھا جس میں چائے پک رہی تھی۔ لنگر خانے میں ایک لکڑی کی میلی کچیلی سی لمبی میز اور لوہے کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ان پر کچھ فوجی بیٹھے چائے پی رہے تھے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ غلام محمد نے آنکھ سے ہمیں اشارہ کیا۔

ہم اس کے ساتھ ہی لنگر خانے سے باہر نکل آئے اور ایک طرف ہو کر زمین پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک کالے رنگ کا سکھ فوجی آیا۔ اس کے ساتھ ایک اردلی بھی تھا۔ میں نے اس کے عہدے کی پٹی دیکھی' اس پر تین پھول بنے ہوئے تھے۔ یہ کیپٹن تھا۔ لنگر کے باہر کا بلب خوب روشن تھا غلام محمد نے اور ہم نے بھی اٹھ کر سکھ فوجی کو سلیوٹ کیا۔ سکھ فوجی رک گیا۔ غلام محمد سے کہنے لگا۔

"غلام محمد! یہ لوگ کون ہیں؟"

غلام محمد نے وہی وضاحت پیش کردی۔ سکھ فوجی کے چہرے پر خشونت کے آثار تھے۔ اس نے اپنے اردلی کو آرڈر کیا۔

"ان دونوں کی تلاشی لو۔"

اردلی لمبے ڈگ بھرتا ہمارے پاس آیا اور اس نے ہماری تلاشی لینی شروع کردی۔ پہلے میرے فرن کی جیبوں کو دیکھا پھر ہاتھ لگا لگا کر میرے سارے جسم کو ٹٹولا کہ کہیں میں نے اپنے جسم کے ساتھ کوئی پستول ریوالور وغیرہ تو نہیں باندھا ہوا ہے۔ میری جیب میں کچھ نہیں تھا۔ اسی طرح اس نے کمانڈو شیروان کی بھی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں میں سے بھی کچھ نہ نکلا۔ اردلی نے سکھ فوجی سے کہا۔

"سر! کچھ نہیں ہے۔"

سکھ فوجی نے غلام محمد سے کہا۔

"اس بار تو میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔ آگے سے کانوائے والے دن اپنے ساتھ صرف اپنے بھائی کو لایا کرو۔ بھائی نہ آسکے تو کسی کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں، سمجھے؟"

"یس سر۔ سمجھ گیا سر! غلطی ہوگئی اب یہ غلطی نہیں ہوگی سر!"

سکھ فوجی اردلی کے ساتھ کینٹین کے اندر چلا گیا۔ ہمارے پاس ریموٹ کنٹرول بم تھے۔ کیپسول بموں والا ڈبہ بھی تھا۔ ایک آٹومیٹک پستول کمانڈو شیروان کے پاس تھا۔ ایک ریوالور اور ریموٹ کنٹرول میرے پاس بھی تھا۔ مگر ہماری جیبوں میں سے ان میں سے ایک بھی شے برآمد نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں تلاشی کا پہلے ہی خدشہ تھا۔ چنانچہ ہم نے فوجی لنگر خانے کے قریب آکر ان چیزوں کو ایک درخت کے نیچے جھاڑیوں میں چھپا کر رکھ دیا تھا۔ رات کا اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے یہ چیزیں وہاں کسی کو نظر نہیں آ رہی تھیں۔

جب سکھ فوجی اندر کینٹین میں چلا گیا تو کمانڈو شیروان آہستہ سے بولا۔

"خدا کا شکر ہے کہ عین وقت پر ہم نے ساری چیزیں جھاڑیوں میں چھپادی تھیں ورنہ مارے گئے تھے۔ یہ چیزیں ہمیں جھاڑیوں میں آدھی رات کو اس وقت اٹھانی تھیں جب ملٹری کانوائے نے وہاں پہنچنا تھا اور ان میں چائے وغیرہ تقسیم ہونی شروع ہونی تھی"

میں اور شیروان وہیں زمین پر لنگر خانے کے باہر بیٹھے رہے۔ غلام محمد گوالا اندر لنگر خانے میں ڈانگرویوں کا کام کاج میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ رات کے نو بجے غلام محمد اندر سے اپنے اور ہمارے لئے بھی تین تین روٹیاں اور دال سے بھرا ہوا تام چینی کا پیالہ لے کر آ گیا۔ ہم زمین پر ہی بیٹھے بیٹھے کھانے لگے۔ ہم آپس میں دبی زبان میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ غلام محمد کہنے لگا۔

"یہ سکھ فوجی ٹینک رجمنٹ کا ہے۔ پل کے دونوں سروں پر جو ٹینک کھڑے ہیں سکھ فوجی ان کا افسر ہے۔ ذرا سخت مزاج کا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تمہیں واپس نہ بھیج دے۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"کانوائے ٹھیک کتنے بجے یہاں پہنچ جاتا ہے۔؟"

غلام محمد نے کہا۔

"کبھی رات کو بارہ بجے اور کبھی ساڑھے بارہ بجے پہنچ جاتا ہے۔ پچھلی بدھوار کو ساڑھے گیارہ بجے ہی آگیا تھا۔"

ہم خاموشی سے دال روٹی کھاتے رہے۔ غلام محمد نے کہا۔

"تمہیں بڑی احتیاط سے سارا کام کرنا ہوگا اگر کسی نے تمہیں بم ٹرکوں میں رکھتے دیکھ لیا تو سمجھ لو کہ ہم میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔"

میں نے کہا۔

"غلام محمد! تم اس کی بالکل فکر نہ کرو یہ کام اتنی رازداری اور صفائی سے ہوگا کہ بھارتی فوجیوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ غلام محمد بھولا بھالا سا کشمیری گوجر تھا اور وہ کچھ ڈرا ہوا تھا کہ کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔ کمانڈو شیروان نے بھی اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم اطمینان رکھو۔ ہمارے کام کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

"اگر یہ سب کچھ ہوگیا اور ٹرک پل پر جاتے ہی ایک ایک کر کے پھٹنے لگے تو اس کے بعد پل تباہ ہو جائے گا۔ کہیں بعد میں بھارتی فوجیوں کو ہم پر شک تو نہیں پڑجائے گا کہ انہوں نے ٹرکوں میں بم لگائے تھے؟"

کمانڈو شیروان نے جواب دیا۔

"ہم پر یا تم پر شک پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کو ایک حادثہ سمجھا جائے گا یہی تصور کیا جائے گا کہ کسی ٹرک ڈرائیور یا ٹرک کے اوپر پہرہ دینے والے فوجی کی غلطی سے ایسا ہوا ہے۔ یا کسی ٹرک کے زیادہ اچھلنے سے ٹرک میں رکھے ہوئے کسی دستی بم کا پن نکل گیا اور بم کے پھٹنے سے دھماکہ ہوا اور اس بم نے سارے ٹرک کو اور اس کے باقی کے ایمونیشن سے لدے ہوئے ٹرکوں کو اڑانا شروع کردیا یہ ایک قدرتی بات ہے کہ اگر ایمونیشن کا ایک ٹرک پھٹتا ہے تو اس کے آگے والا یا پیچھے جو ٹرک آرہا ہے وہ

بھی اس دھماکے کی وجہ سے پھٹ سکتا ہے۔ یوں ایک چین ری ایکشن شروع ہو گیا ا سارے ٹرک اڑ گئے۔ ہم پر یا تم پر کسی طرح سے بھی شک شبہ نہیں پڑے گا۔"

غلام محمد خاموشی سے روٹی کھاتا رہا۔

کھانے کے بعد ہم نے تام چینی کے مگوں میں لنگر خانے کی چائے بھی پی۔ اس دوران رات کے گیارہ بج گئے۔ کچھ فاصلے پر پل کے اس والے سرے پر روشنی ہو رہی تھی اور پل کے پاس ہی ایک بہت بڑا ٹینک کھڑا تھا۔ اس کی گن کی نالی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ تین چار فوجی رائفلیں لئے ادھر ادھر پہرہ دے رہے تھے۔ دو سپاہی پل پر چل کر گشت لگا رہے تھے۔

اسی طرح مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ رات کے بارہ بج گئے اور وہاں کوئی کانوائے نہ آیا۔ کسی طرف بھی کوئی ایسے آثار نظر نہ آئے کہ پیچھے سے کوئی کانوائے آ رہا ہے۔ غلام محمد لنگر خانے کے اندر ہی تھا اور برتن وغیرہ صاف کر رہا تھا۔ تین فوجی لانگری بھی اس کے ساتھ برتن دھو رہے تھے۔ یہ شیشے کے گلاس اور مگ تھے جنہیں دھویا جا رہا تھا۔ ان گلاسوں اور مگوں میں کانوائے کے فوجیوں میں چائے وغیرہ سپلائی کی جاتی تھی۔

کمانڈو ہم لنگر خانے کے باہر زمین پر اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کانوائے نہ آئے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم اگلی بار بدھوار کو آجائیں گے۔ سکھ فوجی نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ غلام محمد کا بھائی بدھوار کو بھی بیمار ہی رہے گا اور اس کے ساتھ ہم ہی دودھ لے آئیں گے۔"

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ پل کے سرے پر جو فوجی تھے ان میں کچھ ہل چل پیدا ہوئی۔ پل کے سرے پر جو چیک پوسٹ تھی شاید اس کے فوجی ٹیلی فون پر پیچھے کانوائے کے آنے کی اطلاع آگئی تھی۔ ایک فوجی لمبے لمبے ڈگ بھرتا لنگر خانے کی

آیا۔ اس نے لنگر خانے کے باہر سے ہی آواز دے کر کہا۔

"لانس نائیک آتمارام تیاری پکڑ لو آدھے گھنٹے میں کنوائے پہنچ رہا ہے۔"

یہ سن کر ہماری تسلی ہو گئی۔ اندر سے لانس نائیک آتمارام کی آواز آئی۔

"فکر نہیں حوالدار۔ سب ٹھیک ہے۔"

لنگر خانے میں سے تلے ہوئے پراٹھوں کی خوشبوئیں آنے لگی تھیں۔ غلام محمد اندر کام میں لگا ہوا تھا۔ کسی وقت وہ باہر آتا تو ہماری طرف بھی ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ ہم زمین پر ٹانگیں پھیلائے اس طرح بیٹھے تھے جیسے ہمیں کسی قسم کی کوئی فکر نہیں ہے۔ لنگر خانے کے باہر اندر والی لکڑی کی لمبی میز نکال کر لگادی گئی اور اس پر تام چینی کے مگ اور شیشے کے گلاس لا کر رکھ دیئے گئے۔ غلام محمد نے دو ٹوکریاں لا کر میز پر رکھ دیں۔

تھوڑی دیر بعد پل کی طرف سے دو فوجی مارچ کرتے آئے اور لانس نائیک آتمارام کو بلا کر پوچھا۔

"چلو آتمارام سامان لے کر چلو۔ کانوائے پیچھے ہالٹ ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ فکر نہیں۔"

دونوں ٹوکروں میں چینی کے مگ اور گلاس ڈال دیئے گئے۔ ایک ڈانگری اندر سے ایک ٹوکری اٹھا کر لے آیا۔ اس ٹوکری میں پراٹھے پڑے ہوئے تھے۔ کمانڈو شیروان نے مجھے اشارہ کیا۔ میں چپکے سے اٹھ کر اندھیرے میں پیچھے جھاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ جھاڑیوں قریب ہی تھیں۔ میں جھاڑیوں کے پاس اس طرح بیٹھ گیا جیسے پیشاب کرنے کے لئے بیٹھا ہوں۔ میں نے جھاڑیوں میں سے دونوں ریموٹ کنٹرول اپنا ریوالور، کمانڈو شیروان کا پستول اور کیپسول بموں والا چھوٹا سا ڈبہ اٹھا کر اپنے لمبے کرتے کی لمبی جیب میں رکھا اور بڑے اطمینان سے اٹھ کر ازار بند باندھنے کی اداکاری کرتے ہوئے واپس کمانڈو شیروان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

بیٹھتے ہی میں نے بڑی احتیاط سے کمانڈو شیروان کا پستول اس کو دے دیا۔ اس نے پستول اپنے کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ ریوالور اور ریموٹ کنٹرول اور کیپسول بموں والا

چھوٹا ڈبہ میں نے اپنی جیب میں ہی رہنے دیا۔

غلام محمد اندر سے تھال میں پراٹھے لا کر ٹوکری میں ڈالنے لگا۔ پروگرام کے مطابق اس نے ہمیں آواز دے کر کہا۔

"تم وہاں کیا کر رہے ہو۔ اٹھ کر کام میں ہاتھ بٹاؤ۔ چلو اٹھو"

ہم جلدی سے اٹھ کر غلام محمد کے پاس آگئے اور ہم نے ایک ایک ٹوکری اٹھالی۔ ڈانگری لنگر خانے سے چائے سے بھری ہوئی دو بڑی بڑی تام چینی کی چینکیں باہر لے آیا۔

"غلام محمد! اسے پکڑو اور لے چلو"

غلام محمد نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔

"تم دونوں نے ایک ایک ٹوکری کیوں اٹھا رکھی ہے۔ ایک آدمی دونوں ٹوکریاں اٹھالے اور دوسرا یہ چینک پکڑ کر میرے ساتھ چلے۔"

میں نے مگوں اور شیشے کے گلاسوں والی دونوں ٹوکریاں اٹھالیں۔ کمانڈو شیروان چائے کی بڑی کیتلی اٹھالی۔ دوسری کیتلی غلام محمد نے پکڑلی۔ پراٹھوں والی ٹوکری بھارتی ڈانگری نے اٹھالی اور بولا۔

"چلو اوئے ڈبل سے چلو۔ کانوائے کے جوان بیٹھے چائے پراٹھوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

غلام محمد اور بھارتی ڈانگری آگے آگے اور میں اور کمانڈو شیروان ان کے پیچھے لگے۔ ہم پل کی طرف سے پیچھے جاتی سڑک کی طرف چل رہے تھے۔ وہاں پہاڑی ٹیلے دیوار تھی۔ ہم سڑک پر آگئے تھے۔ سڑک پر کہیں کہیں اوپر کر کے ٹیلے پر کھمبے لگے جن پر بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ سڑک چھوٹی تھی جیسی کہ پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے مگر تار کول کی بنی ہوئی پختہ تھی۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے پہاڑی کے ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہمیں کانوائے کے ٹرک نظر آگئے۔ یہاں زیادہ ر نہیں تھی۔ سڑک پر بجلی کے انڈوں والے کھمبے پیچھے رہ گئے تھے۔ ملٹری کانوائے ٹرکوں کی ہیڈ لائٹیں بجھی ہوئی تھیں۔ ٹرکوں کے سامنے فوجی دو دو تین تین کی ٹولیوں

کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ تین چار فوجی سڑک کی دوسری طرف پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک فوجی پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ان فوجیوں میں سے ایک فوجی نے اونچی آواز میں کہا۔

"فالم ہو جاؤ اوئے راشن آگیا ہے"

فوجی سڑک پر ٹرکوں کے سامنے لالٹین لگا کر بیٹھ گئے اور ہم نے ان میں پراٹھے اور چائے بانٹنی شروع کر دی بھارتی ڈانگری ہر فوجی کو ایک ایک پراٹھا دیتا جاتا تھا میں اور غلام محمد مگ اور خالی گلاس ان کے آگے رکھتے چلے گئے۔ پھر ہم کیتلی سے ان کے مگ اور گلاس بھرنے لگے۔ میں چائے ڈالتے ہوئے آخری ٹرک کے قریب چلا گیا۔ میں نے کانوائے کے ٹرک گن لئے تھے یہ کل گیارہ ٹرک تھے۔ ہر ٹرک کے آگے مشین گن لگی ہوئی تھی۔ اس وقت کسی ٹرک پر کوئی فوجی نہیں تھا۔ سب فوجی چائے پینے میں لگے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر مذاق بھی کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بھارتی فوجی ڈانگری جو ہمارے ساتھ آیا تھا وہ بھی فوجیوں میں شامل ہو گیا تھا اور ان کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ غلام محمد اور کمانڈو شیروان مجھ سے دس قدموں کے فاصلے پر قطار میں بیٹھ کر چائے پینے والے فوجیوں کے پاس کھڑے تھے اور جس فوجی کا چائے کا گلاس یا مگ خالی ہو جاتا تھا اس میں دوبارہ چائے ڈال دیتے تھے۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میری چائے کی چینک خالی ہو چکی تھی۔ میں کھسک کر ٹرکوں کے پیچھے جو پہاڑی کی دیوار اور ٹرکوں کے درمیان چھوٹی سی گلی بنی ہوئی تھی وہاں آگیا۔ چائے کی خالی چینک میرے ہاتھ میں تھی۔ ٹرکوں پر ترپالیں پڑی ہوئی تھیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کسی بھی وقت ادھر کوئی فوجی آسکتا تھا۔ مگر بھارتی فوجی سارے کے سارے ٹرکوں کی دوسری طرف سڑک پر بیٹھے چائے پینے اور پراٹھے کھانے میں مصروف تھے۔

میں نے چینک آخری ٹرک کے عقب میں نیچے رکھ دی۔ جیب سے پلاسٹک کا ڈبہ نکال کر کھولا اور اس میں سے ایک کیپسول بم نکال کر آخری ٹرک کی ترپال کی ایک درز

میں سے ٹرک کے اندر ڈال دیا۔ اسی طرح میں جلدی جلدی ایک ایک کیپسول بم اور ٹرکوں کے اندر رکھتا آگے بڑھتا گیا۔ چھوٹا سا کیپسول ٹرک میں کسی بھی جگہ سے ا ڈالنا مشکل کام نہیں تھا۔ ترپال کی رسیوں اور اس کے سوراخوں میں سے میں بڑی آ سے کیپسول اندر ڈال سکتا تھا۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ کسی طرف سے کوئی اچانک آکر مجھے ایسا کرتے دیکھ نہ لے۔ مگر مجھے اسے خطرے سے بے نیاز ہو کر یہ کام تھا اور میں نے گیارہ کے گیارہ ٹرکوں میں گیارہ بموں کے کیپسول ڈال دیئے۔

اس کے ساتھ ہی میں تیز تیز قدم اٹھاتا آخری ٹرک کے پاس آگیا جہاں میں چائے کی خالی چینک زمین پر رکھی ہوئی تھی۔ ٹرکوں کے پیچھے اندھیرا تھا جس کی وجہ دو ٹرکوں کے درمیان جو تھوڑی سی خالی جگہ تھی وہاں سے میں سڑک پر بیٹھے ہ بھارتی فوجیوں کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ میں نے چائے کی خالی چینک اٹھائی اور ٹرک پیچھے سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

اس وقت تک فوجی لوگ چائے پی چکے تھے اور سگریٹ لگائے اگلے تین چار کے جوان ٹرکوں کے پاس آکر ٹائروں کو جھک کر دیکھ رہے تھے اور ان پر پڑی ہوئی تر کی رسیاں کھینچ کھینچ کر دیکھ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے بڑے ٹھیک وقت پر باہر نکل آیا تھا۔ غلام محمد اور کمانڈو شیروان ٹوکروں میں مگ او گلاس ڈالتے ہوئے بار بار گردن موڑ کر آخری ٹرک کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ انہوں مجھے سڑک کے اندھیرے میں آخری ٹرک کے پیچھے سے نکلتے دیکھا تو یقیناً انہوں اطمینان کا سانس لیا ہوگا۔ میں خالی چینک اٹھائے جلدی جلدی چل کر ان کے پاس چینک زمین پر رکھ کر میں بھی خالی برتن ایک ٹوکری میں ڈالنے لگا۔ کمانڈو شیروان زبان میں مجھ سے پوچھا۔

"ہوگیا؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"او کے"

ایک ٹوکری کمانڈو شیروان نے اٹھائی۔ ایک ٹوکری غلام محمد نے اٹھائی۔ میں نے دونوں خالی چینکیں ہاتھوں میں پکڑیں اور واپس لنگر خانے کی طرف چل پڑے۔ بھارتی فوجی ڈانگری ابھی تک وہیں کھڑا ایک سکھ فوجی جوان سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم دونوں اس کے قریب سے گزرے تو ڈانگری نے غلام محمد سے کہا۔

"غلام محمد! چینکوں کو دھو کر رکھنا"

غلام محمد نے فوراً جواب دیا۔

"اچھا جی"

لنگر خانے میں آکر ہم نے برتنوں کو ایک طرف رکھ دیا۔ وہاں دو باورچی موجود تھے جو چیزوں کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ غلام محمد کے ساتھ ہم بھی برتنوں کو دھونے میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں ٹرکوں کے انجنوں کے سٹارٹ ہونے کی اور انہیں سائیڈ پر سے نکالنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اب ہمیں یہاں سے چلے جانا ہوگا"

غلام محمد نے آہستہ سے کہا۔

"میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ پیچھے نہیں رہوں گا۔"

اس کے پیچھے رہ جانے سے معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اس سے پوچھا جا سکتا تھا کہ اس کے دو آدمی جو ساتھ آئے تھے وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ کمانڈو شیروان نے غلام محمد سے کہا۔

"چلو تم بھی ہمارے ساتھ چلو"

برتنوں کو صرف پانی سے ہی صاف کرنا تھا۔ ہم نے برتنوں کو ایک طرف لگا دیا اور لمبے کرتوں کے دامن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے لنگر خانے سے باہر آگئے۔ غلام محمد نے دودھ کے خالی ولٹوہے پہلے ہی باہر رکھے ہوئے تھے۔ ایک ولٹوہا اس نے اٹھا لیا۔ دو ولٹوہے خچر پر لادے اور ہم تینوں فوجی لنگر سے واپس چل پڑے۔

اس وقت دور سے فوجی کانوائے کے پہلے ٹرک کی بتیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ابھی یہ ٹرک پل سے سوڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ ہم تیز تیز چل رہے تھے اور خچر کو بھی تیز تیز چلا رہے تھے۔ جب ہم اندھیرے میں آگئے تو ایک طرف ہو کر جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان نے کچھ سوچ کر غلام محمد سے کہا۔

"تم نکل جاؤ۔ تمہارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں"

بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ ہم فوجی لنگر کے قریب ہی ہیں اور ٹرکوں کے دھماکے اور شعلے دیکھ کر وہ کہیں گھبرا کر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جس سے ہم کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ غلام محمد نے خچر پر اپنا ولٹوہا بھی رکھا اور وہاں سے تیز تیز چلتا نکل گیا۔

ہماری نظریں پل کے سرے پر لگی ہوئی تھیں جہاں سرچ لائٹ کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا ریموٹ کنٹرول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ کمانڈو شیروان نے دوسرا ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اپنے ریموٹ کنٹرول کے گیارہ بٹن دبا کر کانوے کے ٹرکوں کو دھماکے سے اڑانا تھا۔ میں نے اپنے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر پل کے دوسرے سرے کی بنیادوں میں جو بم کی سٹکیں لگائی تھیں ان کو اڑانا تھا۔ یہ بڑے ہیجانی لمحے تھے۔ یہ خیال ہم دونوں کو بار بار دماغ میں آکر پریشان کر رہا تھا کہ اگر کسی انسانی غلطی کی وجہ سے بم نہ پھٹ سکے تو ہمارا سارا مشن دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

فوجی کانوائے کے پہلے تین ٹرک پل پر چڑھ چکے تھے اور بڑی آہستہ رفتار کے ساتھ پل پر سے گزر رہے تھے۔ کمانڈو شیروان نے کہا۔

"تم اپنا بٹن میرے پہلے بٹن دبانے کے بعد دباؤ گے۔"

"او کے"

میں نے اپنے نفسیاتی ہیجان پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں اس کے کئی کمانڈو آپریشنز کامیابی سے کر چکا تھا مگر نہ جانے کیوں اس آپریشن کے وقت نفسیاتی دباؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔

کانوائے کے ٹرک آہستہ آہستہ بے معلوم رفتار کے ساتھ پل پر آگے کی

رینگ رہے تھے۔ پل کافی لمبا تھا نیچے برساتی نالے کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ دور اندھیرے میں ہمیں پل نظر نہ آتا اگر پل کے دونوں سروں پر لگی ہوئی سرچ لائٹوں کی روشنیاں ان پر نہ پڑ رہی ہوتیں۔ جب کنوائے کے پورے ٹرک پل کے اوپر آگئے تو میں نے دیکھا کہ ابھی پل کے دوسرے سرے تک کم از کم تین چار ٹرکوں کا فاصلہ باقی تھا۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"کمانڈو اب کیا سوچ رہے ہو۔ اگلا ٹرک اڑا دو"

کمانڈو شیروان پر بھی ہیجانی کیفیت طاری تھی اس نے کہا۔

"میرے پہلا بٹن دبانے سے تم اپنے بٹن کو دبا دینا۔ او کے۔ میں بٹن پریس کرنے لگا ہوں۔"

میں اندھیرے میں کمانڈو کی انگلی کو نہیں دیکھ سکتا تھا جو اس نے ریموٹ کنٹرول کے ایک بٹن پر رکھی ہوئی تھی۔ میری نگاہیں سب سے پہلے ٹرک پر لگی ہوئی تھیں جس کی عقبی سرخ بتی مجھے دور سے لال انگارے کی طرح نظر آرہی تھی۔ اچانک ایک شعلہ سا بھڑکا۔ ایک بجلی سی چمکی اور پھر ایک دھماکہ کی گونج سنائی دی۔ پہلا ٹرک اڑ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ اس بٹن کے دبانے کے بعد مجھے کوئی دھماکہ سنائی نہ دیا۔ پہلے ٹرک کے شعلے ابھی دوسرے ٹرک تک نہیں آئے تھے۔ کانوائے کے ٹرک رک گئے تھے۔ اچانک دوسرے ٹرک میں بھی دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی پل کا اگلا حصہ نیچے بیٹھ گیا۔ اب وہاں یہ صورت بن گئی کہ ایمونیشن کے ٹرک پھٹ رہے تھے۔ ان میں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ٹرک کی باڈیوں کے ٹکڑے اڑ رہے تھے اور وہ بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے ٹکرا ٹکرا کر پل کے ساتھ ہی نیچے گر رہے تھے۔ پچھلے تین ٹرک ابھی تک پل کے پہلے سرے کے پاس ہی تھے۔ مجھے دوسرے ٹرکوں کے شعلوں کی روشنی میں ان میں سے تین فوجی چھلانگیں لگاتے نظر آئے۔ اتنے میں ان تینوں ٹرکوں میں ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور تینوں ٹرکوں کے پل کے ساتھ ہی پرخچے اڑ گئے۔ اب وہاں آگ اور شعلوں اور دھوئیں کی ایک آبشار سی پل کے نیچے

ٹرکوں کو لے کر گر رہی تھی۔ وہاں اب کوئی پل نہیں تھا۔ نیچے برساتی نالے میں ٹرکوں کے ڈھانچوں میں ابھی تک دھماکے ہو رہے تھے۔ ان کا اسلحہ ابھی تک پھٹ رہا تھا۔

اب ہمیں بھی وہاں نہیں ٹھہرنا تھا۔

ہم رات کے اندھیرے میں پہاڑی راستوں' گھاٹیوں اور کھڈوں میں سے گزر کر اپنی کمیں گاہ پر پہنچ گئے۔ ہمارا کمانڈو آپریشن کامیاب رہا تھا۔ ہم نے ٹارگٹ مار لیا تھا۔ اس پل کو تباہ کر دیا تھا جس کے راستے کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کئے جانے والا گولہ بارود اور اسلحہ آتا تھا۔ میں اور کمانڈو شیروان اگلے دو تین دن خفیہ کمیں گاہ میں چھپے رہے۔ کیونکہ پل کی تباہی کے بعد وادی میں بھارتی فوج اور ملٹری انٹیلی جنس کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ اس پل کی تباہی نے کشمیری مجاہدین کے حوصلے بلند کر دیئے تھے اور وہ پہلے سے زیادہ بڑھ چڑھ کر بھارتی فوجی قافلوں پر حملے کر رہے تھے۔ ہمارے مخبر نے آکر اطلاع دی کہ فوج نے قریبی گاؤں کے کچھ آدمیوں کو پکڑ لیا ہے۔ غلام محمد گوالے کو نہیں پکڑا تھا۔

تیسرے دن ہمیں خبر ملی کہ بھارتی فوج کے ایک دستے نے ہندواڑہ کے علاقے کے ایک گاؤں کو آگ لگا دی ہے اور عورتوں کی بے عزتی کی ہے اور گاؤں کے مسجد کے امام صاحب کو پکڑ کر ٹارچر سنٹر میں لے گئے ہیں۔ کمانڈو شیروان نے غصے میں کہا۔

"ہمیں امام صاحب کو بھارتی ٹارچر سیل سے ہر حالت میں نکالنا ہو گا اور ان فوجیوں کو جہنم واصل کرنا ہو گا۔ جنہوں نے بے گناہ کشمیریوں کے گھر جلائے ہیں اور مسلمان عورتوں کی بے عزتی کی ہے۔"

میں کمانڈو کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ فوجی کس کیمپ سے آئے تھے؟"

کمانڈو نے اسی وقت مخبر کو بلا لیا اور اس سے یہی سوال پوچھا۔ اس نے بتایا ہندواڑہ کے قصبے سے دو میل پیچھے وادی کے جنگل میں ڈوگرہ رجمنٹ کا کیمپ ہے۔ فوجی اسی کیمپ سے آئے تھے۔ ہمیں یہ بھی سراغ مل گیا کہ امام مسجد کو اسی کیمپ کے

ٹارچر سیل میں رکھا گیا ہے اور اس کو سخت اذیت دی جا رہی ہے۔ اور اس سے پل تباہ کرنے والے مجاہدوں کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔ میں نے کمانڈو سے کہا۔

"ہمارا فرض ہے کہ جو کام ہم نے سرانجام دیا تھا اس کے عوض موت کے منہ میں جانے والے امام مسجد کو بھارتیوں کی قید سے نکالا جائے۔ میں آج ہی رات کو فوجی کیمپ کے مشن پر جانے کو تیار ہوں۔"

کمانڈو کہنے لگا۔

"ہمیں سب سے پہلے ہندواڑہ کے فوجی کیمپ کی پوری تفصیل معلوم ہونی چاہئے۔ میں کل ہی اپنے آدمی کو اس طرف بھیجتا ہوں۔"

دوسرے روز کمانڈو اپنے ایک خاص مجاہد جاسوس کو ہندواڑہ کے فوجی کیمپ کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ مجاہد جاسوس دوسرے روز دوپہر کے وقت واپس آیا اس نے کہا۔

"فوجی کیمپ ہندواڑہ کی باؤلی کے پاس واقع ہے۔ وہاں لکڑی کی ایک بارک ہے۔ ایک کوارٹر گارڈ ہے اور بارک کے کونے میں پتھروں سے بنائی گئی ایک کوٹھڑی ہے۔ یہ کوٹھڑی ٹارچر سیل ہے۔ یہاں کشمیری مجاہدین کو لا کر انہیں غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ امام مسجد کو بھی اسی کوٹھڑی میں قید کیا گیا ہے۔"

کمانڈو نے پوچھا۔

"ہندواڑہ کے اس بھارتی فوجی کیمپ میں فوج کی نفری کتنی ہے۔"

مجاہد جاسوس نے کہا۔

"سو ڈیڑھ سو کے قریب بھارتی فوجی اس کیمپ میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔"

"سیکورٹی کی کیا پوزیشن ہے؟"

مجاہد جاسوس کی زبانی معلوم ہوا کہ فوجی کیمپ چونکہ عارضی ہے اس لئے اس کے ارد گرد کوئی دیوار نہیں ہے۔ صرف خاردار تار کی باڑ لگا دی گئی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی گیٹ ہے جہاں ایک فوجی دن رات پہرے پر موجود رہتا ہے۔ گیٹ کے اندر کی طرف دو مشین گن پوسٹیں ہیں۔ کوارٹر گارڈ کے باہر فوجی گاڑیوں کے کھڑے ہونے کی

جگہ ہے۔ اور رات کو کیمپ کے گرد دو تین فوجی ڈوگرے گشت لگاتے رہتے ہیں۔ کمانڈو نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"ہمیں آج رات ہی اٹیک کر دینا چاہئے۔"

ہمارے پاس ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ ہونے والے انتہائی طاقتور کیپسول سائز کے دس پندرہ بم ابھی موجود تھے۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"ہمیں اپنے کمانڈو آپریشن پر تھوڑا مزید غور فکر کرنا ہوگا۔ آج رات کا پروگرام ہمیں ملتوی کر دینا چاہئے۔"

کمانڈو شیروان بھی سوچنے لگا۔ اس کو محسوس ہوا کہ واقعی اس مشن کے لئے جرات اور دلیری کے ساتھ ساتھ عقلمندی کی بھی ضرورت ہے اور ہمیں پوری منصوبہ بندی کر کے کمیں گاہ سے نکلنا چاہئے۔ دوسرا سارا دن ہم ہندواڑہ فوجی کیمپ کے بارے میں غور فکر کرتے رہے۔ اس دوران کمانڈو نے اپنے ایک مجاہد کو جو بہترین فوٹوگرافر بھی تھا ہندواڑہ کے بھارتی فوجی کیمپ کی تصویریں اتارنے کے لئے بھیج دیا۔ یہ مجاہد رات کو واپس آیا۔ وہ کشمیری چرواہے کے بھیس میں دو بھینسیں لے کر فوجی کیمپ کے آس پاس پھرتا رہا تھا اور خفیہ کیمرے سے تصویریں بھی اتارتا رہا تھا۔

اس نے پندرہ بیس تصویریں اتاری تھیں۔ ان تصویروں کی روشنی میں ہم نے ہندواڑہ فوجی کیمپ کا ایک نقشہ تیار کر لیا اور ساری منصوبہ بندی کر لی کہ ہمیں کس طرف سے اس بھارتی کیمپ میں داخل ہونا ہوگا اور وہاں کیا کچھ کرنا ہوگا۔ اس میں جس بات کو ہم نے سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت دی تھی وہ امام مسجد کو کیمپ کی اذیت گاہ یعنی پتھر کی کوٹھڑی سے نکالنا اور اسے واپس اس کے گھر پہنچانا تھا۔ یہ مشن کوئی آسان مشن نہیں تھا۔ ہمیں دشمن کے مورچوں میں گھس کر مولوی صاحب کو نکال کر لانا تھا۔ اس کے لئے

خاص حکمت عملی اور منصوبہ بندی کی ضرورت تھی اور ہم نے اپنی طرف سے ہر قسم کے خطرات اور خدشات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک آپریشن تیار کیا تھا۔ جب ہم نے لائن آف ایکشن تیار کرلی تو میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اس مشن کے لئے ہمیں جس اسلحہ کی ضرورت ہوگی اس میں ہینڈ گرنیڈ لائٹ مشین گنیں اور ایک راکٹ لانچر بہت اہم ہیں۔"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"یہ سارا اسلحہ ہمارے پاس موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک ایک لائٹ مشین گن ساتھ رکھ لیں گے"

میں نے کہا۔

"ایک لائٹ مشین گن تمہارے پاس ہوگی۔ ایک میرے پاس ہوگی۔ چھ سات ہینڈ گرنیڈ تمہارے پاس ہونے چاہئیں میرے پاس بھی اتنے ہی گرنیڈ ہوں گے۔ راکٹ لانچر ایک ہی کافی ہے جو میں اپنے پاس رکھونگا۔ لیکن میں دن کے وقت اس فوجی کیمپ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ہم نے دوسرے روز کا وقت طے کرلیا۔ دوسرے روز صبح صبح سورج نکلنے کے بعد ہم چرواہوں کے بھیس میں ایک ایک بکری ساتھ لے کر ہندواڑہ کے بھارتی فوجی کیمپ طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ہم ایک گھاٹی اور دو پہاڑی ٹیلوں کے دامن میں سے گزر کے بعد ہندواڑہ کیمپ کے جنگل میں آگئے۔ کمانڈو شیروان اس سارے علاقے سے ا طرح واقف تھا۔ ہم نے ایک چھوٹی دوربین اپنے پاس رکھ لی تھی۔ بکریوں کو اپنے سا چلاتے ہم بھارتی فوجی کیمپ کے سامنے کی طرف ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے کے آکر رک گئے اور درختوں کے پتے توڑ توڑ کر اپنی اپنی بکری کو ڈالنے لگے۔ پھر ہم ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان دوربین لگا کر کیمپ کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر نے دوربین مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کیمپ کی جنوب کی طرف سے کیمپ میں داخل ہونا چاہئے

میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ سامنے کی جانب فوجی کیمپ کے گیٹ کے پیچھے مشین گن پوسٹ صاف نظر آرہی تھی۔ اس کا گن مین بھی دکھائی دے رہا تھا جو ڈوگرہ تھا۔ اس نے سر پر کلغی دار سبز رنگ کی فوجی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ کیمپ کے اندر ایک جانب تین فوجی ٹرک اور ایک جیپ کھڑی تھی دو فوجی جوان تیز تیز قدموں سے ایک طرف جارہے تھے۔ میں نے کیمپ کے جنوب کی طرف دیکھا۔ ادھر لمبی بارک کی دوسری جانب ایک کوٹھڑی دکھائی دی جس کے باہر ایک فوجی پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"تم نے کیمپ کے جنوب میں وہ کوٹھڑی دیکھی ہے؟"

کمانڈو بولا۔

"میں نے یہ کوٹھڑی دیکھ کر ہی تمہیں کہا تھا کہ ہم جنوب کی طرف سے کیمپ میں داخل ہوں گے۔ مولوی صاحب یقیناً اس کوٹھڑی میں بند ہیں۔"

میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹالی۔ کمانڈو نے کہا۔

"اسے فرن کی جیب میں رکھ لو۔ یہاں کوئی بھی ڈوگرہ فوجی گھومتا ہوا آسکتا ہے۔"

میں نے دوربین کو جیب میں چھپالیا۔ ہماری بکریاں ہمارے قریب ہی درختوں کی کٹی ہوئی شاخوں کے پتے کھا رہی تھیں۔

"کسی اور چیز کو دیکھنے کی ضرورت تو نہیں؟"

کمانڈو نے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"اب کیا پوچھنا ہے۔ کیمپ سامنے ہے رات کو خاردار باڑھ کاٹ کر اندر گھس جائیں گے۔ اپنی طرف سے وہ ساری احتیاط برتیں گے۔ جو ایک تربیت یافتہ کمانڈو کو برتنی چاہئے۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

کمانڈو شیروان اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو پھر واپس چلتے ہیں۔ یہاں زیادہ دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

ہم نے اپنی اپنی بکری کی رسی تھامی اور دوسری جانب گھاٹی میں اترنے لگے۔ دوپہر کے

بعد کمانڈو شیروان کا ایک خاص مجاہد ہمارے لئے اسلحہ بوری میں ڈال کر لے آیا۔ دو لائٹ مشین گنیں اور ان کا میگزین تھا۔ ایک راکٹ لانچر تھا جس کے ساتھ چار راکٹ تھے۔ بارہ ہینڈ گرنیڈ تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ریموٹ کنٹرول والے دس بارہ کیپسول بم بھی تھے۔ کمانڈو نے ایک خاص آدمی کو ہندواڑہ کیمپ کی طرف یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا ہوا تھا کہ امام مسجد کیمپ والی کوٹھڑی کے ٹارچر سیل میں ہی ہے یا اسے کسی دوسری جگہ پہنچا دیا گیا ہے۔ شام کو اس آدمی نے واپس آکر بتایا کہ ہماری اطلاع کے مطابق مولوی صاحب کیمپ کے اندر ہی ہیں اور کوٹھڑی والے ٹارچر سیل میں انہیں بڑی وحشیانہ اذیتیں دی جا رہی ہیں اور رات کو ان کی چیخوں کی آوازیں آتی ہیں۔ یہ سن کر ہمارا خون کھول اٹھا۔ میں نے کمانڈو شیروان سے کہا ہمیں اس کیمپ کے کسی بھارتی فوجی کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ان لوگوں نے ہندواڑہ کے گاؤں کے مکانوں کو نذر آتش کر کے نہ جانے کتنے بے گناہ کشمیری مسلمانوں کو زندہ جلا دیا ہے اور عورتوں کی بے حرمتی کی ہے۔

کمانڈو پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ کہنے لگا۔

"میرے دوست! ایسا ہی ہو گا۔"

اس رات ہم نے کشمیری چرواہوں کا بھیس بدلنے کی بجائے فل کمانڈو وردیاں پہن لیں۔ سیاہ تنگ پتلونیں، اوپر سیاہ جیکٹیں، گھٹنوں تک چڑھے ہوئے سیاہ بوٹ کمر کے ساتھ بندھی ہوئی میگزین کی بیلٹیں اور سروں پر بندھے ہوئے سیاہ رومال ہم نے اپنے چہروں پر سیاہ رنگ کی لکیریں ڈال لی تھیں۔ ایک مجاہد کمانڈو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ دیہاتی کشمیری کے لباس میں تھا۔ ہم رات کے اندھیرے میں خچروں پر بیٹھ کر اپنے مشن پر نکل کھڑے ہوئے۔ ہماری جیکٹوں کے پاؤچ میں چھ چھ ہینڈ گرنیڈ تھے۔ کاندھوں کے ساتھ ایک ایک لائٹ مشین گن لٹک رہی تھی۔ راکٹ لانچر اور چاروں راکٹ میں نے اپنے خچر پر آگے رکھے ہوئے تھے۔ کمانڈو شیروان کی جیکٹ کے پاؤچ میں بارہ کیپسول بم والا پیکٹ اور ریموٹ کنٹرول بھی تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس بھرا ہوا سائی لینسر ریوالور اور ایک کمانڈو چاقو تھا۔ ایک پستول کمانڈو شیروان کے پاس تھا۔ خاردار تار کا

والا پلاس میری بیلٹ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

وہ رات بڑی اندھیری تھی۔

آسمان پر تارے بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ پہاڑی راستوں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہمارے خچر آہستہ آہستہ ہندواڑہ کے بھارتی فوجی کیمپ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ کمانڈو شیروان کا خچر آگے تھا۔ اس کے پیچھے میرا اور میرے خچر کے پیچھے اپنے مجاہد کا خچر تھا۔ ہندواڑہ تک کا پہاڑی علاقہ ہمارے لئے کوئی نیا راستہ نہیں تھا۔ میں اس سے پہلے بھی اس علاقے میں کشمیری حریت پرست مجاہدوں کے ساتھ مل کر بھارتی غاصب فوجیوں کے خلاف کئی کامیاب معرکے لڑ چکا تھا۔ اور کمانڈو شیروان تو رہنے والا ہی اس علاقے کا تھا۔

اپنی خفیہ کمین گاہ کی پہاڑی سے نکلنے کے بعد ہم نے رات کے اندھیرے میں خچروں کو بائیں جانب ایک وادی کو جانے والی پگ ڈنڈی پر ڈال دیا۔ کشمیر کی خوبصورت جنت نظیر پہاڑیوں کی ڈھلانوں اور دور نیچے وادی میں کہیں کہیں کسی گاؤں کی بتی ٹمٹماتی نظر آ رہی تھی۔ ہم خاموشی سے چل رہے تھے۔ کبھی کبھی ضرورت کے وقت کوئی بات کر لیتے تھے۔ پہاڑی پگ ڈنڈیاں اور راستے غیر ہموار ہوتے ہیں اور ان پر خچر ہی آسانی سے چل سکتے ہیں۔ یہاں پر گھوڑوں کے پاؤں بھی پھسل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پہاڑی خچروں کو ان گھاٹیوں اور پہاڑی ڈھلانوں میں چلنے کی عادت ہوتی ہے۔ ہمارے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کسی وقت ہمیں چھو کر گزر جاتے تھے۔ ایک وادی اور ایک پہاڑی درے میں سے گزرنے کے بعد سامنے ہندواڑہ کی وادی اور وادی کا جنگل شروع ہو گیا۔ یہ جنگل میدانی جنگلوں کی طرح نہیں تھا۔ یہ پہاڑی جنگل تھا جہاں ڈھلانوں پر اور باہر کو نکلی ہوئی چٹانوں پر بھی درخت ہی درخت اگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔ قریب ہی ڈھلان پر دھان کے کھیت تھے جو چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کی طرح بنے ہوئے تھے۔ پہاڑی چشمے سے نکلا پانی نالے کی شکل میں ان کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ ہم یہاں سے بھی خاموشی سے گزر گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم جنگل سے باہر نکل کر وادی کے درمیان سے گزرنے والی ایک چھوٹی سی سڑک پر آ گئے۔

سڑک پر بجری بکھری ہوئی تھی۔ ہم نے خچروں کو جلدی جلدی سڑک پر سے گزارا اور سامنے کی پہاڑی کی چڑھائی چڑھنی شروع کر دی۔ اس پہاڑی کی دوسری طرف باؤلی والے تودے کے دامن میں ہندواڑہ کا بھارتی فوجی کیمپ تھا۔ پہاڑی کی چڑھائی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ہم جھاڑیوں اور چنار کے درختوں کے نیچے سے ہو کر جا رہے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی پر آ کر دوسری طرف اترنے لگے تو کچھ فاصلے پر نیچے باؤلی کے بلند تودے کے پہلو میں ہمیں ہندواڑے کے بھارتی فوجی کیمپ کی روشنی نظر آنے لگی۔

ہمارے خچر سنبھل سنبھل کر اترائی اتر رہے تھے۔ جب ڈھلان ختم ہو گئی اور ہمیں زمین پر کتنے ہی کٹے ہوئے درختوں کے تنے ادھر ادھر پڑے نظر آئے تو کمانڈو شیروان نے اپنا خچر روک کر ہمیں بھی اپنے منہ سے ایک پرندے کی ہلکی سی آواز نکال کر رکنے کا اشارہ کیا۔ میں اور مجاہد اپنے خچروں پر بیٹھے کمانڈو شیروان کے پاس آ کر رک گئے۔ کمانڈو شیروان نے آہستہ آواز میں کہا۔

"ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ اب ہم میں سے کوئی نہیں بولے گا۔ ہم صرف اپنے مخصوص اشاروں میں بات کریں گے۔ ہمیں کھانسی اور چھینک کو منہ میں کپڑا ڈال کر روکنا ہوگا۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟"

میں نے اور اپنے کشمیری مجاہد نے ہاتھ اوپر اٹھا کر آہستہ سے کہا۔

"کوئی سوال نہیں، کوئی اعتراض نہیں"

کمانڈو شیروان نے آہستہ سے کہا۔

"گو۔ گو"

اور ہمارے خچر ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگے۔ ابھی ہم نے ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ نہیں ڈالا تھا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہماری آنکھیں رات کے گھپ اندھیرے کی عادی ہو گئی تھی اور ہم ایک دوسرے کے جسموں کے خاکے بڑی آسانی سے دیکھ رہے تھے۔ کمانڈو شیروان کو معلوم تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ پر اس نے مجھے بھی بتا دیا تھا کہ کمانڈو ایکشن فوجی کیمپ کے کسی خاص حصے سے شروع

جائے گا۔ جہاں درختوں کے کٹے ہوئے تنے زمین پر بکھرے پڑے تھے ہم ان کی دوسری طرف سے ہو کر گزر گئے۔ یہ درخت بھارتی فوجیوں نے وادی میں اپنی فوجی بارکیں بنانے کے لئے بے دریغی سے کاٹ ڈالے تھے۔

فوجی کیمپ کی روشنی قریب آتی جا رہی تھی۔ اس جگہ پہنچ کر کمانڈو شیروان میں اور ہمارا ساتھی کشمیری مجاہد خچروں سے اتر پڑے۔ ہم خچروں کی باگیں تھامے پیدل چلنے لگے۔ ایک خشک برساتی نالہ آ گیا۔ اس میں روڑے اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہم اس میں سے بھی گزر گئے۔ نالے کے دوسرے کنارے سے باہر نکل کر دیکھا کہ فوجی کیمپ کے جنوبی حصے کی خاردار باڑ ہم سے بمشکل بیس پچیس قدموں کے فاصلے پر تھی۔ باڑھ کی دیوار زمین سے دس پندرہ فٹ بلند تھی۔ اس میں خاردار تار کے گچھے نہیں تھے۔ بلکہ خاردار تار کو کھینچ کر اونچی دیوار سی بنا دی گئی تھی۔ ایک طرف لکڑی کے کھمبے پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ کمانڈو شیروان نے اپنے خچر کی باگ کشمیری مجاہد کو پکڑا دی اور مجھے بھی ایسا کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بھی اپنا خچر مجاہد کے حوالے کر دیا۔ کمانڈو نے مجاہد کو خاص اشارہ کیا۔ وہ خچروں کو ایک طرف اندھیرے میں لے گیا۔ اسے وہاں بیٹھ کر ہماری واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

میں اور کمانڈو شیروان ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہم بھارتی فوجی کیمپ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ سامنے خاردار باڑ کی دیوار تھی اور بائیں جانب چند قدموں کے فاصلے پر فوجی بارک کی دیوار آ کر ختم ہوتی تھی۔ یہ بھارتی فوجی بارک کی عقبی اور کونے والی دیوار تھی۔ ہمیں جو کچھ کرنا تھا وہ ہم دونوں کو پہلے ہی معلوم تھا۔ کمانڈو نے مجھے ایک اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب تھا کہ میں اسی جگہ بیٹھا رہوں۔ کمانڈو شیروان کسی چیتے کی طرح پتھر کے قریب والی جھاڑیوں کے اندر گھس گیا۔ اس کا مشن یہ تھا کہ اس نے فوجی کیمپ کی اس عقبی دیوار کے ساتھ اندر کی جانب کھڑی فوجی گاڑیوں اور فوجی سامان اور کوارٹر گارڈ کی چھت کے اوپر کیپسول بموں کو اس طرح اچھال کر پھینکنا تھا کہ وہ وہاں سے زیادہ آگے کی جانب اس جگہ پر پہنچ سکیں جہاں کوارٹر گارڈ کی گاڑیاں کھڑی تھیں

اور فوجی رات کی ڈیوٹی پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ بم چونکہ کیپسول کے سائز
تھے۔ ان کے گرنے کی کوئی خاص آواز پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر ہوتی بھی تو ڈیوٹی
موجود فوجیوں کو یہی لگتا کہ جیسے درختوں پر سے کوئی خشک پھل یا کوئی خشک ٹہنی ٹوٹ کر
گری ہے۔

میں رات کے اندھیرے اور خاموشی میں پتھر کے پیچھے ایک بہادر اور ذمے دار کمانڈو
کی طرح چوکنا ہو کر بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں عقاب کی آنکھوں کی طرح سامنے اور دائیں
بائیں اندھیرے میں فضا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کسی کسی وقت میں اچانک گردن پیچھے
گھما کر بھی دیکھ لیتا تھا۔ میرے ایک کندھے پر راکٹ لانچر لگا تھا۔ چاروں راکٹ میرے
پاس ہی زمین پر رکھے ہوئے تھے۔ لائٹ مشین گن میرے ہاتھ میں تھی۔ میری کمانڈو
وردی سیاہ تھی۔ چہرے کی سفید رنگت کو کیمو فلاج کرنے کے لئے چہرے پر سیاہ لکیریں
پڑی تھیں۔ سر پر سیاہ رومال بندھا ہوا تھا اندھیرے میں سوائے میری آنکھوں کے کچھ
اور کچھ نظر نہیں آسکتا تھا۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک رات گزرتی جا رہی تھی۔

فوجی کیمپ کی طرف سے کسی فوجی کے اونچی آواز میں کسی کو ہالٹ کہنے کی آواز آئی
تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر خیال آیا کہ یہ ہالٹ کمانڈو شیروان کو نہیں کہا گیا۔ اسے
کیمپ کے اندر جانے کی ضرورت نہیں پڑ سکتی اور آواز کیمپ کے اندر کچھ فاصلے سے آئی
تھی۔ میں نے احتیاط کے طور پر لائٹ مشین گن کو کاندھے سے لٹکا لیا اور سائی لینسر والا
ریوالور نکال کر مضبوطی سے اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ہنگامی صورت حال پیدا ہو جانے پر
ریوالور کے فائر کا دھماکہ پیدا نہیں ہونا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہم دھماکہ خیز فائرنگ
پوزیشن میں نہیں تھے۔ میں ایک ایک سانس گن رہا تھا۔ کمانڈو شیروان ابھی تک واپس
نہیں آیا تھا۔ خطرہ یہی تھا کہ کہیں وہ دیکھ نہ لیا جائے اور فوجی اسے گولی نہ مار دیں۔ رات
کے وقت فوجی کیمپوں کے اردگرد چھپ چھپ کر آنے والوں کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا
حکم ہوتا ہے۔ کمانڈو شیروان کو گئے پندرہ بیس منٹ ہو گئے تھے۔ مجھے یہ پندرہ بیس منٹ

گھنٹے محسوس ہوئے تھے۔

اچانک میں نے سامنے کیمپ کی خاردار دیوار کے پاس کسی چیز کو دیکھا کہ رینگ کر
خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ آگے کو جا رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو یہ کوئی آدمی تھا۔ یہ
آدمی کمانڈو شیروان ہی ہو سکتا تھا میرے دیکھتے دیکھتے یہ رینگتا ہوا سایہ مڑا اور جہاں میں
بیٹھا تھا اس طرف رخ پھیر کر رینگنے لگا۔ میں نے ریوالور پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط
کر لی۔ سایہ قریب آیا تو وہ کمانڈو شیروان ہی تھا۔ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"میں نے بارہ کے بارہ کیپسول بم خاردار تاروں کی دیوار کے ساتھ ساتھ اور کوارٹر
گارڈ کی چھت پر ڈال دیئے ہیں۔"

ہم بڑی دھیمی آواز بلکہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"کیمپ کے اندر کی کیا پوزیشن ہے؟"

کمانڈو شیروان نے کہا۔

"سیکورٹی گارڈ جگہ جگہ ڈیوٹی پر ہیں ٹارچر سیل کے باہر کا کچھ پتہ نہیں دور سے کچھ
نظر نہیں آیا۔"

"ہمیں ٹارچر سیل کی طرف ایڈوانس کرنا ہوگا۔"

"او کے۔ گو"

میں اور میرے پیچھے پیچھے تھوڑا دائیں جانب ہو کر کمانڈو شیروان بڑے پتھر کی اوٹ
سے نکلے اور اندھیرے میں بھارتی فوجی کیمپ کی خاردار تاروں والی دیوار کے جنوب کی
طرف رینگنے لگے۔ ہم کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے تاروں سے کوئی پندرہ بیس فٹ کے
فاصلے پر آکر رک گئے۔ ہماری عقابی آنکھیں رات کے اندھیرے میں تاروں کو اور تاروں
کے پیچھے فوجی بارک کی کونے والی دیوار کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہاں کوئی نقل
و حرکت معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ بارک کے کونے والی دیوار کے اوپر ایک بلب روشن تھا
اس کی روشنی بارک کے سامنے کی جانب پڑ رہی تھی۔ کمانڈو شیروان تیزی سے رینگ کر
میرے قریب آگیا۔ اس نے میرا ہاتھ ذرا سا دبایا۔ یہ خطرے کا سگنل تھا۔ میں نے سر نیچے

زمین کے ساتھ لگا کر دونوں جانب دیکھا۔ ایک پٹرول پارٹی آ رہی تھی یہ دو فوجی سپاہی تھے جو باتیں کرتے مزے مزے سے خاردار تاروں کی دیوار کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ انہیں ہم سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر سے گزرنا تھا۔

ہم نے اپنے سر بلکہ ٹھوڑیاں زمین کے ساتھ لگا رکھی تھیں اور نظریں پٹرول پارٹی کے دونوں سپاہیوں پر جمی تھیں۔ ایک سپاہی کسی بات پر ہنسا۔ دوسرے نے اسے کچھ کہا دونوں خاموش ہو گئے اور خار دار تاروں کو ایک دوبار جھک کر دیکھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ جب وہ اندھیرے میں کافی دور چلے گئے تو کمانڈو شیروان نے کہا۔

"ایک ہی پٹرول پارٹی ہے میں جا کر تاروں کو کاٹتا ہوں۔"

"کمانڈو شیروان نے مجھ سے تار کاٹنے والا پلاس لیا اور رینگتا ہوا خاردار دیوار کی طرف بڑھا۔ وہ ایک جگہ لیٹ کر تاروں کو کاٹنے لگا۔ جب تاروں کو خاص انداز میں کاٹ کر دیوار میں گزرنے کے لئے راستہ بن گیا تو اس نے ہاتھ اوپر کر کے ہلایا۔ اس کا بازو سائے کی طرح اوپر نیچے ہوتا دیکھتے ہی میں کہنیوں کے بل تیزی سے رینگ کر اس کے پاس آ گیا۔

ہم جلدی سے خاردار تاروں والی دیوار کے سوراخ میں سے گزر کر دوسری طرف نکل گئے۔ دوسری طرف جاتے ہی ہم نے کٹی ہوئی تاروں کو پھر سے اوپر اٹھا کر وہ شگاف بند کر دیا۔ پٹرول پارٹی کے سپاہی اندھیرے میں اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم تیزی سے بارک کی دیوار کے ساتھ لگ کر اس جانب رینگنے لگے جس طرف وہ ٹارچر سیل تھا۔ جہاں امام صاحب قید تھے۔ کیونکہ ہمیں سب سے پہلے انہیں وہاں سے نکالنا تھا۔ اب کمانڈو شیروان آگے آگے رینگ رہا تھا۔ کیونکہ اسے ساری لوکیشن کا علم تھا۔ میں رینگتے ہوئے راکٹ لانچر کو بھی آگے آگے لے جا رہا تھا۔ وہاں چونکہ گھاس تھی اس لئے ہماری راکٹ لانچر کے آگے کھسکنے کی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ راکٹ لانچر تین ساڑھے فٹ کی پرنالے جتنے سائز کی نالی کی طرح تھا جس کے پیچھے راکٹ کو چلانے والا ٹریگر لگا تھا۔ یہ راکٹ میدان جنگ میں کاندھے پر رکھ کر دشمن کے کسی ٹینک یا گولہ بارود

ذخیرے پر فائر کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ آدمی زیادہ سے زیادہ تیس چالیس گز کے فاصلے پر سے ٹارگٹ پر راکٹ فائر کرے۔ اس سے زیادہ فاصلے پر راکٹ کا نشانے پر لگنا مشکوک ہو جاتا تھا۔ چاروں راکٹ میں نے لائٹ مشین گن کی سلنگ کے ساتھ اپنی پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ بارک کی دیوار ختم ہو گئی۔ کمانڈو شیروان نے ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور خود اس طرف رینگتا ہوا چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ ٹارچر سیل والی کوٹھڑی ہمیں سامنے نظر آنے لگی۔ اس کے آگے کی جانب روشنی تھی۔ پیچھے اندھیرا تھا۔ ہم اب سانس روک روک کر آگے بڑھ رہے تھے۔ جب کوٹھڑی کی دیوار پانچ فٹ رہ گئی تو کمانڈو شیروان نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں وہیں رک گیا۔ کمانڈو شیروان دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ دیوار کے کونے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ چونکہ دیوار کی دوسری طرف جدھر ٹارچر سیل کا دروازہ تھا روشنی تھی اس لئے کمانڈو شیروان کا سر مجھے اس روشنی کے پس منظر میں سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ کمانڈو نے اپنا سر آگے کر کے دیوار کی دوسری جانب دیکھا۔

پھر اس نے سر میری طرف گھمایا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں پیچھے ہو جاؤں۔ میں جلدی سے اٹھا رینگتا ہوا تین چار قدم پیچھے چلا گیا۔ یہاں جنگلی جھاڑیاں تھیں دوسرے لمحے کمانڈو شیروان بھی رینگ کر میرے پاس آ گیا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"دو فوجی ہیں۔ ایک سیل کے آگے ٹہل رہا ہے۔ دوسرا سٹول پر بیٹھا ہے۔ دونوں کے پاس برین گنیں ہیں"

میں نے کمانڈو کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم اس طرف سے دیوار کے ساتھ رہو۔ میں دوسری طرف سے ان دونوں کو ٹھکانے لگاتا ہوں۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو میری مدد کو آ جانا۔"

"اوکے"

یہ کہہ کر کمانڈو دیوار کی ایک طرف اور میں دوسری جانب رینگنے لگا۔ دوسری طرف ٹارچر سیل کو کونے پر جہاں دیوار مڑ جاتی تھی وہاں اندھیرے میں ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

میں رینگتا ہوا قریب گیا۔ دیکھا کہ یہ ٹائر تھے جو ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ میں ٹائروں کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ دیوار ختم ہو رہی تھی۔ دوسری طرف روشنی میں سامنے ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ میرے لئے وہاں گھات لگانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ صرف ٹائروں کا ڈھیر ہی تھا مگر یہ فاصلے پر تھا۔ میں نے تین سیکنڈ سوچا اور ٹائروں کی اوٹ میں بیٹھنے کا فیصلہ کر کے میں ان کے پیچھے اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

اس لمحے گارڈ ڈیوٹی پر تعینات فوجی سپاہیوں نے آپس میں کوئی بات کی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے راکٹ لانچر چاروں راکٹ اور برین گن کندھے سے اتار کر قریب ہی زمین پر رکھ دی تھی۔ اس وقت میری جیکٹ کی جیب میں چھ گرنیڈ تھے۔ چھ گرنیڈ کمانڈو ایکشن شروع ہونے سے پہلے کمانڈو شیروان نے لے کر اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لئے تھے۔ کمانڈو چاقو بھی میری بیلٹ کے ساتھ لگا تھا۔ مگر میں نے سائی لینسر والا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یہاں بھی مجھے وہی کام کرنا تھا اور اسی حکمت عملی کو دہرانا تھا جو اس سے پہلے میں دو تین مرتبہ کر چکا تھا۔ اس کے سوائے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک طرف سے نکل کر میں بڑی آسانی سے برین گن کا برسٹ مار کر دونوں فوجیوں کو ہلاک کر سکتا تھا۔ مگر ہمیں وہاں فائرنگ کے دھماکے نہیں کرنے تھے۔ فائرنگ کی آواز سے سارا کیمپ بیدار ہو جاتا اور ہم ٹارچر سیل سے مولوی صاحب کو نہیں نکال سکتے تھے۔ ہمیں ہر کام خاموشی اور کوئی آواز پیدا کئے بغیر کرنا تھا۔ صرف ایک آواز ضرور پیدا کرنی تھی۔

اور میں نے اس آواز کو پیدا کرنے کے لئے زمین پر سے ایک روڑا اٹھا کر زور سے ٹارچر سیل کی پتھریلی دیوار کے ساتھ مارا۔ کھٹاک کی آواز کے ساتھ روڑا دیوار سے ٹکرا کر ٹارچر سیل کی سامنے کی جانب جا پڑا۔ اس کی بھی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک فوجی تیز تیز چلتا دیوار کے کونے پر نمودار ہوا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے ٹائروں کے ڈھیر کے پاس لانا چاہتا تھا۔ اس دوران میرے اندازے کے خلاف دوسرا فوجی بھی دیوار کے کونے میں سے نکل کر وہاں آگیا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے یہ آواز کیسی تھی؟"

"حوالدار یہی دیکھ رہا ہوں۔"

دوسرے فوجی نے جھک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میرے لئے ان دونوں کو سنبھالنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ مگر مجھے ہر حالت میں ان دونوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ میں ٹائروں کے ڈھیر کے پیچھے اندھیرے میں پنجوں کے بل الرٹ ہو کر بیٹھا تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ دونوں فوجی ایک دوسرے کے پیچھے ادھر ادھر دیکھتے ٹائروں کے ڈھیر کے قریب آ کر رک گئے۔

اتنے میں ان میں سے ایک نے مجھے اندھیرے میں خدا جانے کیسے دیکھ لیا۔ شاید اس نے میری چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ لیا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لئے وہ مجھے اور میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنی برین گن کی طرف بڑھا۔ اس نے برین گن اٹھائی ہی تھی کہ میں نے ریوالور سے اس پر یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیئے۔ ریوالور پر سائی لینسر لگا تھا۔ ٹھک ٹھک کی آواز آئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ دوسرا فوجی جھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو گرتے بعد میں دیکھا پہلے اس نے ریوالور کی مخصوص سائی لینسر والی آواز سن لی تھی۔ وہ ایک دم سیدھا ہو گیا اور برین گن سے ہوائی فائر کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے کھڑے ہو کر پوائنٹ بلینک رینج سے یکے بعد دیگرے اس کے سینے کو نشانہ بنا کر تین گولیاں فائر کر دیں۔ گولی خواہ ریوالور کی ہو خواہ رائفل کی ہو۔ جب وہ جسم میں لگتی ہے تو اس کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا جسم سن ہو جاتا ہے میں نے ایک فوجی پر دو گولیاں فائر کی تھیں اور دوسرے پر تین گولیاں فائر کی تھیں دونوں نیچے گر پڑے تھے۔ میں انہیں برین گن کا ٹریگر دبانے کی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی برین گن کا ٹریگر دبا کر برسٹ فائر کر دیتا تو اس کے دھماکوں کی آواز سے کیمپ کے سیکورٹی گارڈ فوراً بھاگ کر ادھر آجاتے اور ہمارا مشن ہی ناکام ہو جاتا اور ممکن تھا کہ ہم زندہ بھی نہ بچتے۔ ایسی صورت حال میں مجبوراً کمانڈو شیروان کو دوسری طرف سے بھی لائٹ مشین گن کے برسٹ فائر کرنے پڑتے اور سارا کیمپ بیدار ہو جاتا۔ پھر ہم سارے کیمپ میں

ریموٹ کنٹرول کے بموں کے دھماکوں سے چاہے آگ لگا دیتے مگر ہم مولوی صاحب کو ٹارچر سیل سے نکال کر نہ لے جا سکتے تھے۔ یہ کام پھر بے حد مشکل ہو جاتا اور ہم جس مقصد کو لے کر وہاں آئے تھے وہ پورا نہ ہوتا۔

میں دوڑ کر دونوں فوجیوں کے سر پر جا پہنچا۔ اور ان کی برین گنیں ان کے نیم مردہ ہاتھوں سے پکڑ کر الگ کر دیں۔ اتنے میں کمانڈو شیروان بھی دبے پاؤں چلتا وہاں آگیا۔ میں نے احتیاط کے طور پر ریوالور کی ایک ایک گولی دونوں فوجیوں کی کھوپڑیوں میں اتار دی۔

کمانڈو شیروان بیٹھ گیا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا وہ سرگوشی میں بولا۔

"دروازے کی طرف آجاؤ۔ ادھر اب کوئی نہیں ہے۔"

ہم دیوار کے ساتھ لگ کر چلتے ٹارچر سیل کے دروازے کے قریب آکر رک گئے۔

یہاں دروازے کے اوپر لکڑی کے ڈنڈے کے ساتھ بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ ہمیں اس کی روشنی میں ٹارچر سیل کا دروازہ کھول کر یا اس کے تالے کو توڑ کر اندر داخل ہونا اور مولوی صاحب کو باہر نکالنا تھا۔ ہم نے ٹارچر سیل کے سامنے والی خالی جگہ کا جائزہ لیا۔ ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ کسی دوسرے سیکورٹی گارڈ یا پٹرول پارٹی کے جوان نے ریوالور کے سائی لینسر والے فائروں کی آواز نہ سن لی ہو۔ فوجی اس آواز کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ جب کسی طرف سے ہمیں کوئی فوجی اس طرف آتا نظر نہ آیا تو میں نے کمانڈو شیروان کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود ٹارچر سیل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے رنگ میں ریوالور کی نالی ڈالی اور اسے اپنی طرف دو تین بار زور سے کھینچا مگر تالا نہ ٹوٹا۔ کمانڈو شیروان نے غصے میں آہستہ سے کہا۔

"کیا کر رہے ہو؟ اس پر فائر کرو۔"

فائر میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اگر میں نے تالے پر گولی چلائی تو سائی لینسر کی وجہ سے ریوالور کی اپنی آواز تو کم ہوگی مگر جب گولی لوہے کے تالے سے لگے تو دگنی آواز پیدا ہوگی۔ لیکن وقت بھی نازک تھا۔ کیمپ میں اس وقت کوئی بھی فوجی ادھر آسکتا تھا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور لوہے کے موٹے تالے پر ریوالور کا فائر کر دیا۔ تالا

ٹوٹ گیا مگر اس کی کافی اونچی چھنچھناہٹ کا شور پیدا ہوا۔ کمانڈو شیروان دوڑ کر آگیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ اندر تنگ کوٹھڑی میں بڑی دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ اس دھیمی روشنی میں ہمیں ایک شرعی ڈاڑھی مونچھوں والا نیم عریاں آدمی فرش پر اوندھا پڑا نظر آیا۔ یہ ہندواڑے کے اس گاؤں کے امام صاحب تھے جیسے بھارتی فوجیوں نے آگ لگادی تھی اور جس کی مسجد کو شہید کر کے امام کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ ہم نے جلدی سے انہیں ہلایا۔ مولوی صاحب کے جسم پر صرف ایک شلوار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جسم پر جگہ جگہ خون جما ہوا تھا۔ ناک سے بھی خون بہہ بہہ کر جم رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ کمانڈو شیروان نے انہیں آواز دی۔ مگر مولوی صاحب بے ہوش تھے یا شہید ہو چکے تھے۔ کمانڈو نے ان کے دل پر کان لگایا۔ کہنے لگا۔

"امام صاحب زندہ ہیں"

اور کمانڈو شیروان نے مولوی صاحب کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ جیسے ہی ہم دروازے کی طرف بڑھے باہر سے فوجیوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"تالا ٹوٹا ہوا ہے۔"

دوسرے فوجی نے گالی دے کر کہا۔

"کشمیری کمانڈو ہیں۔ اندر ہوں گے اٹیک کرو"

ٹارچر سیل کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور جیسے ہی چھ سات بھارتی فوجی اندر گھسے ہم نے اپنی لائٹ مشین گنوں کا فائر کھول دیا۔ بھارتی فوجی وہیں ایک دوسرے پر الٹ الٹ کر گرتے چلے گئے۔ باہر بھی بھارتی فوجی تھے۔ انہوں نے پوزیشنیں لے کر باہر سے فائر کھول دیا۔ ان کا اندھا دھند فائر کوٹھڑی کے دروازے پر آرہا تھا۔

کمانڈو نے بے ہوش مولوی صاحب کو کاندھے پر ڈالا اور مجھے چیخ کر کہا۔

"پورے سیکشن کے فوجی لگتے ہیں۔ ان پر گرنیڈ پھینکو میں مولوی صاحب کو لے کر جاتا ہوں۔"

میں بھارتی فوجیوں کی لاشوں کے اوپر سے کود کر دروازے کی دیوار کے پاس گیا۔ جیکٹ کی جیب سے ہینڈ گرنیڈ نکال کر پن نکالا اور اسے باہر پھینک دیا۔ میں نے اسی طرح چار ہینڈ گرنیڈ باہر سامنے اور دائیں بائیں اچھالے جن کے دھماکوں نے باہر کی دو پوزیشنوں میں بیٹھے فائرنگ کرتے فوجیوں کو تو خاموش کردیا مگر ان دھماکوں سے پورا فوجی کیمپ بیدار ہوگیا۔ ہر طرف سے شور وغل کی آوازیں آنے لگیں اور ہمیں ایسے لگا جیسے کیمپ۔ کی ہر جانب سے ہم پر چھوٹے چھوٹے بڑے اسلحے کا فائر شروع ہو گیا ہے۔

میں لائٹ مشین گن کے برسٹ مارتا تارچر سیل کے باہر آگیا اور گولیوں کی بوچھاڑ چاروں طرف مارنے لگا۔ اس دوران کمانڈو شیروان مولوی صاحب کو کاندھے پر ڈالے کوٹھڑی سے نکل کر پیچھے کی جانب اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا دوڑا۔ کیمپ میں ہر طرف روشنی ہوگئی تھی۔ اور کسی قریبی مورچے سے مشین گن کی فائرنگ بھی شروع ہو گئی تھی۔ گولیاں دیواروں اور درختوں سے چیختی ہوئی ٹکرا ٹکرا کر پھٹ رہی تھیں۔ میں لائٹ مشین گن کی بوچھاڑ میں مارتا پیچھے ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک میری دائیں جانب اور پھر اس کے ذرا آگے یکے بعد دیگرے دو ہینڈ گرنیڈ گرتے ہی پھٹ گئے۔ لوہے کے ٹکڑے چیختے ہوئے میرے سر کے اوپر سے گزرے۔ میں جھک کر خاردار تاروں کی طرف دوڑا۔ کمانڈو شیروان مجھ سے پہلے وہاں تک پہنچ چکا تھا۔ ایک دم سے خاردار تاروں والی دیوار کے اوپر روشنی کے راؤنڈ فائر ہوئے اور ساری دیوار اور بارک دن کی طرح روشن ہو گئی۔ اس روشنی میں بھارتی فوجیوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اب مشین گن رائفلوں اور برین گنوں کا فائر سیدھا ہم پر آنا شروع ہو گیا۔ میں زمین پر لیٹ گیا۔ راکٹ لانچر میرے کاندھے سے نکل کر ایک گز پرے جا پڑا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ روشنی کے جو راؤنڈ فائر ہوئے تھے وہ پیراشوٹ والے روشنی راؤنڈ تھے اور آہستہ آہستہ نیچے آرہے تھے۔ ان کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ میں نے اس روشنی میں دیکھا کہ بارک اور خاردار تاروں والی دیوار کے ساتھ گیٹ کی جانب سے فوجیوں کی قطار قطاریں فائرنگ کرتی ہماری طرف تیزی سے دوڑی چلی آرہی تھی۔ یہ فوجی فائر

کی طرح تیزی سے بل کھاتے سانپوں کی طرح دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔

میں نے چیخ کر کمانڈو سے کہا۔

”کمانڈو! نکل جاؤ“

اس کے ساتھ ہی میں نیلنگ پوزیشن میں (گھٹنوں کے بل) ہو گیا۔ لانچر میں ایک راکٹ لوڈ تھا۔ میں نے پہلا راکٹ قریبی بارک کی طرف سے آتے فوجیوں کو نشانے میں لے کر فائر کردیا۔ راکٹ ان کے درمیان دھماکے سے پھٹا۔ دھماکے کے ساتھ شعلے بلند ہوئے اور اس کی روشنی میں مجھے بھارتی فوجیوں کے جسم اڑتے نظر آئے۔ میں نے دوسرا راکٹ اسی پوزیشن میں بیٹھے رخ بدل کر گیٹ کی طرف سے آتے فوجیوں پر فائر کردیا۔ اس طرف بھی راکٹ دھماکے سے پھٹا اور نہ جانے کتنے فوجیوں کے پرخچے اڑ گئے۔ میں خاردار تاروں کی طرف دوڑا۔ روشنی والے راؤنڈ نیچے آکر بجھ گئے تھے۔ مجھے کمانڈو شیروان نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک تین اور روشنی راؤنڈ فائر ہوئے اور میں نے ان کی روشنی میں کمانڈو کو مولوی صاحب کے کاندھے پر ڈالے خاردار تاروں کے شگاف ہی سے باہر کی طرف نکلنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ اس دوران وہاں اور فوجی نمودار ہوئے۔ اور پہلے کی طرح مشین گن اور رائفلوں کا فائر ہماری طرف آنے لگا۔ میں رینگ رینگ کر تاروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب دو ہینڈ گرنیڈ میرے قریب دھماکوں سے پھٹے تو میں نے لیٹے لیٹے باقی چاروں راکٹ بھی پوزیشن بدل بدل کر بھارتی فوجیوں پر فائر کردیئے۔ فوجی کیمپ۔ میں ہر طرف دھماکے شعلے دھواں اور شور وغل مچا ہوا تھا۔ میں نے راکٹ لانچر ایک طرف پھینکا اور لیٹے لیٹے رینگنے لگا۔ اچانک کیمپ میں یکے بعد دیگرے قیامت خیز دھماکے شروع ہو گئے۔ یہ دھماکے خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ آگے گیٹ کی طرف ہوتے جا رہے تھے۔ ہر دھماکے کے ساتھ شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے اور اڑتے انسانوں کی چیخیں سنائی دیتیں۔ کمانڈو شیروان ریموٹ کنٹرول سے کیپسول بموں کو اڑا رہا تھا۔ پھر ایک دھماکہ کوارٹر گارڈ کی طرف ہوا جس کی روشنی میں مجھے ایک جیپ اوپر کو اچھل کر ٹیڑھی ہو کر زمین پر گرتی نظر آئی۔ میں اٹھ کر تاروں کے شگاف کی طرف

دوڑا۔ اتنے میں فوجی بارک میں بھی ایک دھماکہ ہوا اور بارک کی چھت اڑ گئی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے فوجی کیمپ پر بمباری ہو رہی ہے۔ سارے کے سارے کیپسول بم پھٹ کر جتنی تباہی مچا سکتے تھے مچا چکے تھے مگر یہ کوئی ایک دو فوجی مورچے نہیں تھے۔ پورا فوجی کیمپ تھا۔ جہاں نہ فوج کی کمی تھی نہ اسلحہ اور گولہ بارود کی کمی تھی۔ اندھیرا ہو گیا۔ اندھیرے میں یکے بعد دیگرے دو گولے آ کر پھٹے۔ یہ ٹینک کے گولے تھے بھارتی اب روشنی راؤنڈ فائر نہیں کر رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا مقابلہ کشمیری کمانڈو کی پوری کمپنی سے ہے اور ان کے پاس راکٹ لانچر بھی ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے چلائے ہوئے روشنی راؤنڈز کی روشنی میں ہم ان کے سپاہیوں پر راکٹ فائر کر سکیں۔

مجھے خاردار تاروں میں وہ جگہ اندھیرے میں نظر نہیں آ رہی تھی جہاں سے تاریں کاٹ کر ہم نے شگاف ڈالا تھا۔ میرے سارے ہینڈ گرنیڈ اور راکٹ ختم ہو چکے تھے۔ میرے پاس صرف لائٹ مشین گن اور اس کا میگزین ہی باقی تھا۔ جب ٹینک کے گولے میرے اردگرد پھٹے اور پتھر اور لوہے کے ٹکڑے چیخ چیخ کر اڑنے لگے تو میں زمین پر لیٹ گیا اور اندھیرے میں دائیں بائیں اور سامنے کی جانب فائرنگ شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ میں کانٹے والی تاروں کی دیوار کی طرف بھی کھسکتا جا رہا تھا کوئی گولہ پھٹتا تو اس کی روشنی میں مجھے دیوار کے تار نظر آ جاتے۔ ایک بار گولہ پھٹا تو مجھے تاروں میں ایک سوراخ دکھائی دے گیا۔ بھارتی فوجیوں کو اب میں بھی شاید نظر نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ فائرنگ میری دائیں جانب ہو رہی تھی اور اس طرف سے گولیاں چیختی ہوئی گزر رہی تھیں۔ ٹینک کی باری بند ہو گئی۔

میں تاروں میں ٹوٹی ہوئی جگہ دیکھ چکا تھا۔ میں اندھیرے میں اٹھ کر اس طرف پڑا۔ اور تیزی سے شگاف میں سے دوسری طرف نکل گیا۔ مجھے کمانڈو شیروان نظر میں نے یہی سمجھا کہ وہ مولوی صاحب کو نکال کر لے گیا ہے۔ میں نے شگاف سے لائٹ مشین گن کندھے پر ڈالی اور اندھیرے میں درختوں کی طرف دوڑا ابھی

کافی دور تھا کہ کسی طرف سے ٹینک کا گولہ آ کر مجھ سے دس بارہ قدم آگے پھٹا۔ میں نے گولے کی چیخ کی آواز پہلے سن لی تھی۔ میں نے زمین پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ گولا دھماکے سے پھٹا پتھر اور لوہے کے ٹکڑے زناٹے سے ادھر ادھر بکھر گئے۔ کچھ مٹی میرے اوپر بھی گری۔ میں لیٹا ہوا تھا بچ گیا۔ دوڑ رہا ہوتا تو میں اڑ گیا تھا۔

میں دوبارہ دوڑنے کے لئے اٹھا تو عین اس وقت کیمپ کی جانب سے اکٹھے تین روشنی راؤنڈ ایک کے بعد ایک فائر ہوئے جن کی روشنی میں گھاس کے تنکے تک نظر آنے لگے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ ابھی روشنی راؤنڈز کی روشنی بجھی نہیں تھی اور میں بیٹھے بیٹھے زمین سے باہر نکلے ہوئے پتھروں کی طرف چلنے ہی لگا تھا کہ میرے سامنے اور دائیں بائیں کی جانب سے زبردست فائرنگ کے ساتھ کتنے ہی بھارتی فوجی دوڑتے ہوئے چھلانگیں لگاتے ہوئے میرے سامنے آ گئے۔ ان کی رائفلوں اور برین گنوں اور سٹین گنوں کے رخ میری طرف تھے۔ ان کا سیکشن کمانڈو ہاتھ میں پستول پکڑے میری طرف آیا اور اس نے آتے ہی مجھے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔ میں انہیں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں تو چرواہا ہوں۔ میرا حلیہ فل کمانڈو کا حلیہ تھا۔ میری شکل، کپڑے اور میرے پاس جو اسلحہ تھا وہ گواہی دے رہا تھا کہ میں خطرناک کمانڈو ہوں۔

سیکشن کمانڈو ٹھڈے مارتے مارتے تھک گیا تو دوسرے فوجیوں نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا۔ فوراً میری تلاشی لیتے ہوئے میرا ریوالور، لائٹ مشین گن کمانڈو چاقو اور گن بیلٹ انہوں نے اپنے قبضے میں کر لی۔ میرے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے اور کھینچتے ہوئے کیمپ کے گیٹ کی طرف لے جانے لگے۔ اس دوران روشنی راؤنڈ بجھ گئے مگر فوجی کیمپ کی طرف کافی روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں مجھے کیمپ کے کئی جگہوں سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا اور ایسی آوازیں آ رہی تھیں کہ جیسے فوجی چلا رہے ہیں۔ آگ بجھ چکی تھی مگر دھواں اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ فوجی کیمپ کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ ہمارے کیپسول بموں نے گیٹ

کا ایک حصہ اڑا دیا تھا۔ فوجی ادھر ادھر دوڑ دوڑ کر کریٹ باہر نکال رہے تھے۔ شاید یہ اسلحہ کے کریٹ تھے۔ مجھے دھکا دے کر فوجی ٹرک میں گرا دیا گیا۔ چھ سات مسلح بھارتی فوجی بھی اندر آ گئے اور ٹرک ایک طرف کو چل پڑا۔

مجھے ٹرک میں اس طرح سے بٹھایا گیا تھا کہ میں بھارتی فوجیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ یہاں میرے دونوں ہاتھ رسیوں سے پشت کی طرف باندھ دیئے گئے۔ اس وقت مجھے کمانڈو شیروان کا خیال آ رہا تھا۔ خدا کرے کہ وہ مولوی صاحب کو لے کر نکل گیا ہو۔ ضرور وہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ یہ لوگ اسے گرفتار نہیں کر سکے تھے۔ اگر گرفتار کرتے تو وہ بھی میرے ساتھ ہوتا۔ پھر مجھے اپنے اس مجاہد کمانڈو کا بھی خیال آیا جو خچر لے کر کمیں گاہ سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اسے ہم نے پیچھے درختوں کے نیچے اندھیرے میں بٹھا دیا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ مولوی صاحب پر بھارتیوں نے اتنا تشدد کیا ہو گا کہ وہ ہمارے ساتھ بھاگ نہیں سکیں گے۔ چنانچہ ہم انہیں خچر پر بٹھا کر اپنے مجاہد کے ہمراہ کسی دوسرے خفیہ پہاڑی راستے سے کمیں گاہ کی طرف روانہ کر دیں گے۔ خدا کرے کہ یہ مجاہد کمانڈو اور کمانڈو شیروان مولوی صاحب کو لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

مجھے اب اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔ میرے ساتھ جو سلوک ہونے والا تھا وہ میرے سامنے تھا اور یہ سلوک میرے ساتھ کئی بار ہو چکا تھا۔ مجھے کسی فوجی انٹیروگیشن سینٹر کے کسی ٹارچر سیل میں لے جایا جا رہا تھا۔ جہاں مجھ پر ٹارچر کیا جائے گا۔ ایسی ایسی اذیتیں ایسے ایسے گھناؤنے طریقوں سے دی جانے والی تھیں کہ جن کا آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں یہ تمام اذیتیں برداشت کرنے کے لئے اپنے اپ کو تیار کر چکا تھا۔ ایک تو مجھے دشمن کا انتہا درجے کا ٹارچر برداشت کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ دوسرے میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا ظاہر ہے میں بھارتی فوجیوں کی حراست میں تھا اور میں نے اپنے ساتھی کمانڈو کے ساتھ مل کر بھارتیوں کا تقریباً سارا فوجی کیمپ تباہ کر دیا تھا اور نہ جانے ان کے کتنے فوجی جوان اور افسر ہلاک کر دیئے تھے۔ میرا ایک باقاعدہ کمانڈو ہونا

میرے لباس اور ایکشن سے ثابت ہو چکا تھا۔ اب یہ سوچنا احمقانہ بات تھی کہ یہ لوگ میری طرف سے ذرا سا بھی غافل ہوں گے اور میں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو سکوں گا۔ اگرچہ دشمن کی حراست سے فرار ہونا میرا حق تھا اور میرا فرض بھی تھا اور میں نے فرار کے طریقے بھی سوچنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن اس وقت میرا ذہن دشمن فوجیوں کے ہاتھوں پکڑے جانے اور کمانڈو شیروان کے کامیابی کے ساتھ مولوی صاحب کے ساتھ وہاں سے نکل جانے سے پریشان تھا اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں بھارتیوں کی قید سے کیسے فرار ہو سکوں گا۔

ٹرک پہاڑی راستوں پر رات کے اندھیرے میں چلا جا رہا تھا۔ بھارتی فوجی مجھے گالیاں دے رہے تھے۔ ایک دو نے غصے میں آ کر مجھے تھپڑ بھی مارے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے تم پاکستانی کمانڈو ہو کشمیریوں کی مدد کرنے آئے تھے۔ ہم تمہیں ایسا مزا چکھائیں گے کہ اپنے باپ کا نام بھی بھول جاؤ گے۔

ان میں دو سکھ فوجی بھی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاموش بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے نہ تو مجھے گالی دی اور نہ تھپڑ ہی مارے لیکن میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ سکھ فوجی میری صرف اتنی ہی مدد کر سکتے ہیں کہ مجھے مارنے پیٹنے اور گالیاں دینے میں ہندو فوجیوں کا ساتھ نہ دیں۔ ٹرک پہاڑ کی اترائی اترنے کے بعد ہموار سڑک پر آ گیا تھا۔ ٹرک کے اوپر ترپال کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ صرف دروازے پر ترپال نہیں تھی جہاں سے پہاڑوں کی رات کی سرد ہوا اندر آ رہی تھی اور اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا ٹرک ایک طرف مڑ گیا۔

یہ کوئی اور بھارتی فوجی کیمپ تھا۔ یہاں ٹرک پر سے مجھے کھینچ کر اتارا گیا۔ فوجی مجھے دھکے دیتے ٹھڈے مارتے کیمپ کے کوارٹر گارڈ میں لے گئے اور اندر دھکیل کر اس کا لوہے کی سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا۔ باقی کی رات میں نے فرش پر بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر گزاری۔ دروازے کے آگے دو مسلح بھارتی فوجی ہاتھوں میں سٹین گنیں لئے ساری رات پہرہ دیتے رہے جب دن نکلا تو چھ سات فوجی مارچ کرتے ہوئے آئے کوارٹر گارڈ

کے سامنے زمین پر زور سے پاؤں مار کر رک گئے۔ ان کے آگے آگے ایک صوبیدار میجر تھا۔ وہ کوارٹر گارڈ کی جیل کی طرف بڑھا۔ باہر جو فوجی پہرے پر کھڑا تھا۔ اس نے فوراً تالا کھول دیا۔ صوبیدار میجر نے اندر آتے ہی میری آنکھوں پر کس کر پٹی باندھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے گیا۔ آنکھوں پر پٹی بندھنے سے پہلے میں نے اس کے کاندھے پر ایک سٹار ایک پھول اور ایک پٹی کا صوبیدار میجری کا نشان دیکھ لیا تھا۔ میرے ہاتھ انہوں نے رات کو ہی کھول دیئے تھے۔ یہاں پھر رسی سے پشت پر باندھ دیئے۔ مجھے کسی گاڑی میں دھکیل کر بٹھا دیا گیا۔ دو فوجیوں نے دونوں طرف سے میرے بازو پکڑ رکھے تھے۔ جب گاڑی کا دروازہ بند ہو گیا اور باہر سے گاڑی کے دروازے کو لاک کرنے کی آواز آئی تو انہوں نے میرے بازو چھوڑ دیئے۔

یہ گاڑی بھی کوئی ٹرک لگ رہا تھا۔ اس کے انجن کی آواز ٹرک کے انجن جیسی تھی۔ پہاڑی اترائی چڑھائی کے رستوں پر یہ ٹرک دیر تک سفر کرتا رہا۔ پھر ہموار سڑک آ گئی لگتا تھا ٹرک میدانی علاقے میں آ گیا ہے۔ میدانی علاقے میں ٹرک کافی زیادہ رفتار سے دیر تک چلتا رہا۔ مجھے فضا میں گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ٹرک کشمیر کی ٹھنڈی پہاڑیوں سے نکل کر پنجاب کے میدانوں میں سفر کر رہا ہے۔ ایک بار پھر پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ مگر یہاں پہاڑوں والی ٹھنڈی ہوا نہیں تھی۔

ایک جگہ ٹرک آخر رک گیا۔

ٹرک سے نکال کر دو فوجی میرے بازو کو پکڑ کر مجھے چلاتے ہوئے ایک بند بند سی فضا میں لے آئے۔ پھر انہوں نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ ہاتھ کی رسیاں بھی کھول دیں۔ یہ ایک نیم روشن لکڑی کی چھت والا کمرہ تھا جس کا فرش خالی تھا۔ کمرہ چھوٹا سا تھا۔ میں فرش پر بیٹھ گیا۔

ایک صوبیدار میجر میرے سامنے کھڑا مجھے کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ لیٹرین ہے۔ ادھر نلکہ لگا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔ کمرے میں لیٹرین کا دروازہ ہی تھا۔ میں اس طرف گیا وہاں نلکے سے بالٹی میں پانی گر رہا تھا۔ یہاں میں نے منہ ہاتھ دھویا اور واپس آ کر فرش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا تو دو فوجی آ گئے۔ ایک برین گن لے کر دروازے پر کھڑا رہا۔ دوسرے نے دو روٹیاں جس پر دال پڑی ہوئی تھی میرے ہاتھ میں تھما دیں اور مارچ کرتا باہر نکل گیا۔ دروازہ ایک بار پھر مقفل کر دیا گیا۔ میں نے دونوں روٹیاں کھا لیں۔ کمرے کی دیواریں پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ان میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ دن کی روشنی صرف بند دروازے کی درزوں میں سے اندر آ رہی تھیں۔

میں نے ایک درز میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر مسلح فوجی پہرہ دے رہا تھا۔ سامنے کچھ فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ بھی کوئی فوجی کیمپ ہی تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ مجھے کچھ کچھ شک ہو رہا تھا کہ انہیں میرے سابقہ ریکارڈ کا علم ہو گیا ہے اور اس وجہ سے وہ مجھ سے زبردست انٹیروگیشن کرنے کے واسطے جموں یا اس سے بھی آگے پنجاب کے کسی ملٹری انٹیلی جینس ہیڈ کوارٹر میں لے جا رہے ہیں۔ اور مجھ سے وہ سب کچھ پوچھنا چاہتے ہیں جو مجھے معلوم ہے اور وہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں جو مجھے معلوم نہیں ہے۔ دوسری بات یہ بھی بڑی اہم تھی کہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ میں کشمیری کمانڈو نہیں ہوں کیونکہ میں نے ٹرک میں فوجیوں سے جو دو ایک باتیں کی تھیں اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ میں کشمیری نہیں ہوں۔ کیونکہ میں کشمیری میں بات چیت نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ مجھے پاکستانی کمانڈو ہی سمجھ رہے تھے۔ اور ایک ایسے پاکستانی کمانڈو کا بھارت کی ملٹری انٹیلی جینس کے ہاتھ آ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی جو ان کے اسلحہ سے لدے ہوئے جہازوں ایمونیشن کے ذخیروں فوجی ٹرینوں اور نہ جانے کتنے فوجی کیمپوں کو دھماکوں سے برباد کر چکا ہو۔

میرا خیال تھا یہاں سے وہ مجھے کسی دوسری جگہ لے جا کر پوچھ گچھ شروع کریں گے لیکن وہ مجھے آگے نہ لے گئے اور اس جگہ پوچھ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ وہاں

پہنچنے کے ایک دن بعد شروع ہوا۔ انہیں شاید دوسرے شہر سے دو تین خاص اور بڑے ماہر، تجربہ کار اور بوچڑ قسم کے فوجی افسروں کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ دن اور رات کوٹھڑی میں کسی نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ دن کے وقت دال روٹی دی گئی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی ویسی ہی دو روٹیاں اور دال دی گئی۔ رات کو بھی یہی کچھ کھانے کو دیا گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ اگلے دن کوٹھڑی میں چار فوجی داخل ہوئے۔ ان میں دو عام سپاہی تھے۔ اور دو فوجی افسر تھے۔ ان میں سے ایک کیپٹن اور دوسرا میجر کے رینک کا تھا۔ کیپٹن ڈوگرہ تھا اور میجر مدراسی لگتا تھا۔ پوچھ گچھ کی ابتداء بظاہر بڑے پیار محبت سے ہوئی۔ ڈوگرہ کیپٹن کا اردو بولنے کا لہجہ جیسے کانگڑے کا تھا جب کہ میجر کا لہجہ مدراسیوں والا تھا۔ جس طرح وہ اردو بول رہے تھے وہ نہیں لکھوں گا۔ بلکہ جو کچھ انہوں نے پوچھا انہیں عام اردو زبان میں لکھتا جاؤں گا۔ سپاہی اپنے ساتھ ایک ایک کرسی بھی لائے تھے جو انہوں نے میرے سامنے ڈال دیں اور پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس برین گنیں لے کر اٹینشن کھڑے ہو گئے۔ کیپٹن اور میجر میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مدراسی میجر زیادہ تجربہ کار اور ہوشیار تھا۔ بیٹھتے ہی اس نے میری طرف دیکھا اور پیچھے کھڑے سپاہیوں سے پوچھا۔

"تم نے ہمارے پاکستانی جوان کو کھانے کو کیا دیا تھا؟"

ایک سپاہی نے فوراً جواب دیا۔

"سر لنگر سے دال روٹی لا کر دیا تھا۔"

اسے ڈانٹ کر کہا۔

"جنگلی! یہ تمہاری طرح کا دال کھانے والا فوجی جوان نہیں ہے۔ یہ پاکستان کا فوجی جوان ہے۔ اسے حلال گوشت کیوں نہیں لا کر دیا؟"

سپاہی نے فوراً کہا۔

"یس سر! اب حلال گوشت کا راشن لا کر دے گا سر!"

اس کے بعد مدراسی میجر نے بڑی معذرت کے انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جوان ان سے غلطی ہو گئی۔ آج سے تمہیں حلال گوشت ملے گا۔"

میں نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں پاکستانی فوج کا جوان نہیں ہوں۔ میں کشمیری مجاہد ہوں۔ ری بات یہ ہے کہ آپ مجھ پر پاکستانی کمانڈو ہونے کا الزام لگانے کی ناکام کوشش نہ ریں۔"

ڈوگرہ کیپٹن نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"جوان! اگر تم کشمیری مجاہد ہو تو تم کشمیری زبان میں بات کیوں نہیں کر سکتے؟ تمہیں ثمیری زبان بولنا ہی نہیں آتی پھر تم کشمیری مجاہد کیسے ہو سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں مشرقی پنجاب کا مسلمان پنجابی ہوں اور کشمیر کے جہاد میں صرف اسلامی جذبے تحت شریک ہوا تھا۔ میرا پاکستان سے یا پاکستانی فوج سے کوئی تعلق نہیں۔"

مدراسی میجر نے جیب سے چمڑے کا بٹوہ نکالا۔ اسے ایک طرف سے کھولا۔ اس میں بھرے ہوئے تھے ایک سگار میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے انگریزی میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم سگار شوق سے پیتے ہو۔ یہ لو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم رزی زبان بڑی روانی سے بول لیتے ہو اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ تم ہندی اور سنسکرت جانتے ہو اور گجرات کاٹھیاواڑ کی گجراتی زبان اچھی طرح سمجھ اور بول لیتے ہو۔"

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ ان لوگوں کو میرے تمام سابقہ ریکارڈ کا علم ہو چکا تھا۔ نے انگریزی میں جواب دینے کی بجائے اپنی اردو زبان میں ہی کہا۔

"مجھے نہ سنسکرت آتی ہے نہ میں گجراتی زبان جانتا ہوں اور نہ مجھے سگار پینے کا شوق بہتر ہو گا کہ آپ الٹے سیدھے ہتھکنڈے آزمانے کی بجائے مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہے ی طرح پوچھیں۔ اگر مجھے معلوم ہوا تو بتا دوں گا۔"

میجر اور کیپٹن نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں مسکرا کر دیکھا۔ مدراسی نے سگار والا بٹوہ بند کر دیا۔ خود بھی سگار نہ سلگایا۔ کہنے لگا۔

"دوست! تم تو خوامخواہ ناراض ہو گئے ہو۔ لگتا ہے اس وقت تمہارا موڈ ٹھیک نہیں

ہے۔ اچھا پھر ملیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ لوگ کوٹھڑی سے چلے گئے۔ دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا اور باہر دو فوجی دروازے کے آگے ٹہل کر پہرہ دینے لگے۔ لکڑی کی چھت والے اسی چھوٹے سے کوٹھڑی نما کمرے میں کوئی کھڑکی، کوئی روشندان نہیں تھا۔ میں صرف دروازے کی ایک آدھ درز میں سے باہر کی تھوڑی سی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ چونکہ یہ میدانوں سے ذرا اوپر کی جانب پہاڑی علاقہ تھا اس لئے وہاں میدانی علاقوں والی گرمی اور حبس نہیں تھا۔ کشمیر کی پہاڑیوں والی سردی بھی نہیں تھی۔ دو دن گزر گئے۔ کوئی مجھ سے پوچھ گچھ کرنے نہ آیا۔ اس دوران مجھے تین وقت آلو گوشت کا سالن اور تازہ روٹیاں ملتی رہیں۔ تین وقت لنگر کی چائے بھی مل جاتی۔ تیسری رات کو ایک ساڑھی والی نوجوان عورت اندر آ کر میرے پاس بوریئے پر بیٹھ گئی۔ اب رات کو میرے کمرے میں لیمپ روشن کر دیا جاتا تھا۔ اس عورت کے ماتھے پر تلک لگا تھا۔ یہ ہندو عورت تھی رنگ کھلتا ہوا تھا۔ جسم بڑا پرکشش تھا۔ نقش خوبصورت تھے۔ آنکھیں بھی سحر انگیز تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عورت ان لوگوں نے ہی مجھے سیدھی راہ سے بھٹکانے اور اپنی راہ پر لانے کے لئے بھیجی ہے۔

عورت نے آتے ہی بڑی صاف اردو میں کہا۔

”میں جانتی ہوں تم یہی سمجھ رہے ہو گے کہ مجھے یہاں کے کیپٹن اور میجر صاحب بھیجا ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔ مجھے کیپٹن اور میجر صاحب نے ہی تمہارا پاس بھیجا ہے۔ تمہارا دل بہلانے کے لئے نہیں بلکہ تمہیں صرف یہ سمجھانے کے لئے ان لوگوں کے آگے ہٹ دھرمی سے کام نہ لینا۔ یہ دونوں جلاد ہیں یہ تم سے دو تین با پوچھنا چاہتے ہیں ان باتوں کے بتانے سے تمہارے عزت اور عہدے میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ لیکن اتنا ضرور ہو گا کہ تم انتہائی ہولناک اذیت اٹھانے سے بچ جاؤ گے۔“

میں اس ہندو عورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”شریمتی جی! تم اپنی جگہ پر ہو سکتا ہے ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں لوگ مجھ سے ایسی باتیں پوچھنا چاہتے ہیں جن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس

نے اگر ہٹ دھرمی سے کام نہ بھی لیا تو یہ لوگ میرا اعتبار نہیں کریں گے۔“

عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہاری صاف گوئی سے خوشی ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا نام سوشیلا ہے۔ تم مجھے شریمتی کی بجائے سوشیلا کہہ کر مخاطب کرو گے تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔“

اس نے بڑی بے باکی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دباتے ہوئے بولی۔

”ان لوگوں نے مجھے تمہارے پاس تمہیں خوش کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کیونکہ مجھے اس حقیقت کا علم ہے کہ پاکستانی فوج کے کمانڈو بڑے اعلیٰ کردار کے انسان ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کردار پر ذرا سا بھی داغ نہیں آنے دیتے۔ وہ بڑے پاک باز اور بہادر ہوتے ہیں۔ لیکن میرے دوست یہ بات میں تمہیں اپنے طور پر بتانا چاہتی ہوں کہ یہ لوگ تمہیں ایک دم نہیں ماریں گے۔ تمہیں خود بھی نہیں ماریں گے۔ بلکہ تمہارے جسم اور تمہاری روح کو اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں گے کہ تم خود موت کی خواہش کرنے لگو گے۔ یہ پھر بھی تمہیں نہیں ماریں گے میں نے اس کیپٹن اور اس مدراسی میجر جیسا سنگ دل اور انسان کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے والا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“

میں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

”سوشیلا صاحبہ بہتر یہ ہے کہ تم بھی اپنا یہ بھاشن بند کر کے واپس میجر اور کیپٹن کے پاس چلی جاؤ۔ تم ناحق میرا سر کھا رہی ہو۔“

سوشیلا اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہاری بھلائی کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ تم ایک بار پھر میری باتوں پر غور کرنا۔ میں کل آؤں گی۔“

وہ چلی گئی تو میں آنکھیں بند کر کے لکڑی کے فرش پر جو بوریا ان لوگوں نے لا کر بچھا دیا ہوا تھا اس پر لیٹ گیا۔ دوپہر کو مجھے بھنا ہوا گوشت اور اس کے ساتھ تین تندوری

روٹیاں دی گئیں۔ ساتھ کھیر بھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ قربانی کا بکرا پال رہے ہیں۔ جو کچھ کھلا رہے ہیں سب ایک ایک کر کے نکال لیں گے۔ میں چونکہ ہر قسم کے تشدد اور ٹارچر کے ہر غیر انسانی حربے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا اس لئے مزے سے سب کچھ کھاتا پیتا رہا۔ دوسرے دن بھی میری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ کوئی مجھ سے کچھ پوچھنے نہیں آتا تھا۔ ایک فوجی سپاہی کھانا اور چائے لے کر آتا اور چلا جاتا۔ دوسری رات کو سوشیلا پھر آ گئی۔

اس رات اس نے بڑے بھڑکیلی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس میں سے اس کا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ پیٹ تو بھارت میں ہر ساڑھی پہننے والی عورت کا نظر آتا تھا مگر سوشیلا کا کچھ زیادہ ہی نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لئے پوری تیاری کر کے آئی ہے۔ آتے ہی میرے پاس بیٹھ گئی کہنے لگی۔

"میجر صاحب اور کیپٹن صاحب تمہاری بڑی عزت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم بڑے بہادر اور کریکٹر والے پاکستانی کمانڈو ہو۔"

میں نے وہیں اس کی بات کاٹ دی۔

"اپنا جملہ درست کر لو۔ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔"

وہ ہنس کر بولی۔

"تم جو کچھ بھی ہو واقعی مجھے بھی بڑے اچھے لگتے ہو۔"

وہ میرے قریب ہو گئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر محبت سے سہلانے لگی۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"تم نے جو بات کرنی ہے وہ کرو اور یہاں سے واپس چلی جاؤ۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

سوشیلا نے میری بات کو جیسے بالکل نہیں سنا تھا۔ کہنے لگی۔

"ان لوگوں نے تمہارا جو حال کرنا ہے اس کو سوچ کر ہی میری آتما کانپنے لگتی ہے۔ میں تمہیں بھگوان کا واسطہ دیتی ہوں کہ انہیں جو یہ پوچھنا چاہتے ہیں بتا دو پھر یہ تمہیں

یں کہیں گے۔ کم از کم میری خاطر اپنے آپ کو موت کے حوالے نہ کرو۔"

میں ہنس پڑا۔

"کمال ہے تم میری کیا لگتی ہو جو میں تمہاری خاطر ایسا کروں؟ اور پھر میں انہیں وہ کچھ کیسے بتا سکتا ہوں جو مجھے معلوم ہی نہیں ہے۔ وہ تو مجھے پاکستانی کمانڈو سمجھ رہے ہیں ر مجھ سے پوچھیں گے کہ میرے ساتھی پاکستانی کمانڈو انڈیا میں اور خاص طور پر جموں شمیر میں کہاں کہاں پر ہیں۔ میں نہ پاکستانی کمانڈو ہوں۔ نہ میرا کوئی ساتھی یہاں پر ہے۔ ر میں ان کے سوالوں کے ان کی مرضی کے موافق جواب کیسے دے سکتا ہوں؟"

یہاں سوشیلا نے وہ بات ظاہر کر دی جس کے بارے میں مجھے پہلے ہی شک پڑ چکا تھا۔ نے لگی۔

"یہاں کی ملٹری انٹیلی جنس کے پاس تمہارا سارا پرانا ریکارڈ پہنچ چکا ہے۔ کیپٹن بترہ ر میجر راما راؤ کو تمہارے بارے میں ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ تمہاری ساری فائل ان کے پاس موجود ہے۔ تم نے گجرات' دلی' ترچنا پلی اور ناگ پور میں انڈین ملٹری کو جو دست نقصان پہنچایا ہے اور ان کے جتنے فوجیوں کو مارا ہے اس کا ایک ایک ریکارڈ ان پاس ہے۔ تم کس بات سے کیسے انکار کرو گے؟ جب کہ دلی کے اخباروں میں چھپنے والی ری تصویر کے تراشے بھی فائل میں لگے ہوئے ہیں۔"

یں خاموشی سے اس ہندو عورت سوشیلا کی باتیں سن رہا تھا جو بالکل صحیح تھیں۔ و کیپٹن بترہ اور مدراسی میجر راما راؤ نے اس عورت کو اسی لئے میرے پاس سارا رڈ بریف کر کے بھیجا تھا کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا کوئی کمانڈو ایکشن ان لوگوں چھپا ہوا نہیں ہے۔ اور ان کے پاس میرا فل ریکارڈ موجود ہے جو ایک مصدقہ دستاویز ان کا خیال تھا کہ شاید اس عورت کے ذریعے میں ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر ہو جاؤں۔ مگر یہ بات میرے اصول کے خلاف تھی۔ ٹھیک ہے اگر انہیں معلوم ہو کہ میں کمانڈو ہوں اور میں نے بڑی تباہی مچائی تھی تو میں اس سے انکار نہیں کروں اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ میں پاکستانی کمانڈو ہوں جب کہ یہ ایک

حقیقت بھی تھی۔ میں نے سوشیلا سے کہا۔

"مجھے اب جو کچھ کہنا ہے وہ میں کیپٹن بترہ ' میجر راما راؤ کے سامنے ہی کہوں گا۔ تمہارا اب بار بار میرے پاس آنا بیکار ہے جاؤ۔"

سوشیلا نے دوچار بار مجھے سمجھانے کی کوشش کی اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مدراسی میجر راما راؤ اور ڈوگرہ کیپٹن بترہ آ گئے۔ ان کے ساتھ دو فوجی تھے جنہوں نے لوہے کی دو کرسیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ کرسیاں میرے سامنے رکھ دی گئیں۔ میجر اور کیپٹن ان پر بیٹھ گئے۔ فوجی دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ڈوگرہ کیپٹن نے بڑے دوستانہ انداز میں مجھے بتایا کہ میرے بارے میں ان کے پاس فل ریکارڈ موجود ہے اور یہ کہ میں اپنے پاکستانی کمانڈو ہونے کا انکار نہیں کر سکتا۔

"اس لئے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ جو ہم تم سے پوچھیں تم ہمیں بتادو۔ صرف تم سے دوتین سوال ہی پوچھیں گے۔ تمہیں زیادہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

ہاں مدراسی میجر نے میری طرف جھک کر کہا۔

"ہمیں صرف یہ بتادو کہ تمہارے دوسرے پاکستانی کمانڈو یہاں کہاں پر چھپے ہو ہیں اور تمہارا اگلا کمانڈو آپریشن کیا تھا؟" بس صرف یہی دو آسان سے سوال ہیں ہمیں کے جواب دے دو اور اس کے بعد تم آزاد ہو۔ بے شک واپس اپنے ساتھیوں کے پا چلے جاؤ۔ اگر پاکستان جانا چاہتے ہو تو ہم تمہیں خود بارڈر کراس کرا دیں گے۔"

یہ سوال مجھ سے دلی ترچنا پلی اور گوالیار کے ٹارچر سنٹروں میں کئی بار پوچھے گئے اور میں نے ان کا ایک ہی جواب دیا تھا کہ میں پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔ کشمیری ضرور ہوں اور دشمن کے ساتھ جنگ کرنا میرا۔ مذہبی اور انسانی حق ہے۔ جب میں یہاں بھی یہی جواب دیئے تو کیپٹن بترہ اور میجر راما راؤ کا پارہ آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔ راما راؤ بولا۔

"چلو ہمیں یہی بتادو کہ کشمیری مجاہدوں کے کمانڈو شیروان کا خفیہ اڈہ کہاں پر

ے بعد ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ کمانڈو شیروان کی خفیہ کمیں گاہ کہاں ہے۔ لیکن میں تم لوگوں کو کبھی نہیں بتاؤں گا۔"

اس پر مدراسی میجر کا چہرہ غصے سے اور کالا ہو گیا۔ انگریزی میں مجھے گالی دی اور میرے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ ایک بار تو میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔ میں مدراسی کی گردن ایک سیکنڈ میں توڑ سکتا تھا لیکن وہ مقام ایسا نہیں تھا۔ اس کی گردن توڑنے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس کے مرنے کے بعد کوئی دوسرا راما راؤ آ جاتا۔ میں یہ بے عزتی برداشت کر گیا اب دونوں نے مجھے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔ میں نے اپنے آپ کو سمیٹ لیا اور ان کی مار کھاتا رہا۔ جب وہ تھک گئے اور ہانپنے لگے تو چلے گئے۔ دوسرے روز مجھے اس پہاڑی فوجی کیمپ کے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں اذیت دینے اور غیر انسانی ٹارچر کے ہر قسم کے آلات پڑے تھے۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیسا کیسا وحشیانہ سلوک کیا؟ یہ میں آپ کو بیان نہیں کر سکتا۔ ایک گھنٹے کے ٹارچر کے بعد میں تکلیف برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

مجھے ٹارچر کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

بھارتی ملٹری انٹیلی جینس کے اس فوجی کیمپ میں چار ٹارچر سیل تھے۔ ہر ٹارچر سیل میں تشدد کے الگ الگ آلات رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ٹارچر سیل میں بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے تھے اور انسانی جسم کے نازک حصوں پر بجلی لگائی جاتی تھی۔ ایک ٹارچر سیل میں چھت کے ساتھ الٹا لٹکا کر نیچے آگ جلا کر دھونی دی جاتی تھی۔ ایک ٹارچر سیل میں مجھے لکڑی کے شکنجے میں جکڑ کر میری ٹانگوں اور بازوؤں کو اس طرح سے کھینچا گیا کہ مجھے لگا میری ٹانگوں اور بازوؤں کے جوڑ الگ ہو رہے ہیں۔ ہر ٹارچر سے پہلے اور ہر ٹارچر کے بعد مجھ سے کہا جاتا کہ اب بھی اگر میں انہیں اپنے ساتھی پاکستانی کمانڈو کے بارے میں اور کمانڈو شیروان کی خفیہ کمیں گاہ کے بارے میں بتادوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا۔ مگر میرا

ہر بار یہی جواب ہوتا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وحشیانہ اور طرح طرح کے تشدد کی وجہ سے میرا ذہن بھی ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

کسی وقت مجھے لگتا کہ میں ایک صحرا میں ہوں۔ میرے دونوں ہاتھ فوجی جیپ کے پیچھے بندھے ہیں اور جیپ مجھے کھینچتی ہوئی صحرا میں بھاگی جا رہی ہے۔ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں گردن تک دلدل میں دھنسا ہوا ہوں اور دلدل کے اندر کیڑے میرے جسم کو کاٹ رہے ہیں یہ سب کچھ میں بے ہوشی کی حالت میں نہیں بلکہ ہوش کی حالت میں محسوس کر رہا تھا۔ جب درد اور اذیت کی شدت ناقابل برداشت ہو جاتی تو میں واقعی بے ہوش ہو جاتا۔ اس بھیانک ٹارچر کے دوران مجھے صرف ایک بات کی خوشی تھی کہ میں ہر قسم کا تشدد برداشت کر رہا ہوں مگر میں نے اپنی زبان بالکل نہیں کھولی اور دشمن کو کچھ نہیں بتایا۔ اس بات پر ہندو فوجی افسر اور زیادہ غضب ناک ہو کر مجھ پر وحشیانہ تشدد کا عمل دوبارہ شروع کر دیتے یہ سلسلہ پندرہ دن تک چلتا رہا۔

میرا وزن بھی کم ہو گیا تھا اور جسم پر چاقو' چھریوں اور سگریٹ کے داغوں کے جابجا زخم ابھرے ہوئے تھے۔ اس دوران ہندو عورت سوشیلا ایک بار بھی نہ آئی۔ جب مجھ پر ٹارچر کرتے ہوئے بیس پچیس دن گزر گئے اور وہ لوگ میری زبان نہ کھلوا سکے تو میجر راما راؤ نے مجھے پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔ میری پھانسی کی اطلاع دینے شریمتی سوشیلا آئی۔ رات کا وقت تھا۔ میں ٹارچر سیل میں زمین پر پڑا تھا۔ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو درد نہ کر رہا ہو۔ لیکن میں درد کو برداشت کر رہا تھا۔ اس بار جو مجھ پر تشدد کیا گیا وہ پہلے تمام ٹارچروں سے نمبر لے گیا تھا۔ یہ ایسا تشدد تھا کہ ایک بار تو اس نے میری روح کو بھی ہلا دیا تھا۔ لیکن میرا مقصد عظیم تھا۔ مجھے اپنے خدا کی رحمت پر بھروسہ تھا۔ جب اللہ کسی نیک اور عظیم مقصد کے لئے تکلیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور اسے اپنے خدا یقین بھی ہو تو پھر تکلیف آدھی رہ جاتی ہے۔

دروازہ کھلا اور سوشیلا ایک مسلح سپاہی کے ساتھ کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھ سے تمہاری حالت دیکھی نہیں جاتی۔ تم ناحق تکلیف اٹھا رہے ہو۔ اگر تم ان لوگوں کو اپنے دو چار ساتھیوں کے ٹھکانے بتا دو تو اس عذاب سے بچ جاؤ گے۔ ابھی وقت ہے۔"

میں نے اسے کہا کہ اگر میرے جسم کے ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں تو میں یہ غداری بھی نہیں کروں گا۔ سوشیلا مجھے سیدھی راہ سے بھٹکانے کی کوشش کرتی رہی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میرا عزم چٹان سے بھی زیادہ مضبوط ہے تو کہنے لگی۔

"تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کل سورج نکلنے کے ساتھ ہی تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ ان لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا اب بھی تم اپنی ضد پر اڑے رہو گے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے موت کا کوئی خوف نہیں ہے میں پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لوں گا مگر اپنے مجاہد ساتھیوں کا پتہ نہیں بتاؤں گا۔"

سوشیلا نے کہا۔

"اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ کیپٹن بترہ اور میجر راما راؤ کس اذیت ناک طریقے سے تمہیں پھانسی پر چڑھائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو گے۔ سنو یہاں پیچھے دو ٹیلوں کے درمیان پہاڑی نالہ بہتا ہے ان ٹیلوں کے درمیان فوج نے اپنی سہولت کے واسطے لکڑی کا ایک چھوٹا سا پل بنا رکھا ہے۔ جلاد تمہیں پل کے درمیان کھڑا کر دے گا پھر تمہاری گردن میں رسی ڈال دی جائے گی۔ تمہارے منہ پر کالا نقاب نہیں ڈالا جائے گا۔ تمہارے پاؤں کے ساتھ بھی وزن نہیں باندھا جائے گا۔ کیونکہ وزن باندھنے سے تمہاری موت جلد واقع ہو جائے گی۔ اور کیپٹن بترہ اور مدراسی میجر راما راؤ تمہارے مرنے کا منظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب جلاد تمہیں پل پر سے نیچے دھکا دے گا تو رسی کا پھندا تمہارے گرنے سے تمہاری گردن میں کس جائے گا اور تم پل اور بہتے ہوئے نالے کے درمیان لٹک جاؤ گے اور تڑپنے لگو گے۔ تمہاری زبان باہر نکل آئے گی تمہاری آنکھیں نکل آئیں گی۔ تمہارے پاؤں کے ساتھ چونکہ وزن نہیں بندھا ہوا ہو گا اس لئے

تمہیں اتنا زیادہ جھٹکا نہیں لگے گا کہ تمہاری گردن کے مہرے ایک دم الگ ہو کر تمہیں موت کی نیند سلادیں۔ تمہیں صرف اپنے وزن کا ہی جھٹکا لگے گا اور تمہاری ایک دم موت واقع نہیں ہوگی۔ تم رسی کے ساتھ پل کے نیچے جھولتے رہو گے۔ تڑپتے رہو گے اور کیپٹن بترہ اور میجر راما راؤ پل کی ایک طرف کرسیوں پر بیٹھے بیئر پیتے ہوئے تمہیں تڑپتا دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔ کیا تمہیں ایسی اذیت ناک موت گوارا ہے۔؟"

میں نے اپنے بدن سے اٹھتی درد کی لہروں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی راہ میں میں ایک ہزار بار ایسی موت کو گلے لگانے کو تیار ہوں۔ یہ بات تم اپنے کافر کیپٹن اور میجر کو بھی جا کر بتادو۔"

سوشیلا خاموشی سے اٹھی اور چل دی۔

میرا خیال تھا کہ یہ ان لوگوں کی گیدڑ بھبکی ہے۔

اور یہ مجھ سے کشمیری مجاہدوں کے خفیہ ٹھکانوں کے راز معلوم کرنے کی ایک آخری وشش ہے لیکن دن نکلتے ہی جب دو فوجی کوٹھڑی میں آکر مجھے باہر لے گئے تو مجھے شک اکہ کہیں واقعی ان لوگوں نے مجھے پھانسی چڑھانے کا پروگرام تو نہیں بنایا ہوا۔ اس کے جود مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی مجھے دو ایک بار جان سے مار دینے ا دھمکی دی گئی تھی۔

ان فوجیوں نے میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے تھے اور مجھے دونوں طرف سے بازوؤں ے پکڑ کر ساتھ چلاتے ہوئے فوجی کیمپ کے عقب میں لے گئے۔ یہاں پہلے سے ایک لح فوجی گارڈ میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ ان دو سپاہیوں نے مجھے اس فوجی گارڈ کے الے کر دیا۔ فوجی گارڈ کے سپاہی میرے دائیں بائیں ہو گئے تھے۔ میں ان کے گھیرے ں تھا۔ اس وقت دن ابھی نکلا ہی تھا۔ میں نے پہلی بار اس فوجی کیمپ کے بیرونی ماحول کو کھا۔ اس کیمپ میں تین چار بارکیں تھیں۔ فوجی جیپیں اور گاڑیاں جگہ جگہ کھڑی یں۔ کیمپ کے عقب میں جس طرف یہ مسلح گارڈ مجھے لے جا رہی تھی اونچی پتھریلی ار تھی۔ اس میں ایک دروازہ لگا تھا۔ دروازے پر بھی مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ازے سے باہر نکلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ اردگرد بھورے رنگ کی خشک اونچی نیچی ڑیاں تھیں۔ یہ مجھے جموں کا علاقہ لگ رہا تھا۔ ان پہاڑیوں پر کشمیر کی پہاڑیوں والے ہ اور چنار کے درخت نہیں تھے۔ کچھ پہاڑیاں بالکل خشک اور بنجر تھیں۔ کچھ پہاڑیوں

کی ڈھلانوں پر جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ بھارت کی کسی رجمنٹ کی یونٹ کے یہ فوجی مجھے تیز تیز چلاتے بلکہ دھکیلتے ہوئے تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر ایک ٹیلے کے اوپر لے آئے۔

میں نے دیکھا کہ ٹیلے پر ڈوگرہ کیپٹن بترہ اور مدراسی میجر راما راؤ ٹیلے پر بنے ہوئے سیمنٹ کے چھوٹے سے چبوترے پر میز کرسی لگائے بیٹھے ہیں۔ میز پر بیئر کی دو بوتلیں رکھی ہوئی ہیں اور دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک گلاس ہے۔ دونوں بیئر پی رہے ہیں۔ مدراسی میجر کے منہ میں سگار دبا ہوا ہے۔ مجھے ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ رات کو سوشیلا نے جو منظر بیان کیا تھا وہ مجھے سامنے نظر آ رہا تھا۔ اس ٹیلے کی دوسری طرف اسی طرح کا ایک اور ٹیلا تھا۔ دونوں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان لکڑی کا ایک پل تھا۔ نیچے ضرور پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا مجھے پانی کے زور شور سے بہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پل کے پاس بھی دو مسلح فوجی رائفلیں لئے کھڑے تھے۔ مدراسی میجر راما راؤ نے منہ سے سگار نکالا اور میری طرف اپنی پیلی پیلی بے رحم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ابھی تمہارے پاس زندگی کا آخری ٹائم ہے۔ اگر اب بھی تم ہمیں اپنے ساتھی کمانڈوز اور کمانڈر شیروان کے خفیہ ٹھکانے کا پتہ بتا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دے گا۔"

اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈوگرہ کیپٹن نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ ان لوگوں کے لئے مر رہے ہو۔ جن کا پتہ ہمیں آج نہیں تو کل لگ جائے گا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ابھی چند منٹوں کے بعد تمہاری لاش لکڑی کے پل کے لٹکی تڑپ رہی ہوگی۔ اب بھی وقت ہے ہمیں اور کسی کمانڈو کا نہ سہی صرف کما شیروان کے خفیہ ٹھکانے کا بتا دو۔ ہم تمہیں ابھی چھوڑ دیں گے۔ تمہیں اپنے ساتھ کر پر بٹھا کر بیئر پلائیں گے۔ بڑا اچھا ناشتہ کرائیں گے اور تم جہاں جانا چاہو گے ہمارا آ تمہیں وہاں چھوڑ آئے گا۔"

یہ لوگ سچ مچ مجھے اپنی طرف سے مارنے والے تھے۔ کیونکہ میرا یہ ایمان تھا

گی اور موت اللہ کی طرف سے ہے اور صرف اسی کے حکم سے موت آتی ہے اور ت کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا فرق نہیں پڑ سکتا۔ میں نے ڈوگرہ میجر سے کہا۔

"میری زندگی اور موت میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرا وقت آگیا ہے تو پھر کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر موت کا وقت نہیں آیا تو پھر تمہاری ساری فوج بھی مجھ پر کھول دے تو میں نہیں مر سکتا۔"

ڈوگرہ کیپٹن نے مدراسی میجر کی طرف دیکھا۔ مدراسی میجر نے بائیں جانب کھڑے دو ہوں کو اشارہ کیا۔ یہ دونوں فوجی پہلے سے جیسے تیار تھے۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے اور پل کی طرف لے گئے پل کے سرے پر جو دو فوجی کھڑے تھے ان میں سے ایک کا رنگ ذرا کھلتا ہوا تھا اور وہ ڈوگرہ نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے اس فوجی کے حوالے تے ہوئے پہلے فوجی نے اونچی آواز میں کہا۔

"نائیک گنگا داس! میجر صاحب کا آرڈر ہے اس کو لٹکا دو۔"

کھلتی رنگت والے نائیک گنگا داس نے زور سے زمین پر پاؤں مار کر اونچی آواز میں

"یس سر! صوبیدار صاحب"

نائیک گنگا داس نے میرے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کی رسیاں کھول دیں۔ اس نا چار مسلح فوجی سپاہی مجھے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ میں نے نائیک گنگا داس سے

"اگر تم لوگ مجھے پھانسی پر چڑھانے لگے ہو تو میرے ہاتھ کیوں کھول رہے ہو؟"

نگا داس نائیک نے اونچی آواز میں کہا۔

"اس لئے کہ جب تم پل کے نیچے لٹکو تو تم خوب تڑپو۔ کمینے کشمیری کمانڈو! تم لوگوں میں بہت پریشان کیا ہے چلو۔"

مجھے سوشیلا کی بات یاد آگئی اس نے کہا تھا کہ نہ میرے بازو باندھے جائیں گے نہ

میرے پاؤں کے ساتھ ریت کی بوریاں باندھی جائیں گی۔ تاکہ میں ایک ہی جھٹکے میں گردن ٹوٹنے سے مر نہ جاؤں۔ جب گلے میں پھندا کس جائے گا اور میں نیچے لٹکا ہوا ہاتھوں سے گردن کا پھندا پکڑوں گا اور میری ٹانگیں تڑپیں گی تو کیپٹن اور میجر میری اس حالت کو دیکھ کر خوب مزہ لیں گے اور بیئر پیتے ہوئے میری موت کے طول ہوتے منظر سے خوب لطف اندوز ہوں گے۔ نائیک گنگا داس نے وہیں میری گردن میں رسے کا پھندا ڈال دیا۔ پھندے میں موٹی سی گرہ لگی ہوئی تھی۔ مگر ابھی پھندا میری گردن میں پوری طرح سے کسا نہیں گیا تھا۔ نائیک گنگا داس مجھے پکڑ کر لکڑی کے پل پر چل پڑا۔

ہمارے پیچھے پیچھے دو فوجی ہاتھوں میں رائفلیں لئے چل رہے تھے۔ اس وقت مجھے یوں لگا کہ بس واقعی میری موت کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن کمانڈوز اتنی آسانی سے نہیں مرا کرتے۔ اگر وہ مرتے بھی ہیں تو اپنے ساتھ دشمن کے چھ سات آدمیوں کو لے کر مرتے ہیں۔ مگر وہاں میرے فرار ہونے اور دشمن کے چھ سات آدمیوں کو ہلاک کرنے کے بظاہر کوئی حالات نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نہتا تھا میری گردن میں رسی پڑی تھی۔ دو مسلح بھارتی سپاہی میرے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جس نائیک گنگا داس نے مجھے رسی سے پکڑ رکھا تھا اس کے کاندھے پر بھی سٹین گن لٹک رہی تھی۔ میں نے نیچے دیکھا۔ نیچے پہاڑی نالے کا پانی بڑے زور شور سے آگے کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس کا ہلکا ہلکا شور سنائی دے رہا تھا۔ سورج مشرق کی پہاڑیوں کے اوپر آ گیا ہوا تھا اور چاروں طرف دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں پل پر سے چھلانگ لگانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری گردن میں رسی تھی اور رسی کا سرا نائیک گنگا داس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھ کر کہا۔

"یا میرے اللہ پاک! اگر تیری یہی رضا ہے تو میں حاضر ہوں۔ میرے گناہ بخش دینا۔"

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے میرے مرحوم والد صاحب کی شکل آ گئی میں ان کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے جہاد کشمیر میں شریک ہونے مقبوضہ کشمیر کی خون اور آگ اگلتی وادی میں آیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے والد صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میاں جی! میں نے آپ کی وصیت پر جتنا ہو سکا عمل کیا۔ مگر میں کشمیر کو بھارتی قبضے ے آزاد نہیں کرا سکا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ میرے حق میں ریں کہ اللہ پاک مجھے بخش دے۔"

لکڑی کا چھوٹا سا پل ہمارے چلنے سے ہل رہا تھا۔ یہ مختصر سا پل تھا اور دوسرے ٹیلے جھاڑیاں وہاں سے صاف نظر آ رہی تھیں۔ مجھے پل کے عین درمیان میں لا کر کھڑا کر دیا ۔ پل کے پہلوؤں کی جانب رسے بندھے ہوئے تھے۔ نائیک گنگا داس نے جلدی سے موٹی اور مضبوط رسی کو پل کے رسے کے ساتھ کس کر باندھ دیا جس کے دوسرے ے کا پھندا میری گردن میں پڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے کا ایک آخری موقع ہاتھ سے گنوا دیا تھا۔ میں نائیک گنگا داس کو ایک طرف گرا کر اس ہاتھ سے رسی کا سرا چھڑا کر پل کے اوپر سے نیچے نالے میں چھلانگ لگا سکتا تھا۔ مگر یں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اب رسی کا ایک سرا میری گردن میں پھندا بن کر پڑا تھا اور ا سرا پل کے رسے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اب اگر میں چھلانگ لگاتا ہوں تو میری ن کو زبردست جھٹکا لگتا اور ایسے بھی میری موت یقینی تھی۔ پھندا گردن میں کسا ہوا تھا مگر اتنا کھلا بھی نہیں تھا کہ میں اس میں سے اپنا سر باہر نکال سکتا۔ پھر پھندے میں موٹی گرہ پڑی ہوئی تھی۔

یں نے دیکھا کہ میری بائیں جانب پل کے شروع والے سرے کے قریب چبوترے یوں پر بیٹھے بیئر پیتے ہوئے بڑی اشتیاق بھری نظروں سے آگے کو جھک کر میری کا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھے۔ مجھے ان کے چہرے یں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ لکڑی کا پل بھی مختصر سا تھا۔ جس وقت نائیک اس نے مجھے پل پر ایک جگہ بالکل کنارے پر لا کر کھڑا کیا تو دونوں ڈوگرہ سپاہیوں نے ائفلوں کے سیفٹی کیچ آگے کو کھینچ کر اس کی نالیاں میری طرف کر کے اس طرح نالے لی جیسے مجھ پر فائر کرنے لگے ہوں۔ نائیک گنگا داس نے مجھ سے ہنس کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ یہ تمہیں گولی نہیں ماریں گے۔ ہم تو تمہیں پل کے ساتھ لٹکا کر پھانسی

دینے والے ہیں تاکہ تم تڑپ تڑپ کر مرو ایک دم سے نہ مرجاؤ۔ یہ اس لئے فال ان ہو گئے ہیں کہ تم کہیں بھاگ نہ جاؤ۔"

مجھے جہاں کھڑا کیا گیا تھا اس کے نیچے پہاڑی نالے کا پانی شور مچاتا بہہ رہا تھا۔ یہ نالہ سیلابی لگتا تھا پانی اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا کہ اس کی موجوں پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ چبوترے کی طرف سے میجر راما راؤ کی کرخت آواز آئی۔

"نائیک گنگا داس! اس کو لٹکاتے کیوں نہیں جانگلی؟"

نائیک گنگا داس نے فوراً بلند آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے سر!"

نائیک گنگا داس نے فوراً میری گردن کا پھندا جو ابھی تک ڈھیلا تھا کس دیا اور دائیں بائیں رائفلیں لئے پوزیشن میں کھڑے فوجیوں سے کہا۔

"رائفلوں کا منہ اوپر کرلو اب تمہیں پوزیشن لینے کی ضرورت نہیں میں اسے نیچے گرانے لگا ہوں۔"

دونوں فوجیوں نے رائفلوں کی نالیاں اوپر کرلیں اور پل پر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ نائیک گنگا داس نے میری گردن میں پڑی ہوئی رسی کے پھندے کی گرہ کو جو بالکل میرے حلق کے نیچے تھی پیچھے ہٹا دیا اور میرے کان کے قریب منہ لا کر پھندا ٹھیک کرتے ہوئے آہستہ سے مجھے ایک ایسی بات کہہ دی جس کو سن کر میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے ایسا فقرہ سنا ہے۔ نائیک گنگا داس نے آہستہ سے کہا تھا۔

"فکر نہ کرو۔ جب تم نیچے گرو گے تو تمہارے گردن کی رسی کی گرہ کھل جائے گی۔"

میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ یونہی میری گردن میں پڑے ہوئے اس بہت ڈھیلے پڑے ہوئے پھندے کو انگلیوں سے ادھر ادھر کر رہا تھا۔ میری حیرت زدہ آنکھوں میں جو سوال تھا اس کو گنگا داس نے پڑھ لیا تھا میری آنکھوں میں جو سوال تھا

مجھ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا وہ یہ تھا کہ اگر تمہیں مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے اور تم مجھے موت کے منہ سے بچانا چاہتے ہو تو میرے آزاد ہو کر پل کے نیچے گرنے کے بعد تمہارا کیا ہو گا؟ میجر راما راؤ اور کیپٹن تیرہ تو صاف سمجھ جائیں گے کہ تم نے جان بوجھ کر میری گردن میں پھندا ڈھیلا رکھا ہو گا اور وہ تمہیں اس وقت شوٹ کر دیں گے۔ اس کا جواب مجھے جو ملا وہ یہ تھا۔ نائیک گنگا داس نے آہستہ سے کہا۔

"میں ہندو نہیں ہوں۔ مسلمان ہوں مجھے بھی تمہارے پیچھے نالے میں چھلانگ لگانی پڑے گی۔"

اس نے بظاہر میری گردن میں پھندا کس دیا اور دور چبوترے پر کرسیوں پر بیٹھے میجر راما راؤ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میجر صاحب! حکم کریں۔"

میجر راما راؤ کی غصے بھری آواز آئی۔

"جانگلی کے بچے۔ اسے لٹکا دو۔"

"یس سر!"

اور اس کے ساتھ ہی نائیک گنگا داس نے دھکا دے کر گرا دیا۔ میں نیچے گرا۔ میری گردن کو بڑا معمولی سا جھٹکا لگا اور رسی کھل کر میری گردن سے الگ ہو کر اوپر کو رہ گئی اور میں نیچے نالے کے شور مچاتے پانیوں میں گر پڑا۔ مجھے اپنے پیچھے کوئی دو سیکنڈ کے وقفے کے بعد کسی اور شخص کے نالے میں گرنے کی آواز آئی۔ یقیناً یہ نائیک گنگا داس ہی تھا جس نے کہا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور جس نے میری گردن میں پڑا ہوا پھندا مجھے نیچے گرانے سے پہلے کھول دیا تھا۔

اب اوپر سے ہر قسم کے فائر کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ ان میں پستول کے فائر تھے یقیناً کیپٹن تیرہ اور مدراسی میجر راما راؤ کر رہے تھے۔ سٹین گنوں کے فائر تھے اور رائفلوں کے دھماکے بھی تھے۔ گولیاں میرے آگے اور پیچھے گر رہی تھیں مگر خدا بھلا کرے اس تیز رفتار پہاڑی نالے کا۔ وہ اس قدر تیز بہہ رہا تھا کہ "آناً فاناً" مجھے اپنی سمندر ایسی اوپر کو

اٹھتی ہوئی موجوں کی لپیٹ میں لے کر کہیں کا کہیں لے گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد نالہ پہاڑی کے پہلو میں ایک طرف کو مڑ گیا۔ اس موڑ نے مجھے دشمن کی فائرنگ سے محفوظ کر دیا۔ مگر نالے کا پانی اس قدر تیز رفتار تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے ایک دفعہ سر اٹھا کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے اپنے فوراً بعد نالے میں کودنے والا مسلمان فوجی کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ کو نالے کے ہیجان خیز بہاؤ کے حوالے کر دیا۔ صرف اتنی کوشش ضرور کرتا رہا کہ پانی میں ڈوبنے نہ پاؤں۔ اس کے لئے صرف کبھی کبھی مجھے ایک دو بار ہاتھ پاؤں چلانے پڑتے تھے۔

نالہ ایک پہاڑی کو پیچھے چھوڑ کر دوسرے ٹیلے کے پہلو سے گذرتا ہوا دور بہت بڑے پہاڑوں کے درمیان تنگ درے میں داخل ہو گیا۔ پانی کا بہاؤ یہاں بھی بڑا تیز تھا۔ دونوں جانب اونچے پہاڑ تھے جن کی چوٹیوں پر اگے ہوئے درخت چھتریوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر سر پیچھے گھما کر دیکھا تو مجھے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر پانی کی لہروں میں ایک انسانی سر اوپر نیچے ہوتا ہوا بڑھتا دکھائی دیا۔ یہ سوائے اس مسلمان فوجی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ گولیوں کے دھماکے دور ہوتے ہوتے بند ہو گئے تھے۔ نالہ پہاڑی درے میں دونوں جانب کے پتھروں سے ٹکراتا شور مچاتا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں نالے کا پانی کافی گہرا معلوم ہوتا تھا۔ میرے پاؤں نیچے زمین سے نہیں لگ رہے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ نالہ مجھے دشمن کے کیمپ سے جتنی دور اور جتنی جلدی بہا کر لے جا سکتا ہے بہا کر لے جائے۔ اونچے پہاڑوں کا درہ ختم ہو گیا۔ آگے تھوڑی کھلی جگہ تھی۔ یہاں نالے کا بہاؤ تھوڑا کم ہو گیا۔ میں نے ہاتھوں سے تیرنا شروع کر دیا۔

میں نے پیچھے دیکھا۔ ایک انسان تیزی سے تیرتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

نالے کے دونوں کنارے ابھی تک اونچے تھے اور وہاں جگہ جگہ بھورے رنگ کی نوکیلی چٹانیں جگہ جگہ باہر نکلی ہوئی تھیں۔ نالہ ان چٹانوں کے درمیان آگے ہی آگے بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں تیرتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر یہ جموں کے آگے کا علاقہ ہے تو یہ نالہ ضرور پنجاب کے کسی دریا میں جا کر گرتا ہو گا اور دریا ستلج یا بیاس یا راوی ہی ہو سکتا ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کون سے علاقے میں ہوں۔ علاقہ پہاڑی تھا مگر یہ سرسبز اور گھنے جنگلوں والی پہاڑیاں نہیں تھیں۔ میرے پیچھے پیچھے آنے والا مسلمان فوجی، جو اس بھارتی فوجی یونٹ میں نائیک گنگا دین کے نام سے سروس میں تھا اور جس نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا تھا اور مجھے نالے میں گرانے سے پہلے میرے کان میں کہا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور تمہارے پیچھے میں بھی نالے میں کود رہا ہوں، اب تیرتے تیرتے میرے قریب آ گیا تھا مگر پانی کا بہاؤ ہمارے درمیان فاصلہ اس سے زیادہ کم نہیں ہونے دے رہا تھا۔

اس نے تیرتے تیرتے اونچی آواز میں مجھے کچھ کہا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ں نے اس کی آواز ضرور سنی تھی مگر پانی کی تیز رفتار موجوں کے شور میں اس کے الفاظ ھ میں نہیں آئے تھے۔ نالے کا پاٹ ایک بار پھر سمٹنے لگا۔ سامنے اونچی اونچی پہاڑیاں ب آ رہی تھیں۔ نالہ ان پہاڑیوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ نالہ پہاڑیوں میں سے کسی پہاڑی کے پہلو سے گذرتا ہوا آگے نکل جائے گا۔ لیکن تھوڑی آگے جا کر ایک عجیب بات ہوئی۔ پہاڑیوں کے پاس جاتے ہی نالہ ایک پہاڑی سرنگ داخل ہو گیا۔ جب میں نے نالے کی موجوں کو پہاڑی سرنگ کے تاریک دہانے میں ؛ دیکھا تو زور زور سے ہاتھ پاؤں مار کر کنارے کی طرف جانے کی کوشش کی مگر ب نہ ہو سکا۔ ایک تو دونوں جانب چٹانی کنارے اونچے تھے دوسرے نالے کے پانی کا سرنگ کے پاس آ کر بے حد تیز ہو گیا تھا۔ نالہ شور کے ساتھ دھڑ دھڑاتا ہوا سرنگ خل ہو گیا اور اس کے ساتھ میں بھی سرنگ میں تھا۔

سرنگ میں پہلے تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پانی کی تیز رفتار موجیں مجھے درخت کی ٹہنی ح بہائے لئے جا رہی تھی۔ یہاں بھی نالے کی گہرائی کافی تھی اور میرے پاؤں زمین ل لگ رہے تھے۔ بند سرنگ میں پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے ہیبت ناک سنسناہٹ ہی تھی۔ ایک بار موجیں مجھے سرنگ کے کنارے کی طرف لے گئیں اور میں زور رنگ کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور اسی طرح

تیرنے لگا کہ سرنگ کے درمیان میں ہی رہوں۔

مجھے اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اپنے پیچھے آنے والے مسلمان فوجی کی خبر لیتا۔ مجھے اس کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے بعد وہ بھی نالے کے تیز بہاؤ کے ساتھ سرنگ میں داخل ہو گیا ہو گا۔ میں پہاڑی سرنگ کی تاریکی میں پانی میں گردن تک ڈوبا تیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے صرف ایک بات کا خطرہ تھا کہ کہیں آگے جا کر پانی سرنگ کی چھت تک نہ پہنچ جائے۔ سرنگ کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ایک مقام پر تو وہ اتنی نیچی ہو گئی تھی کہ تیرتے ہوئے میرے ہاتھ اس سے ٹکرا گئے تھے۔ یہ بات میرے لئے تشویش کا باعث تھی۔ اگر نالے کا پانی سرنگ میں بھر گیا تو میرا بچنا ناممکن تھا۔ پانی کے ساتھ بہتے بہتے اور تیرتے ہوئے اندھیرے میں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ سرنگ دو تین جگہوں سے بائیں جانب گھوم گئی تھی۔ یہ نالہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کسی بہت بڑے پہاڑی سلسلے کے نیچے ہی نیچے خدا جانے کس طرف چلا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پانی کے بہاؤ میں زیادہ تیزی آگئی ہے۔ پانی سرنگ کے اندر اس طرح ایک ریلے کی طرح بہنے لگا تھا جیسے وہ ڈھلان پر بہہ رہا ہو۔ کسی آنے والے خطرے کے پیش نظر میں نے سرنگ کے کناروں کی دیوار کو پکڑنے کی کوشش کی کہ کسی جگہ باہر نکلے ہوئے پتھروں کو پکڑ کر رک جاؤں مگر سرنگ کی دیوار پر میرا ہاتھ نہیں پڑ رہا تھا۔ پانی کا ریلا زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے کسی آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا مگر میں سوائے بے بس تنکے کی طرح سرنگ کے اندر تیز رفتار پانی کے بہاؤ میں بہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاؤں تہہ میں پتھروں سے ٹکرانے لگے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ زمین ڈھلانی ہے۔ اس کا مطلب تھا سرنگ نیچے کی طرف ہو گئی تھی۔ پھر مجھے شور سا سنائی دیا۔

یہ ایسا شور تھا جیسے پانی کی بہت بڑی چادر اوپر سے نیچے گر رہی ہو۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آگے کوئی آبشار تھی۔ میں نے پوری طاقت کے ساتھ اچھل کر سرنگ کی دیوار کو پکڑنے کی کوشش کی مگر پانی کا ریلا مجھے بہا کر آگے لے گیا۔ سرنگ میں دور

روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی بڑھتی گئی۔ پھر سرنگ روشن ہو گئی۔ پانی کا شور بھی زیادہ بلند ہو گیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا پانی کے زبردست ریلے نے مجھے سرنگ کے اندر اچھال کر باہر پھینک دیا میں زمین پر گرنے کی بجائے ہوا میں بلند ہوا اور پھر قلابازیاں کھاتا نیچے ہی گرتا ہی چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ میں پانی کے ایک بہت بڑے تالاب میں گرنے والا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو گیند کی طرح لپیٹ لیا اور پھر زور سے پانی میں گر گیا اور پانی کے اندر ہی اندر گرتا چلا گیا۔

میرے پاؤں پانی کی تہہ میں پتھروں سے ٹکرائے۔ میں اپنے آپ کو تیزی سے اوپر انے لگا۔ بازوؤں کو اوپر سے نیچے کرتے ہوئے جب میں نے پانی میں سے سر باہر نکالا تو یکھا کہ میں ایک بہت بڑے تالاب میں یا جھیل میں ہوں اور میرے دائیں جانب تالاب ے کافی بلندی پر پہاڑی سرنگ میں سے پانی کی بہت بڑی چادر آبشار کی طرح نیچے تالاب ں گر رہی تھی۔ میں اس آبشار کے اوپر سے ہو کر نیچے گرا تھا۔ اگر نیچے آبشار کے پاس روں پر گرتا تو میری ہڈیاں چور چور ہو جاتیں مگر پانی کے نیچے کو تیزی سے آتے ہوئے لے نے مجھے اچھال کر ان پتھروں سے دور تالاب میں گرا دیا تھا۔

اب میں نے ایک اور انسان کو تالاب میں تیر کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس تیرتے ہوئے مجھے ایک بار پھر آواز دی مگر وہاں آبشار کا شور اتنا زیادہ تھا کہ مجھے کچھ پتہ ل سکا کہ اس آدمی نے جو یقیناً مسلمان فوجی اور میرا محسن ہی تھا مجھے کیا کہا ہے۔ نما تالاب کی سطح چونکہ ہموار تھی اور پانی کا بہاؤ بھی پرسکون تھا اس لئے تیرتے ے میں نے مڑ کر دیکھا۔ مسلمان فوجی میری طرف تیرتا چلا آرہا تھا اور اشارے سے ائیں جانب ہو جانے کے لئے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ خود بھی بائیں جانب ہو گیا تھا۔ بائیں جھیل کا کنارا تھا۔ میں بھی کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ ہم ایک دوسرے کے آگے نارے پر پہنچ گئے۔ پہلے میں کنارے پر نکلا میرے بعد مسلمان فوجی بھی کنارے پر یہاں کافی سرکنڈے تھے۔ میں اٹھ کر اپنے محسن کی طرف گیا۔ میرا جسم ٹارچر کی ے درد کر رہا تھا مگر ٹھنڈے پانی نے اس درد کو کافی دبا دیا تھا۔ دوسرے میں نوجوان

تھا اور مضبوط جسم والا بلکہ کسرتی اور کمانڈو جسم والا تھا اور میرا جسم تکلیفوں اور سختیوں کو سہہ سہہ کر لوہا بن گیا ہوا تھا۔ اس بار مجھ پر اتنا زیادہ تشدد کیا گیا تھا کہ کئی بار درد میری برداشت کی حد سے باہر ہو گیا تھا۔ میں قریب گیا تو میں نے اپنے محسن کو پہچان لیا۔ یہ وہی گنگا داس بھارتی فوجی تھا جس نے کہا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ وہ سرکنڈوں کے پاس بیٹھا پانی قمیض اتار کر نچوڑ رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

میں نے اس سے کہا۔

"اگر تم مسلمان ہوں تو بھارتی فوج میں ہندو بن کر بھرتی ہوئے تھے؟"

اس نے اپنی فوجی قمیض جھاڑ کر دوبارہ پہنتے ہوئے کہا۔

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی جوان۔ پہلے یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کون سا علاقہ ہے؟"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہم کٹھوعا کی پہاڑیوں میں ہیں اور یہ جھیل آگے جا کر کانگڑہ کی وادی میں داخل ہو جاتی ہے۔"

ابھی ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ہمیں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میرے فوجی دوست نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے ادھر نکل چلو"

اور وہ میرے آگے آگے سرکنڈوں میں دوڑ پڑا۔ میں اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور اوپر ہیلی کاپٹر سے ہمیں دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ بولا۔

"یہ ڈوگرہ انفنٹری ڈویژن کا ہیلی کاپٹر ہو گا۔ وہ ہماری تلاش میں ہے"

جس علاقے میں ہم دوڑے جا رہے تھے وہاں درخت بھی نہیں تھے۔ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ وہ بھی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر فوجی دوست بیٹھ گیا اور اس

نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھے تھے اور ہماری نگاہیں اوپر آسمان پر تھیں۔ بائیں جانب کی پہاڑیوں کے اوپر سے ایک کے بعد ایک دو فوجی ہیلی کاپٹر گڑگڑاتے ہوئے نمودار ہوئے اور جھیل کے اوپر چکر لگانے لگے۔ فوجی دوست نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا یہ لوگ ہماری تلاش میں ضرور آئیں گے۔ فکر نہ کرو۔ بس یہیں بیٹھے رہو۔"

فوجی ہیلی کاپٹر جھیل کے اوپر کافی نیچے آکر چکر لگا رہے تھے۔ پھر وہ اس طرف آ گئے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم جھاڑیوں کے اندر جتنا گھس سکتے تھے گھس گئے۔ ہیلی کاپٹر کافی نیچے آکر دائرے کی شکل میں چکر لگا رہے تھے۔ مگر انہوں نے ہمیں نہ دیکھا۔ جھاڑیوں کے اندر چھپے ہونے کی وجہ سے ہم انہیں نظر نہیں آئے تھے۔ آہستہ آہستہ ہیلی کاپٹر اوپر اٹھتے گئے اور پھر جدھر سے آئے تھے اس طرف چلے گئے۔ جب وہ پہاڑیوں کی دوسری طرف ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میرے مسلمان فوجی دوست نے کہا۔

"اس طرف انڈیا کی پندرہ ماؤنٹین ڈویژن کی یونٹوں کے کیمپ ہیں۔ ہمیں اس علاقے سے دور رہ کر نیچے ہوشیار پور کی طرف نکلنے کی کوشش کرنی ہو گی۔ یہ ہیلی کاپٹر اس بات کی نشانی ہیں کہ ہماری آٹھ ڈوگرہ رجمنٹ کے فوجی ہماری تلاش میں ہیں اور انہوں نے تمہارے اور میرے فرار کی کٹھوعہ کے فوجی کیمپ کو بھی وائرلیس پر خبر کر دی ہو گی۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

ہم ابھی تک جھاڑیوں میں ہی بیٹھے تھے۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

"دوست! پہلے اس راز پر سے پردہ ہٹاؤ کہ تم ڈوگرہ یونٹ میں ہندو بن کر کیسے بھرتی ہو گئے جبکہ بقول تمہارے تم مسلمان ہو اور ایک مسلمان ہونے کے ناطے تم نے مجھے موت کے منہ سے بچایا ہے۔"

وہ بولا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان اگر ہندو بن کر انڈیا کی فوج میں بھرتی ہونا چاہے تو ضرور اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ ایسا ناممکن ہے۔ ڈاکٹری چیک اپ میں اس کا مسلمان ہونا فوراً ظاہر ہو جائے گا۔"

"پھر تم ڈوگرہ یونٹ میں ہندو فوجی گنگا داس بن کر کیسے رہ رہے تھے؟"

"وہ بولا۔

"میرا نام نور دین ہے۔ مجھے گھر میں سارے محبت سے نور کہتے تھے۔ میرا باپ فسادات کے وقت نوجوان تھا اور ریاست مالیر کوٹلہ کے ایک کارخانے میں فٹر تھا۔ جب پاکستان بنا تو مشرقی پنجاب کے دوسرے شہروں اور سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کا بڑا قتل عام ہوا تھا مگر ریاست مالیر کوٹلہ کے مسلمان بچے رہے تھے۔ میرے باپ کی شادی مالیر کوٹلہ میں ہی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ فرید کوٹ میں آکر ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہو گیا۔ میں اپنے ماں باپ کی شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوا اور بڑی منتوں کے اس دنیا میں آیا تھا۔ میں ابھی سکول میں ہی پڑھتا تھا کہ میرے ماں باپ مجھے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ آگے کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ مختصر مختصر یہ ہے کہ میں جوان ہو گیا اور ایک سکھ کے کارخانے میں کلرک ہو گیا جب بھارتی فوجیوں نے کشمیر میں نہتے اور مظلوم مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی اور کشمیری حریت پرست ان کے مقابلے پر نکل آئے تو میں بھی کشمیر کے محاذ پر پہنچ گیا اور اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ بھارتی فوجیوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب میں نے دیکھا کہ بھارتی فوجی جو کشمیری مجاہدین کو پکڑ کر ٹارچر سنٹروں میں لے جاتے ہیں تو وہاں سے ان کی لاشیں ہی واپس نہیں آتیں اور انہیں ہلاک کر دیا جاتا ہے تو میں نے سوچا کہ کوئی ایسا طریقہ سوچنا چاہئے جس پر عمل کر کے میں اپنے کشمیری مجاہدوں کی بھارتی فوجی ٹارچر سنٹروں میں مدد کر سکوں اور انہیں وہاں سے فرار ہونے میں مدد دے سکوں۔ چنانچہ میں ہندو بن کر ڈوگرہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میں کس طریقے سے بھرتی ہوا؟ یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ بہرحال میں نائیک گنگا اس کے نام سے ڈوگرہ فوج میں رہ کر قیدی ہونے والے کشمیری مجاہدوں کی

جتنی مدد کر سکتا تھا کرتا رہا۔ میں انٹیلی جینس میں تھا۔ یہاں اس کیمپ میں ہی تھا جہاں تمہیں انٹیروگیشن کے لئے لایا گیا تھا۔ مگر تمہارے گرد سیکورٹی اتنی سخت تھی کہ جس دوران تم پر بے پناہ تشدد ہوتا رہا میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ تمہیں پھانسی دی جانے والی ہے اور پھانسی نالے کے پل پر لٹکا کر دی جائے گی تو میں نے اپنے مدراسی میجر راما راؤ کے پاس کے جاکر سلیوٹ کیا اور کہا کہ سر مجھے اجازت دی جائے کہ میں اپنے ہاتھ سے اس پاکستانی کمانڈو کو پھانسی دوں۔ کیونکہ جموں میں پاکستانی کمانڈوز نے میرے بڑے بھائی کے سارے خاندان کو ہلاک کر دیا تھا۔ میں نے یہ جھوٹی کہانی میجر راما راؤ کو اتنا ڈراما کر کے سنائی کہ اس نے مجھے اجازت دے دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں نے جان بوجھ کر تمہارے گلے میں ڈالے گئے پھندے کو ایسی گرہ لگائی کہ جیسے ہی تمہیں پل پر سے نیچے دھکا دوں تمہاری گردن رسی کے پھندے سے آزاد ہو جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بعد مجھے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا اور پھر میرے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کیا جائے گا کہ جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ تمہارے پیچھے میں بھی پل پر سے چھلانگ لگا دوں گا۔ بس یہ ہے میری کہانی۔"

نائیک نور دین نے اپنی کہانی ختم کی ہی تھی کہ فضا میں ایک بار پھر ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ نائیک نور دین نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے فوج نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ یہاں سے نکلو"

ہم اٹھ کر ایک طرف دوڑے تو ٹیلوں کے اوپر فوجی ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔ ہم جلدی سے بیٹھ کر ساکت ہو گئے۔ ہیلی کاپٹر ہمارے اوپر سے ہو کر گزر گیا۔ ہم دوبارہ دوڑ پڑے۔ نائیک نور دین جھاڑیوں میں سے نکل کر ایک چھوٹی پہاڑی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ پہاڑی کے پاس آکر رک گئے۔ نائیک نور دین نے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا اور بولا۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ بھارتی فوجی ہماری تلاش میں یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کسی طریقے سے ان پہاڑیوں سے نکل جانا چاہئے۔ ان پہاڑیوں کی دوسری طرف کیا ہے؟"

نائیک نور دین کہنے لگا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ ان ٹیلوں کے پیچھے دریا بہتا ہے۔"

فضا میں اچانک تیز سیٹی کی چیخ بلند ہوئی اور پھر ہم سے کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ نائیک نور دین نے گھبرا کر کہا۔

"یہ مارٹر گن کا گولہ تھا۔ یہاں سے بھاگو"

ہم دوڑتے ہوئے پہاڑی کے پیچھے آگئے۔ میں حیران تھا کہ بھارتی فوجی ہمارا سراغ لگاتے مارٹر گنیں لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ مارٹر فائر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جاری تھا۔ یہ بھارتیوں کی حماقت تھی۔ مارٹر گولوں کے دھماکوں سے ہم الرٹ ہو گئے تھے۔ نائیک بولا۔

"پہاڑی کے اوپر سے ہو کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔"

وہاں دوسرا کوئی محفوظ راستہ بھی نہیں تھا۔ مارٹر گنوں کے گولے ہمارے دائیں بائیں پھٹ رہے تھے۔ ہم پہاڑی ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ ڈھلان پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہم ان کی آڑ لے کر اوپر چڑھ رہے تھے۔ مارٹر گنوں کے گولے یہاں تک نہیں آرہے تھے۔ ہم پہاڑی کی آدھی چڑھائی چڑھ چکے تھے کہ مارٹر کا فائر رک گیا۔ ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ چوٹی پر ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں جھاڑیاں اور درخت کثرت سے اگے ہوئے تھے۔ سامنے کی جانب درختوں کے پیچھے ایک چٹانی دیوار تھی۔ ہم نے چٹان کے پاس جا کر دوسری جانب دیکھا۔ نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ یہ دریا ایسا ہی تھا جیسے دریا پہاڑیوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا پاٹ چوڑا نہیں تھا مگر پانی کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ ہم چٹان کے پاس بیٹھ گئے۔ نائیک نے نیچے دریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دریا کی دوسری جانب پنجاب کی ترائی کا علاقہ ہے۔"

"یہ دریا آگے کس طرف جاتا ہے؟" میں نے پوچھا

نائیک بولا۔

"اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ دریا آگے جا کر کسی اور دریا جاکر گر جاتا ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر ہم کسی طرح اس دریا کے پار پہنچ جائیں تو بھارتی فوجیوں سے نجات مل سکتی ہے جو ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آگئے ہے۔"

فضا میں سناٹا طاری تھا۔ یہ خاموشی بڑی پر اسرار لگ رہی تھی۔ ہم چٹان سے نیچے تک اترنے کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ یہاں اترائی بالکل سیدھی تھی اور اس کا قوی امکان تھا کہ ہم نے اگر جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر بھی نیچے اترنے کی کوشش کی تو دریا کے کنارے جو نوکیلے چٹانی پتھر جگہ جگہ ابھرے ہوئے ہیں سیدھے ان پر جا کر یں گے اور ہماری فوری موت واقع ہو جائے گی۔ نائیک نور دین کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے پہاڑی کی دوسری جانب جا کر دیکھتے ہیں ہو سکتا ہے ادھر اترائی اتنی ناک نہ ہو"

ہم اٹھے ہی تھے کہ ہمیں کچھ آدمیوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ یہ فوجی بوٹوں بھاری آواز تھی۔ نائیک بولا۔

"یہ انڈین فوجی ہیں۔ یہ تو ہمارے سر پر پہنچ گئے ہیں۔"

ہم گھبراہٹ میں چٹان کی طرف دوڑے۔ ابھی چٹان کے قریب ہی تھے کہ پیچھے سے برین گن کا برسٹ آیا۔ گولیاں سامنے چٹان سے ٹکرائیں۔ ہم جلدی سے بیٹھ گئے۔ رتی فوجیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں گرنیڈ مارو"

دوسرا لمحے ایک گرنیڈ ہمارے آگے تین چار گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں گرا۔ میں تک نہیں سمجھ سکا کہ نائیک نور دین نے ایسا کیوں کیا تھا۔ گرنیڈ کا پن کھینچ کر جب

اسے پھینکا جاتا ہے تو وہ دس پندرہ سیکنڈ کے بعد پھٹ جاتا ہے۔ یہ ہینڈ گرنیڈ تقریباً
فاصلے پر پھینکا گیا تھا اور تین چار سیکنڈ اسے راستے میں لگ گئے تھے۔ اسے چار پانچ سیکنڈ
میں دھماکے سے پھٹنا تھا اور یقینی بات تھی کہ یہ گرنیڈ پھٹ کر ہمارے چیتھڑے اڑا دیتا
کیونکہ ہم اس کے بالکل قریب تھے۔

ایک سیکنڈ کے اندر اندر نائیک نور دین نے اچھل کر گرنیڈ کے اوپر چھلانگ لگا دی۔
وہ بالکل گرنیڈ کے اوپر جا کر لیٹ گیا اور بولا۔

"دریا میں کود کر نکل جاؤ"

اس کے ساتھ ہی دھماکہ ہوا۔ ہینڈ گرنیڈ پھٹ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرے
محسن اور جہاد کشمیر کے سرفروش مجاہد نائیک نور دین کے جسم کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ میں
چٹان کی طرف دوڑ پڑا۔ پیچھے سے مجھ پر مشین گن کے برسٹ فائر ہو رہے تھے۔ میری
زندگی ابھی لکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے کوئی گولی نہ لگی ورنہ گولیوں کی بارش میں
میرا بچنا ناممکن تھا۔ چٹان کے کنارے پر آتے ہی میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

میں نے اپنے آپ کو پوری طاقت سے آگے کی طرف اچھالا تھا تاکہ دریا کے پانی میں
گروں دریا کے کنارے نوکیلے پتھروں پر نہ گروں۔ میں پتھروں سے تھوڑی ہی دور دریا
میں گرا اور اس کی تیز رفتار لہروں میں غائب ہو گیا۔ میں اپنے زور پر دریا کی تہہ میں اتر گیا
تھا۔ چونکہ دریا یہاں زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میرے پاؤں بڑے زور سے تہہ کے پتھروں پر
کر لگے لیکن پانی کے دباؤ اور بہاؤ نے مجھے زخمی ہونے سے بچا لیا۔ میں پانی کے اندر
اندر تیزی سے ہاتھ پاؤں چلاتا دور نکل گیا۔ سانس روکنے کی مجھے کافی مشق تھی۔ جب
میرا دم گھٹنے لگا تو میں نے اوپر آکر سر پانی سے باہر نکالا۔ میں جہاں ابھرا تھا وہاں دریا یا
پہاڑی نالے کا پاٹ چوڑا ہو گیا تھا اور ٹیلے دور دور چلے گئے تھے۔ پانی یہاں بھی تیز رفتار
سے آگے کی طرف جا رہا تھا۔ میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ آگے ہی آگے بہتا چلا جا رہا تھا
کچھ دور جانے کے بعد مجھے آسمان پر ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں
گردن موڑ کر دیکھا۔ ایک فوجی ہیلی کاپٹر اوپر منڈلا رہا تھا۔ میں غوطہ لگا گیا اس طرح

لے لگاتا کبھی سر باہر نکالتا میں دریا میں دور سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پہاڑیاں
پیچھے رہ گئیں اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ دریا میدانی علاقے میں داخل
گیا تھا۔ میں دریا کی ایک بہت تیز موج پر بہتا ہوا دریا کے عین درمیان میں تیر رہا تھا۔
دونوں جانب دریا کے کنارے کافی دور تھے۔ میں دریا کے دائیں جانب کے کنارے
طرف اپنے آپ کو لانے کی کوشش کر رہا تھا مگر دریا کی تیز موج جس پر میں سوار تھا
رفتار گھوڑے کی طرح مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہی تھی۔ آسمان پر ایک جانب سے
نے آکر سورج کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ میں کنارے کی طرف جانے کی سر توڑ
شش کر رہا تھا۔ میں بڑا اچھا تیراک تھا لیکن بھارتی ملٹری انٹیلی جینس نے ٹارچر سنٹروں
مجھ پر جو بہیمانہ تشدد کیا تھا اس نے میری جسمانی حالت کمزور کر دی تھی اور میں تیرتے
تے تھک جاتا تھا۔

اس جدوجہد میں کافی وقت گزر گیا اور دریا کا بہاؤ مجھے اور آگے لے گیا۔ بادل جو
سمان پر ٹکڑوں کی شکل میں آئے تھے اب پوری طرح چھا گئے تھے اور سورج غائب ہو گیا
آخر ایک طویل جدوجہد کے بعد میں کنارے تک آنے میں کامیاب ہو گیا۔ کنارے پر
کر میں وہیں سرکنڈوں میں پڑا ہانپتا رہا۔ جب جسم میں کھوئی ہوئی توانائی کچھ واپس آئی تو
اور دریا کا کنارا جو اونچا تھا اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک اجاڑ
لاقہ تھا۔ کہیں کسی آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ زمین بھی ویران ویران تھی۔ دور بہت دور
رختوں کے جھنڈ سے دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ پتہ نہیں تھا میں کس
لاقے میں نکل آیا ہوں۔ اتنا ضرور یقین تھا کہ یہ مشرقی پنجاب کا علاقہ یا یہاں سے مشرقی
جاب کا میدانی علاقہ شروع ہو رہا ہے۔ کیونکہ کھیت وہاں کہیں نہیں تھے۔ انسان بھی دور
ر تک نظر نہیں آتا تھا۔ دریا کے کنارے کچے تھے اور ان کے نیچے دوسری طرف بیل
ڑیوں اور گڈوں کے گزرنے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ میں ایک طرف چل پڑا۔

موسم گرما تھا۔ بادلوں کی وجہ سے خوشگوار ہوا چلنے لگی تھی۔ میرے گیلے کپڑے چلتے
اپنے آپ خشک ہو گئے۔ میرے پاؤں میں ربڑ کے بوٹ تھے جن میں پانی بھر گیا تھا۔

میں نے بیٹھ کر بوٹ اتار کر اندر سے پانی جھاڑ کر نکالا اور انہیں پہن کر دوبارہ چلنے لگا
حلیہ یہ تھا کہ ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھ چکی تھیں۔ سر کے بال بھی گردن تک آگئے
بدن پر ایک پرانی خاکی رنگ کی قمیض اور نیچے نسواری رنگ کی بوسیدہ سی پتلون
جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ میرے پاس کوئی چاقو بھی نہیں تھا۔ ریوالور
نہیں تھا۔ یہ دونوں چیزیں بھارتی فوجیوں نے تلاشی کے وقت مجھ سے چھین کر اپنے
میں کرلی تھیں۔ یہ میں جانتا تھا کہ اگر یہ مشرقی پنجاب ہے تو پھر یہ سکھوں کا علاقہ ہے
زبان کی مجھے کوئی دقت اور پریشانی نہیں ہوگی۔ میں پنجابی بول کر اپنے آپ کو ہندو ظا
سکتا تھا۔

دریا کے ساتھ ساتھ چلتے میں کافی دور نکل آیا

درختوں کے وہ جھنڈ جو دور سے دھندلے نظر آرہے تھے اب صاف نظر آنے
تھے۔ کھیت بھی شروع ہوگئے جن میں گندم کی فصل ابھی سرسبز ہی تھی اور اس کی
شروع نہیں ہوئی تھی۔ گرمی کی وجہ سے کہیں کہیں فصل پیلی ہو رہی تھی۔ مجھے
پیچھے ایسی آواز آئی جیسے دو تین آدمی دوڑتے چلے آرہے ہوں۔ میں نے جلدی سے
کر دیکھا۔ دریا کے کنارے ایک گھوڑ سوار گھوڑا دوڑاتے چلا آرہا تھا۔ گھوڑے کی
سے گرد اڑ رہی تھی۔ میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ گھوڑ سوار قریب آیا تو دیکھا
یہ ایک اکالی سکھ تھا جس نے لمبا زرد چولا پہن رکھا تھا سر پر مخروطی پگڑی تھی جس
فولادی چکر لگے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی باگ تھی دوسرے ہاتھ میں لمبا
تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے دیکھ کر رک جائے گا اور مجھ سے پوچھے گا کہ میں
ہوں اور کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ مگر اکالی سکھ اسی طرح گھوڑا دوڑا
میرے قریب سے نکل گیا۔ صرف میرے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے مجھ پر
گہری نگاہ ضرور ڈالی تھی۔

جب اکالی سکھ گھوڑ سوار آگے نکل گیا تو میں بھی چل پڑا۔ میں واقعی مشرقی
میں آگیا تھا۔ اور یہ دریا یا تو بیاس تھا یا ستلج تھا۔ کچھ اور آگے جانے کے بعد سرسبز

ہر طرف سرسبز کھیت تھے۔ دریا کے کنارے کنارے ذرا نیچے کی جانب ٹاہلیوں کے
وں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ ان ٹاہلیوں پر بور آرہا تھا اور ان کی بڑی دھیمی
خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹاہلیوں پر نئی کونپلیں اور ہرے ہرے نئے پتے آئے ہوئے
کھیتوں میں سکھ کسان نظر آنے لگے تھے۔ ایک گاؤں آگیا۔ مگر وہ دریا سے دور تھا۔
مکان تھے۔ ایک سکھ بھینسوں کو لئے دریا کی طرف آرہا تھا۔

میں دریا کے کنارے سے اتر کر کھیتوں کے ساتھ ساتھ جو پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی اس پر
لگا ایک دیہاتی عورت سامنے سے آرہی تھی۔ اس نے سر پر جانوروں کے چارے کی
اٹھا رکھی تھی۔ میں پگ ڈنڈی سے ہٹ گا۔ وہ میرے قریب سے گذر گئی۔ عورت
کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ ایک کھیت کے قریب سے گذرا تو دیکھا کہ وہاں
ٹ چل رہا تھا۔ بیل کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہوئے اور وہ گول دائرے میں آہستہ
گھوم رہا تھا۔ رہٹ کی گدی پر ایک تیرہ چودہ سال کا سکھ لڑکا چھڑی ہاتھ میں لئے
تھا۔ وہ چھڑی کو رہٹ کی لکڑی پر آہستہ آہستہ بجاتا جا رہا تھا۔ رہٹ کا پانی نیچے
ٹے سے چوبچے میں گر رہا تھا۔ چوبچہ بھرا ہوا تھا۔ اس میں سے پانی نیچے کھیتوں کی
جاتے نالے میں گر رہا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھویا کنوئیں کا پانی پیا۔ لڑکا
ٹ کی گدی پر بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ پانی وغیرہ پی کر میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا کہ
ریلوے سٹیشن کس طرف ہے۔

لڑکے نے چھڑی سے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"ادھر ہے۔"

لڑکے نے جس طرف اشارہ کیا تھا میں اس طرف چلنے لگا۔ زیادہ کرید کر میں نے
سے کے بارے میں اس لئے نہ پوچھا کہ وہ مجھے بالکل ہی اجنبی نہ سمجھ بیٹھے۔ میں نے
اسٹیشن پر جا کر خود بخود پتہ چل جائے گا کہ میں مشرقی پنجاب کے کس علاقے میں
میں کھیتوں کھیت چلتا گیا۔ راستے میں ایک اور گاؤں آیا جس کے باہر جوہڑ میں
نہا رہی تھیں۔ ایک سکھ ریہڑے کے پہئے کی مرمت کر رہا تھا۔ یہ گاؤں بھی پیچھے

رہ گیا۔ دور سے ریلوے کا سگنل نظر پڑا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں اسے بردا
کئے ہوئے تھا۔ مگر جسم کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ سٹیشن آگیا۔ چھوٹا سادہ سا تی سٹیشن ت
اس کا نام عجیب سا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ تھوڑے سے مسافر پلیٹ فارم پر بیٹھے تھے۔ ا
میں سکھ بھی تھے اور ہندو بھی تھے۔

ایک قلی سے میں نے بڑے طریقے سے بات کر کے معلوم کیا کہ یہاں سے آگے ی
کی طرف امرتسر کا سٹیشن تیس پینتیس میل ہے۔ پیچھے ایک برانچ لائن جالندھر کی طر
جاتی ہے۔ جالندھر میرے لئے خطرناک شہر تھا۔ میں نے امرتسر اپنے مجاہد کے پاس جانے
فیصلہ کیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین کچھ دیر بعد آگئی۔ ٹرین مسافروں سے بھری ہو
تھی۔ میں اس میں بغیر ٹکٹ ہی سوار ہو گیا۔ تیس پینتیس میل کا سفر اس ریل گاڑی ن
دو گھنٹے میں طے کیا اور امرتسر کے سٹیشن پر آکر کھڑی ہو گئی۔ راستے میں ٹکٹ چیک کر
والا ٹی ٹی نہیں آیا تھا۔ ورنہ میرے لئے مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔ امرتسر سٹیشن سے
نکلنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں سٹیشن کے گیٹ سے نکلنے کی بجائے میں ریلو
لائن کے ساتھ ساتھ چھ ہرسہ کی طرف چلنے لگا۔ ریگو برج سے ذرا پہلے ریلوے یارڈ
دیوار ایک جگہ سے تھوڑی سی توڑ کر لوگوں نے آنے جانے کے لئے راستہ بنا دیا ہوا تھا
میں اس میں سے باہر نکل گیا۔

سامنے ریلوے کوارٹروں کے پیچھے جی ٹی روڈ تھی۔

جی ٹی روڈ کی دوسری جانب دائم گنج کی آبادی تھی۔

ہمارا خفیہ مجاہد اسی آبادی میں رہ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ امرتسر میں گرمیوں
وسم شروع ہو چکا تھا۔ آسمان پر بادل آگے نکل گئے تھے اور دھوپ چمکنے لگی تھی۔ پہلے
نے سوچا کہ سیدھا اپنے مجاہد کے گھر چلا جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے وہ گھر پر نہ
چنانچہ میں اس سینما ہاؤس کی طرف چل پڑا جہاں اپنا مجاہد کام کرتا تھا۔ سینما ہاؤس میں
یکھا ہوا تھا اور مجھے اس کا کمرہ بھی معلوم تھا جہاں وہ اپنی چیزیں وغیرہ رکھا کرتا تھا۔
ہاؤس وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں وہاں پہنچ کر اس کے پہلو میں جو کمرے بنے
ے تھے ان کا سرسری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھا تو دیکھا کہ اپنے مجاہد کے
ے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں وہاں سے کسی سے اس کے بارے میں پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔
سے جی ٹی روڈ پر آگیا اور کھیتوں میں سے ہوتا ہوا دائم گنج کی آبادی میں اس گلی میں
جہاں مجاہد کا مکان تھا۔ مکان پر بھی تالا پڑا تھا۔

گلی میں صرف دو دکانیں تھیں۔ ایک پنساری کی اور دوسری پان سگریٹ والے کی
تھی۔ ان دکانوں کے باہر چارپائیوں پر دو سکھ اور تین چار ہندو نوجوان بیٹھے میری
غور سے دیکھنے لگے۔ میں خاموشی سے الٹے پاؤں گلی میں واپس ہو گیا۔ دو قدم ہی
ں گا کہ ایک مکان کے اندر سے دو آدمی نکل کر میرے سامنے آکر اس طرح کھڑے ہو
یسے میرا راستہ روک رہے ہوں۔ دونوں ہندو تھے۔ ایک بھاری بدن کا تھا جس نے
ر کا کرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ دوسرا جوان آدمی تھا اور پتلون قمیض میں تھا۔ اس پتلون
ے آدمی نے ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے

مجھے روک کر پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کون ہوں؟ میں اس کے لہجے ا
دوسرے آدمی کے دیکھنے کے انداز سے سمجھ گیا کہ یہ خفیہ پولیس کے آدمی ہیں اور معاملہ گڑبڑ ہے۔ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"میں خالصہ کالج کا سٹوڈنٹ ہوں۔ ہوسٹل میں رہتا ہوں۔ راستہ بھول کر ادھر آ
تھا۔ مجھے یہ بتائیں کہ خالصہ کالج کے ہوسٹل کو یہاں سے کوئی راستہ نکلتا ہے؟"

بھاری بدن والے آدمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور میری آنکھوں م
آنکھیں ڈال کر بولا۔

"تم۔۔ سے ملنے آئے تھے۔ اس کا مکان پر تالا دیکھ کر واپس جا رہے ہو"

اس نے مجاہد کا وہ ہندو نام لیا تھا جس نام سے وہ وہاں رہ رہا تھا۔ میں نے اجنبی بن ک
کہا۔

"جس آدمی کا آپ نے نام لیا ہے میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ میں تو خالصہ کا
ہوسٹل کا راستہ بھول کر ادھر نکل آیا ہوں۔ آپ لوگ کون ہیں اور مجھ سے ایسے سوا
کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

اب دوسرے جوان آدمی نے پتلون کی جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ م
ریوالور تھا۔

"چپکے سے ہمارے ساتھ پولیس سٹیشن چلو۔ تم سے دو ایک سوال پوچھیں گے پ
تمہیں ہوسٹل میں پہنچا دیں گے۔ آؤ"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ بھاری بدن والے ہندو نے جس مکان سے یہ دونو
نکلے تھے اس مکان کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

"پرتیم سیاں اپنے آدمی لے کر باہر آجاؤ۔"

مکان کی بیٹھک میں سے تین پولیس کانسٹیبل باہر نکل آئے۔ ان میں ایک سکھ
اور دوسرے دو ہندو تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ میں پھنس گیا تھا۔ نہ ان کا
کرنے کی پوزیشن میں تھا اور نہ بھاگ ہی سکتا تھا۔ سوچا پھنس تو گیا ہوں ایک کوشش

یہ دیکھ لینی چاہئے شاید ہوا میں چلایا ہوا تیر نشانے پر جا کر بیٹھ جائے۔ میں نے لہجے میں تھوڑا رعب اور آواز میں ذرا دبدبہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ مجھے ہائی جیک کر رہے ہیں میں خالصہ کالج سٹوڈنٹ یونین کا سیکرٹری ہوں۔ کالج کے سارے سٹوڈنٹ تمہارے پولیس سٹیشن پر دھاوا بول دیں گے۔ کیونکہ میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے۔"

بھاری بدن والے کھدر پوش مہاشے نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"شرجی۔ میرا خیال ہے بابو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ سٹوڈنٹ یونین کا معاملہ ہے کہیں الٹی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔"

دوسرے جوان آدمی نے جس کو کھدر پوش خفیہ سروس والے نے شرما جی کہہ کر بلایا تھا۔ کہنے لگا۔

"لالہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ پھر ایسا کرتے ہیں کہ اندر چل کر اس سے دو چار سوال پوچھ کر ڈائری بھر لیتے ہیں تاکہ ہماری ڈیوٹی بھی پوری ہو جائے۔"

میں دل میں خوش ہو گیا کہ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا اور یہ لوگ سٹوڈنٹ یونین کے نام سے ڈر گئے تھے۔ شرما جی نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"چلو بابو یار بیٹھک میں آجاؤ دو تین سوالوں کے جواب لکھو اور ہماری کاروائی بھی پوری ہو جائے گی"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"مگر میں ایک منٹ سے زیادہ اندر نہیں ٹھہروں گا"

کھدر پوش بولا۔

"ارے یار دو سوال پوچھنے ہیں تم سے۔ ایک منٹ میں فارغ کر دیں گے تمہیں۔ آجاؤ۔"

میں ان کے ساتھ مکان کی بیٹھک میں آگیا۔ کھدر پوش اور شرما تو میرے ساتھ ہی بیٹھک میں آئے۔ تینوں کانسٹیبل مکان کے باہر ہی کھڑے ہو گئے۔ اندر آنے کے بعد

پولیس آفیسر شرما نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ میرا نام کیا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں انڈیا کے ایک پرانے ایکٹر ترلوک کپور کا نام آیا میں نے کہہ دیا۔

"ترلوک کپور"

کھدر پوش کہنے لگا۔

"تمہاری پنجابی یہاں کے ہندوؤں والی پنجابی نہیں ہے۔ کہیں تم لاہور کے رہنے والے تو نہیں ہو؟"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ لوگ مجھے کسی جال میں پھنسانے کے لئے اندر لائے تھے۔ میں نے پنجابی میں دو چار الفاظ شامل کرتے ہوئے کہا کہ میں ہندو ہوں۔ میرے پتا جی لاہور کے رہنے والے تھے اس لئے میری پنجابی زبان پر لاہور کا اثر ہے۔ پولیس افسر شرما نے کھدر پوش سے کہا

"لالہ ذرا اس کی پتلون اتروا کر تو دیکھو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان"

ایک بار واقعی میرے پاؤں تلے کی زمین ہل گئی۔ یہ لوگ مجھے اس مقصد کے لئے بیٹھک میں لائے تھے۔ میں نے اپنے حواس بیدار رکھے اور ان پر برس پڑا کہ کیا وہ مجھے کوئی پاکستانی جاسوس سمجھتے ہیں؟ میں انکل جالندھر پولیس کے ڈی ایس پی ہیں۔ میں ابھی انہیں فون کرتا ہوں۔ شرما بولا۔

"مہاشہ جی ہم تمہیں کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔ ہم تو اپنا شک دور کرنا چاہتے ہیں کہ تم کہیں مسلمان تو نہیں ہو۔ اگر تم ہندو ہو تو تمہیں پتلون اتروانے میں کیا اعتراض ہے؟"

اس کے باوجود جب میں نے احتجاج کیا تو شرما نے آواز دے کر تینوں کانسٹیبل اندر بلا لئے اور انہیں حکم دیا۔

"اس کی پتلون اتار دو"

دو سپاہیوں نے اپنی رائفلوں کا رخ میری طرف کر دیا اور تیسرا سپاہی میری پتلون اتارنے کے لئے میری طرف بڑھا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ زبردست احتجاج کرتا رہا

لیکن جب میرا یہ راز کھل گیا کہ میں مسلمان ہوں تو میں نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"اب جب کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو میں بھی آپ سے اب کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ میں اصل میں کشمیری مسلمان ہوں۔ میرا ایک رشتے دار امرتسر میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ میں اس سے ملنے سری نگر سے آیا تھا۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ وہ امرتسر میں نہیں ہے۔ میں واپس سٹیشن پر جا رہا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں آپ مجھے کشمیری حریت پسند سمجھ کر جیل میں نہ ڈال دیں۔ میں نے جھوٹ بولا اور اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر دیا۔ یہ بالکل سچی بات ہے جو میں نے بیان کر دی ہے۔"

مگر میری اس وضاحت کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ پولیس افسر شرما نے کانسٹیبل پرنم سنگھ سے کہا۔

"اس کو ہتھکڑی لگا کر تھانے لے چلو"

بات ختم ہو گئی تھی۔ بلکہ تھانے میں پہنچنے کے بعد دوسری خطرناک بات شروع ہونے والی تھی جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس وقت مجھے ہتھکڑی ڈال دی گئی اور سپاہی دائم گنج کی آبادی میں سے مجھے گزارتے ہوئے علاقے کے پولیس سٹیشن لے گئے۔ وہاں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

یہ ایک نئی مصیبت مجھ پر آن پڑی تھی جس سے مجھے ہر حالت میں نکلنا تھا مگر بظاہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی تک تو شاید یہ لوگ مجھے مشتبہ کشمیری حریت پسند ہی سمجھ رہے تھے لیکن اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ بہت جلد ان پر یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ میں انتہائی خطرناک کشمیری مجاہد اور کمانڈو ہوں جس کی تباہ کن کارروائیوں کا سلسلہ سری نگر سے لے کر جنوبی ہند اور گجرات کاٹھیاواڑ تک پھیلا ہوا ہے۔

حوالات میں دو اور مجرم بھی تھے یہ دونوں سکھ تھے۔ ایک پہلوان ٹائپ کا سکھ تھا دوسرا کم عمر نوجوان سکھ تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ پولیس مجھے کشمیری مجاہد ہونے کے شک میں پکڑ کر وہاں لے آئی ہے تو پہلوان سکھ کہنے لگا۔

"یہ لوگ تمہیں بہت ماریں گے۔ خبردار اپنے ساتھیوں کے نام پتہ نہ بتانا۔"

میں خاموش رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ہندو جمعدار ہمیں دو دو روٹیاں اور دال دے گیا۔ مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی۔ دال بدذائقہ تھی اور روٹیاں بھی جلی ہوئی تھیں مگر میری بھوک مٹ گئی۔

دن ڈھل رہا تھا کہ مجھے تھانے کی حوالات سے نکال کر قیدیوں کی لاری میں بٹھایا اور سیدھا امرتسر جیل میں پہنچا دیا۔ امرتسر جیل میری دیکھی ہوئی تھی۔ میں اس سے پہلے بھی یہاں لایا گیا تھا اور یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر اس بات کو بہت عرصہ گذر چکا تھا۔ جیل کا وارڈن بھی نیا تھا وہاں کسی نے مجھے نہ پہچانا۔ رات کے وقت مجھے اسی تنگ سے کمرے میں لے جایا گیا اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ میں اپنے بیان پر قائم رہا اور یہی کہتا رہا کہ میں عام کشمیری مسلمان ہوں اور اپنے ایک کشمیری رشتے دار سے ملنے امرتسر آیا تھا۔ پولیس کے ڈر سے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر دیا۔ میرا کشمیری مجاہدین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھ پر تشدد شروع ہو گیا۔

امرتسر جیل کے ٹارچر سیل سارے انڈیا میں مشہور ہیں۔ یہاں تشدد کرنے کے ایسے ایسے آلات موجود ہیں کہ جن کو دیکھ کر ہی آدمی پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھ پر تشدد کے ہر قسم کے آلات استعمال کیے گئے مگر میں اپنے بیان پر قائم رہا۔ ایک ہفتے کے بعد میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ جیسے جسم میں جان نہ رہی ہو۔ میں جیل کی کوٹھری میں فرش پر تقریباً نیم بے ہوش پڑا رہتا۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ ہمارا دائم گنج میں سپائینگ کی خفیہ ڈیوٹی ادا کرنے والا مجاہد بدقسمتی سے سری نگر کی پہاڑیوں میں کمانڈر شیرون کو وائرلیس پر کوئی پیغام بھیجتے ہوئے پکڑ لیا گیا تھا۔ اور پولیس اس کے مکان کے آس پاس چھپ کر بیٹھ گئی تھی کہ اگر اس کا کوئی ساتھی اس سے ملنے آئے تو اسے بھی پکڑ لیا جائے۔

پولیس نے مجھے اسی بنا پر پکڑ لیا تھا۔

امرتسر جیل پہلے بھی میری دیکھی ہوئی تھی۔ پہلے بھی یہاں سیکورٹی بہت سخت تھی اب میں نے دیکھا کہ حفاظتی انتظامات پہلے سے زیادہ سخت تھے اور جیل کا چھوٹا آہنی گیٹ

بھی بند رہتا تھا اور مسلح گارڈ اندر اور باہر پہرے پر موجود ہوتی تھی۔ مجھے یہاں سے بہرحال فرار ہونا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک امرتسر جیل کے حکام کو میرے پورے تباہ کن ریکارڈ کا علم نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ مجھے ابھی تک پاکستانی کمانڈو ہی سمجھا جا رہا تھا جو پاکستان سے مقبوضہ کشمیر میں آکر کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کے جہاد میں شامل ہو گیا تھا۔ میں اس سے پہلے سارے انڈیا میں کیسی کیسی تباہ کن کمانڈو کارروائیاں کر چکا تھا اس بارے میں امرتسر جیل کے حکام کو ابھی تک معلوم نہیں تھا۔ مجھ پر تشدد کا سلسلہ جاری تھا۔ مجھے ہر قسم کی اذیت پہنچائی جا رہی تھی اور مجھ سے معلوم حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اس طرح جب ایک مہینہ گذر گیا اور جیل کے حکام مجھ سے کسی قسم کی معلومات حاصل نہ کر سکے تو مجھے ٹارچر سیل سے نکال کر قیدیوں کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے اتنی آزادی میسر آگئی تھی کہ میں دن کے وقت قیدی کوٹھڑی سے نکل کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ ورانڈے میں تھوڑی دیر بیٹھ جاتا تھا۔ میں نے بہت غور کیا۔

کئی ترکیبیں سوچیں مگر ہر بار اس نتیجے پر پہنچا کہ یہاں سے کسی منصوبہ بندی کے تحت فرار ہونا ناممکن ہے۔ میں وہاں رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے امرتسر جیل سے فرار ہو کر اپنے ساتھی مجاہدوں کے پاس وادی کشمیر میں پہنچنا تھا۔ میں نے اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں بہت سوچ بچار کیا۔ لیکن فرار کا کوئی راستہ بظاہر دکھائی نہ دیا۔ آخر میں نے ایک دلیرانہ فیصلہ کیا۔

یہ فیصلہ کمانڈو اس وقت کرتا ہے جب اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اپنی جان پر کھیل کر بلکہ جان ہتھیلی پر رکھ کر فل ایکشن کے ساتھ دشمنوں کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کرنے کا فیصلہ تھا۔ اس میں صرف ایک فی صد زندہ بچ نکلنے کی امید تھی۔ باقی ننانوے فی صد موت ہی موت تھی۔ لیکن میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے اس فیصلے کی روشنی میں جیل کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ میری نگاہ زیادہ تر جیل کے بڑے گیٹ پر تھی جو کبھی کبھار سپلائی کا ٹرک آتے وقت یا کسی افسر

کی گاڑی گذارنے کے لئے ہی کھلتا تھا۔ باقی آمدورفت اس آہنی گیٹ کے چھوٹے دروازے میں سے جاری رہتی تھی۔ امرتسر جیل کے باہر کا علاقہ میرے لئے نیا نہیں تھا۔ ایک تو میں اپنے سکول کے زمانے میں امرتسر شہر میں کافی پھرتا پھراتا رہا تھا۔ دوسرے میں ایک بار یہاں سے فرار ہو چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ جیل کے جنوب مشرق کی جانب امرتسر کا مشہور کمپنی باغ ہے جہاں سے ایک سڑک مجیٹھ کی طرف جاتی ہے۔ مجیٹھ میرا آبائی قصبہ تھا۔ وہاں سے میں بٹالہ گورداسپور اور جموں کی ترائی کے علاقے کی طرف بھاگ سکتا تھا۔ سوال صرف جیل کی چار دیواری سے نکلنے کا تھا۔

میں کسی خاص موقع کی تلاش میں تھا۔ آخر قدرت کو مجھ پر رحم آگیا اور اس نے میرے لئے ایک موقع فراہم کر دیا۔ اس روز صبح ہی سے جیل میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ بارکوں کے آگے پانی کا چھڑکاؤ کیا جا رہا تھا۔ جیل کے مین گیٹ سے چیف وارڈن کے آفس تک صحن میں سرخ رنگ کی بجری بچھا دی گئی تھی۔ جیل کے ملازموں نے باقاعدہ وردیاں پہن لی تھیں۔ معلوم ہوا کہ پنجاب کے جیل خانہ جات کا کوئی وزیر جیل کے معائنے کے لئے آرہا ہے۔ میں نے اپنے ذہن میں تیزی سے فرار کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ زیادہ منصوبہ بندی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بس مجھے ایک دم ایکشن کے میدان میں کود پڑنا تھا۔ پھر تخت یا تختہ۔ زندگی یا موت۔!

اس روز ہمیں بھی مشقت پر لگا دیا گیا۔ میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل کے کچے صحن میں جھاڑو دینے اور کوڑا کرکٹ اٹھا اٹھا کر بڑے ڈرموں میں ڈالنے پر لگ گیا۔ دن کے گیارہ بجے کے قریب جیل کا بڑا آہنی گیٹ کھول دیا گیا۔ چیف وارڈن اور سپرنٹنڈنٹ جیل اور دوسرے اہل کار وغیرہ گیٹ کے اندر باہر قطار میں کھڑے ہو کر وزیر جیل خانہ جات کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا وہ میں نے پہلے سے سوچ لیا تھا۔ چنانچہ میں ہاتھ میں جھاڑو پکڑے کھسک کر اس سائبان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا جہاں گاڑیاں وغیرہ پارک کی جاتی تھیں۔ اتنے میں دور سے ہوٹر کی آوازیں آنے لگیں۔ جیل کے عہدے داروں میں ہل چل سی مچ گئی۔ وہ پھولوں کے ہار اور گلدستے لئے گیٹ کے

قریب آگئے۔ ہوٹروں کی آوازیں قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد چار موٹر سائیکل سوار نمودار ہوئے جو ایک گاڑی کے آگے آگے آہستہ موٹر سائیکل چلاتے آرہے تھے۔ جیسے ہی وزیر جیل خانہ جات کی گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی فضا منتری جی کی جے کے نعروں سے گونج اٹھی۔ سب لوگ وزیر کی گاڑی کے اردگرد ہجوم بنا کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ وزیر کی گاڑی چیف وارڈن کے آفس کے آگے کھڑی ہو گئی تھی۔ پیچھے تین گاڑیاں تھیں ان میں سے ایک وزیر کے باڈی گارڈ کا دستہ تھا دوسری گاڑیوں میں بھی کچھ محکمے کے لوگ اور اخبار نویس بیٹھے تھے۔ یہ تینوں گاڑیاں سائبان کے نیچے آکر کھڑی ہو گئیں۔ باڈی گارڈ رین گنیں اٹھائے۔ وزیر صاحب کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔ دوسری گاڑیوں میں جو لوگ بیٹھے تھے وہ بھی ادھر کو چل دیئے۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق اسی لمحے سے کمانڈو ایکشن شروع کرنا تھا۔ میں نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ جیل کا آہنی گیٹ ابھی تک کھلا تھا اور بند نہیں ہوا تھا۔ تینوں گاڑیاں سائبان کے نیچے خالی کھڑی تھیں۔ ان میں سے دو کے ڈرائیور وہاں سے اس طرف چلے گئے تھے جہاں وزیر صاحب کے استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا اور باری باری ان کے گلے میں ہار ڈالے جا رہے تھے۔ ایک گاڑی کا ڈرائیور گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ یہ دبلا پتلا ہندو تھا۔ میں جھاڑو دیتا ہوا گاڑی کی دوسری طرف آگیا۔ میں نے گاڑی میں جھانک کر دیکھا۔ گاڑی میں چابی لگی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی بھارت میں تیار کی گئی تھی اور سیاہ رنگ کی چھوٹی گاڑی تھی۔ میرے پاس اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ قدرت مجھے اس سے زیادہ وقت دے بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا اسی لمحے کر گزرنا تھا۔ میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ فاصلے پر جیل کے دو چار جمعدار کھڑے تھے۔ ان کی توجہ بھی وزیر کے استقبال کرنے والوں کی طرف تھی۔ میں نے گاڑی کے اندر نگاہ ڈالی۔ میں دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی ہوا کہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک سٹین گن پڑی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ قدرت میرے ساتھ اور کیا مہربانی کر سکتی تھی۔ میں جھاڑو دیتا گاڑی کے عقب میں آگیا۔ یہاں آتے ہی میں نے گاڑی کے ڈرائیور کو آواز دے کر کہا۔

"لالہ جی یہاں آکر دیکھیں۔ گاڑی نیچے سے لیک کر رہی ہے۔"

دبلے پتلے ڈرائیور نے جو بونٹ سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"سر! یہاں آکر دیکھیں۔ نیچے پٹرول گر رہا ہے۔"

ڈرائیور نے تعجب سے کہا۔

"یہاں پٹرول کہاں سے آگیا"

اور سگریٹ ایک طرف پھینک کر گاڑی کے پیچھے آگیا گاڑی کے پیچھے سوائے ہم دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے اس ڈرائیور کو صرف ایک ضرب لگانی تھی۔ میری قسمت کا فیصلہ صرف اس ایک ضرب پر تھا۔ اگر ڈرائیور میری ضرب سے آواز نکالے بغیر گر پڑتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے یا مرجاتا ہے تو میرے سامنے راستہ صاف تھا کیونکہ جیل کا گیٹ ابھی تک کھلا تھا۔ میں گاڑی کے نیچے سر ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔

"تم پیچھے ہٹو مجھے دیکھنے دو۔ کہاں تیل لیک ہو رہا ہے"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"سر نیچے دیکھیں۔ بڑا تیل گر رہا ہے"

ڈرائیور وردی پوش تھا اور اس نے سرکاری ڈرائیوروں والی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اس نے ٹوپی اتاری اور گاڑی کے نیچے دیکھنے کے لئے جھکا۔ جیسے ہی وہ جھکا میں نے اس کی گردن پر اس جگہ جہاں گردن کی ہڈیوں کے مہرے کھوپڑی کی ہڈی میں جا کر مل جاتے ہیں پوری طاقت سے مکا مارا۔ میری ضرب شدید تھی۔ میرے ایسے کسرتی بدن والے تربیت یافتہ کمانڈو کا مکا لوہے کے ہتھوڑے سے کم طاقت والا نہیں تھا۔ ڈرائیور نیچے گر پڑا۔ میں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ بے ہوش ہوا ہے کہ نہیں اس کی ٹوپی جو زمین پر گر پڑی تھی اٹھا کر اپنے سر پر ڈالی اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی انجن سٹارٹ کیا۔ گاڑی گیر کو پیچھے ہٹا کر پہلے گیئر میں ڈالا اور گاڑی کو تیزی سے سائبان کے نیچے سے نکال کر

جیل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار اور گارڈ کے سپاہیوں نے منتری کے ساتھ آنے والی گاڑی پر لگے ہوئے کانگریسی جھنڈے کو دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے۔ جب میں تیزی سے ان کے سامنے سے گاڑی نکال کر گیٹ سے نکلا تو انہوں نے جھک کر گاڑی کے اندر دیکھا۔ میرا کرتا پاجامہ جیل کے قیدیوں والا تھا مگر سر پر ڈرائیور کی کیپ تھی۔ ڈرائیور کی کیپ نے انہیں ایک لمحے کے لئے مغالطے میں ڈالا اور اس ایک سیکنڈ کے وقفہ میں میری گاڑی پوری رفتار کے ساتھ گیٹ سے نکل گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم پیچھے کیا ہوا۔ کس نے مجھے پہچانا۔ کس نے سائبان کے نیچے ڈرائیور کی لاش دیکھی۔ کون میرے پیچھے بھاگا۔ میں ننانوے فی صدی والی موت کے منہ سے نکل آیا تھا۔ موت اب بھی میرے سر پر ضرور منڈلا رہی تھی۔ لیکن اس کا امکان پچاس فی صد تھا۔ پچاس فی صد میرے نکل جانے کا امکان بھی تھا۔ بڑی سڑک پر پہنچنے سے پہلے جیل کے گیٹ کے آگے جو کچی سڑک تھی اور جس پر سرخ رنگ کی بجری پڑی تھی اور کہیں کہیں منتری جی کے استقبال کے لئے جھنڈیاں بھی لگی تھیں وہ سڑک میری گاڑی نے "آناً فاناً" پار کرلی۔ سڑک کی بجری گاڑی کے نیچے زور زور سے ٹکرا کر شور مچاتی رہی اور میں گاڑی کو لے کر بڑی سڑک پر آگیا۔

یہاں سے میں اس سڑک پر جانا چاہتا تھا جو کمپنی باغ کی مال روڈ کہلاتی تھی اور جہاں آگے جا کر ایک سڑک مجیٹھ کی طرف نکل جاتی تھی۔ اس سڑک کا نام بھی مجیٹھ روڈ ہی تھا مگر جلدی میں اور تیز رفتاری میں گاڑی اس طرف نہ نکال سکا اور گاڑی اس سڑک پر پڑ گئی جو ڈاک خانے کی اور ریالٹو سینما کے آگے سے ہوتی ہوئی بڑے ہسپتال کی طرف چلی جاتی تھی۔ اس طرف سے بھی میں بڑے ہسپتال سے آگے جا کر مجیٹھ روڈ کی طرف نکل سکتا تھا۔ سڑک پر ٹریفک ضرور تھی مگر میں نے گاڑی کی رفتار کم نہ کی اور جس قدر مہارت سے ٹریفک میں سے گاڑی کو نکال سکتا تھا نکال کر لئے جا رہا تھا۔

کرسٹل ریسٹوران کے پاس آکر میں نے گاڑی کو بڑے ہسپتال کی طرف ڈال دیا۔ یہاں آکر پہلی بار مجھے پیچھے موٹر سائیکلوں کے ہوٹر کی آوازیں سنائی دیں۔ جیل خانہ جات

کے منتری کے موٹر سائیکل سوار میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ میں نے اس گاڑی کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں گاڑی سے نکل کر پیدل نہیں چل سکتا تھا۔ میں قیدیوں کے لباس میں تھا۔ کہیں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ میں نے ہسپتال کے دروازے کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہاں دو تانگے اور ایک رکشا کھڑا تھا۔ میں نے گاڑی ہسپتال کی کمپنی باغ کی سائیڈ والی دیوار کی طرف گھما دی۔ اس طرف آگے جا کر ہسپتال کا دوسرا چھوٹا دروازہ آتا تھا۔

میری نظر دور سے ایک ایمبولینس پر پڑی جو آکر ابھی ابھی کھڑی ہوئی تھی اور اس کے اندر سے تین آدمی ایک سٹریچر پہ پڑے مریض کو نکال کر ہسپتال کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایمبولینس کا ڈرائیور اتر کر سٹریچر کے ساتھ ہی ہسپتال کے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا کہ اس کے دوسرے پٹ کو بھی کھول دے۔ میں نے تیزی سے قریب جا کر گاڑی کو بریک لگائی۔ گاڑی سے نکل کر ایمبولینس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے گیئر لگا کر ریس دی اور ایمبولینس کو لے کر رام باغ کی طرف گاڑی کو ڈال دیا۔ میں ڈرائیوروں والی ٹوپی اتار کر دوسری سیٹ پر رکھ دی تھی۔

اس علاقے میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔

میں گاڑی کو لے کر کمپنی باغ کی سڑک پر پوری رفتار سے چلاتا چھوٹی نہر کے پل پر سے ہوتا ہوا مجیٹھ روڈ پر نکل آیا۔ اب موٹر سائیکلوں کے ہوٹروں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ان لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہاں سے آگے مجھے سارے راستے کا علم تھا۔ مجیٹھ روڈ پر میں ایمبولینس کی گاڑی کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔ جو کوئی دیکھتا یہی سمجھتا کہ میں کسی مریض کو ہسپتال لئے جا رہا ہوں۔ میں اس ایمبولینس سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہسپتال کے چھوٹے دروازے پر منتری کی گاڑیوں کے ساتھ آنے والی پولیس کی گاڑی کو خالی دیکھ کر وہ لوگ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں وہاں سے ایمبولینس لے کر فرار ہو گیا ہوں۔ مگر مجیٹھ روڈ پر کوئی دوسری گاڑی کہیں نہیں تھی۔ وہاں یا تو ایک دو رکشا نظر آئے یا بیل گاڑیاں چلی جا رہی تھیں۔ یا دو تین سکھ

سائیکل پر سوار چلے جا رہے تھے۔ میں پرانے پل پر سے بھی گزر گیا۔ مجیٹھ روڈ چھوٹی سڑک تھی جس کی دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ ہوٹروں کی آوازیں بالکل سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں سامنے لگے آئینے میں سے برابر پیچھے دیکھ لیتا تھا۔ پیچھے سڑک دور تک خالی تھی۔ میں نے ایمبولینس کی رفتار ہلکی کر دی اور ایک طرف گھما کر اسے جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ مجھے ایمبولنس کے اندر والی آمنے سامنے کی سیٹوں پر کچھ سفید چادریں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اندر گھس کر انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہاں مجھے کھدر کا کرتا پاجامہ مل گیا شاید کسی مریض کا اتارا ہوا تھا۔ میں نے قیدیوں والے کپڑے اتار کر کھدر کا کرتہ پاجامہ پہن لیا اور ایمبولنس کو چلاتا وہاں سے بھی آگے نکل گیا۔

آگے کچھ فاصلے پر بڑی نہر کا ریلوے پل تھا۔ اس پل پر سے ریل گاڑی گزرتی تھی۔ اس وقت پل خالی تھا۔ میں پھاٹک عبور کر کے پل کی دوسری طرف آ گیا۔ وہاں سڑک کچی اور مزید چھوٹی ہو گئی تھی۔ یہ کچی سڑک مجیٹھ قصبے میں سے گزرتی ہوئی آگے گورداسپور کی طرف جاتی تھی۔ ایمبولینس کو وہاں چھوڑ کر پیدل چلنا خطرناک تھا۔ میں گاڑی کی رفتار ہلکی کر کے اسے کچی سڑک پر آگے بڑھاتا گیا۔ کھیتوں میں سکھ کسان ہل چلاتے اور کہیں مویشیوں کا چارہ کاٹتے نظر آ رہے تھے۔ ایمبولنس ان کے قریب سے گزرتی تو وہ آنکھیں اٹھا کر ایمبولینس کی طرف دیکھتے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

مجیٹھ قصبہ آ گیا۔ مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ چھوٹی شہید بہن کلثوم یاد آ گئی۔ اپنے مرحوم والد صاحب یاد آ گئے۔ دل کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ مجیٹھ گاؤں بھی پیچھے رہ گیا۔ یہاں سے کچی سڑک گورداسپور جانے والی پکی سڑک سے آ کر مل جاتی تھی۔ میں ایمبولینس کو لے کر پکی سڑک پر آ گیا۔

دور سے ایک ریلوے سٹیشن کو دیکھا جہاں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ انجن کا رخ گورداسپور کی طرف تھا۔ میں نے گاڑی کو کھیتوں میں چھوڑ کر ٹرین میں سوار ہو جانے کا فیصلہ کیا اور ایمبولینس کو تیزی سے چلاتا ریلوے سٹیشن کے قریب کھیتوں کے کنارے

جھاڑیوں کی اوٹ میں روک دیا۔ میں جھاڑیوں میں سے ہو کر ریلوے لائن پر آگیا اور سٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ ٹرین کھڑی تھی۔ یہ چھوٹا سا دیہاتی سٹیشن تھا۔ مسافر ڈبوں میں چڑھ رہے تھے۔ انجن نے سیٹی بجائی۔ میں ریلوے لائن پر دوڑ پڑا۔ دوسری طرف انجن کی چھک چھک کی آواز بلند ہوئی اور ٹرین آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ میں اپنی رفتار بھی تیز کر دی اور گاڑی کے آخری ڈبے میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ گارڈ کا ڈبہ تھا۔

گارڈ سکھ تھا۔ وہ ڈبے کے دروازے پر کھڑا انجن کی طرف منہ کر کے سبز جھنڈی ہلا رہا تھا۔ مجھے اسی نے ہاتھ سے پکڑ کر ڈبے میں سوار کرایا تھا۔ کہنے لگا۔

"اوئے ماماں گھروں چھیتی نکل آنا تھا۔"

میں نے کہا۔

"سردار جی دیر ہو گئی"

میں گارڈ کے لکڑی کے بڑے بکس کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ سکھ گارڈ اس وقت تک دروازے میں ہی کھڑا سبز جھنڈی ہلاتا رہا جب تک کہ گاڑی پلیٹ فارم سے نہیں نکل گئی۔ پھر وہ جھنڈی لپیٹ کر دروازہ بند کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر رجسٹر کھول کر اس پر کچھ اندراج کرنے لگا۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

رجسٹر ایک طرف رکھ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے تم؟"

میں نے کہا۔

"جی جانا تو مجھے جموں ہے سردار جی۔ پتہ نہیں یہ گاڑی کہاں تک جاتی ہے"

سردار نے سخت لہجے میں کہا۔

"تو تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ تم کون سی گاڑی میں سوار ہوئے ہو؟ اوئے ٹکٹ لیا ہے تم نے؟

میں نے کہا

"جی نہیں۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا"

گارڈ نے اپنی وردی والی بش شرٹ کی بڑی جیب میں سے کاپی نکالی اور بولا۔

"نکالو دس روپے بارہ آنے۔ میں تمہیں ابھی جموں کا ٹکٹ بنا دیتا ہوں چلو۔ میں تم سے آدھا جرمانہ لے لوں گا۔ نکالو نو روپے"

میں نے یونہی اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا اور حیران ہو کر کہا۔

"سردار جی میرے پاس دس روپے کا نوٹ تھا۔ بھاگتے ہوئے لائن پر گر گیا ہے"

سکھ گارڈ نے میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ بولا۔

"میں تم ایسے داؤ سفر کرنے والوں کی ایک ایک رگ پہچانتا ہوں۔ اگلے سٹیشن پر میں تمہیں پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔"

میں نے ایک ایسی دردناک گھریلو کہانی گھڑ کر اسے سنائی کہ سادہ دل سکھ گارڈ کا دل پسیج گیا۔ کہنے لگا۔

"کوئی گل نہیں کاکا۔ میں تمہیں اپنے ڈبے میں بٹھا کر جموں لے چلوں گا فکر نہ کرو"

میں اس اعتبار سے مطمئن ہو گیا کہ میں ٹرین میں بغیر ٹکٹ محفوظ رہ کر سفر کر سکوں گا۔ لیکن اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ آگے کسی سٹیشن پر پولیس ٹرین کو محاصرے میں لے کر مجھے گرفتار نہ کرے۔ مگر یہ خطرہ ہر حالت میں مجھے مول لینا ہی تھا۔

ٹرین چلتی رہی۔ سکھ گارڈ بڑا رحم دل آدمی ثابت ہوا۔ اس نے ایک سٹیشن پر مجھے کھانا بھی کھلایا۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے ٹرین جموں توی کے سٹیشن پر پہنچ گئی۔ میں نے سردار صاحب کا شکریہ ادا کیا اور نمستے کہہ کر ٹرین سے اترنے لگا تو سکھ گارڈ بولا۔

"اوئے ٹھہر جاؤ۔ گیٹ سے کیسے باہر نکلو گے؟ تمہارے پاس تو ٹکٹ نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں باہر نکال دوں گا۔"

سکھ گارڈ مجھے اپنے ساتھ سٹیشن کے باہر نکال کر لے گیا اور کہنے لگا۔

"آگے سے کبھی دوڑ کر گاڑی پکڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب جاؤ۔"

اس وقت رات ہو چکی تھی۔

میں رات جموں میں نہیں گذارنا چاہتا تھا۔ اور رات کو سری نگر کی طرف کوئی لاری نہیں چلتی تھی۔ میں ٹرکوں کے اڈے پر آگیا کہ کسی ٹرک میں بیٹھ کر ہی اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ ٹرک مال لے کر جموں سے رات کو بھی سری نگر کی طرف چلتے رہتے تھے۔ ٹرکوں کے اڈے پر صرف ایک ٹرک کھڑا تھا جس طرف خالی بوریاں یعنی باردانہ لادا جارہا تھا۔ ایک آدمی اپنی نگرانی میں مال لدوا رہا تھا۔ اس نے جموں کے ہندوؤں والی ٹوپی اور تنگ موری کا پاجامہ اور چھوٹا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس کے پاس ایک سکھ بھی کھڑا تھا جو ٹرک کا ڈرائیور لگتا تھا۔ میں ہندو لالے سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ وہاں سے ہٹ گیا تو میں نے سکھ ڈرائیور سے کہا کہ سری نگر میں میری ماتا جی سخت بیمار ہیں۔ میرے پاس لاری کا کرایہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے ساتھ سری نگر تک لے جائیں آپ کی بڑی کرپا ہو گی سکھ نے تھوڑی تھوڑی پی رکھی تھی۔ ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"کیا ناؤں ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔

"نرائن داس۔ جموں اپنے بھیا جی سے ملنے آیا تھا۔ وہ تو ملا نہیں۔ سارے پیسے خرچ ہو گئے۔"

سکھ ڈرائیور نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جوان آدمی ہو کہیں محنت مزدوری کر کے کرایہ بنا لیتے۔ چلو کوئی بات نہیں تمہیں ٹرک کے پیچھے بیٹھنا ہو گا۔ آگے میرے ساتھ میرا کلینزر اور ٹھیکدار بیٹھے گا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"آپ کی بڑی کرپا ہے سردار جی۔ میں پیچھے ہی بیٹھ جاؤں گا۔"

ٹرک تہہ در تہہ لگی خالی بوریوں سے منہ در منہ بھر گیا تھا۔ میں نے پیچھے بوریوں میں اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی اور بیٹھ گیا۔ ٹرک کا پچھلا دروازہ نہیں تھا۔ ایک تین فٹ اونچی لکڑی کا تختہ تھا جو پیچھے لگا دیا گیا۔ میں تختے اور بوریوں کے درمیان بیٹھا تھا۔

ک سری نگر کی طرف چل پڑا۔

عام لاریاں جو جموں سے سری نگر جاتی ہیں وہ راستے میں پیر پنجال یا کد ٹبوت میں رات گزارتی ہیں مگر یہ ٹرک وہ ساری رات اور اگلا سارا دن چلتا رہا۔ دوسرے دن دوپہر کے بد ہم مقبوضہ کشمیر کی وادی میں داخل ہو گئے تھے۔ میں بڑا مطمئن تھا کہ اپنے مجاہد اتھیوں کے پاس پہونچنے والا ہوں۔ ٹرک ایک پہاڑی اتر کر دوسری پہاڑی پر چڑھنے لگتا۔ ایک وادی آتی۔ گذر جاتی۔ پھر دوسری وادی اور گہری گھاٹیاں اوپر سے نظر آنے لیں۔ سڑک تیسرے پہر سری نگر کے نواحی پہاڑی علاقے میں داخل ہوا تو ایک جگہ ل گیا۔ میں ٹرک کے پیچھے بوریوں کے درمیان اونگھ رہا تھا۔ ساری رات کشمیر کی اڑی سرد ہواؤں کے تھپیڑوں نے سونے نہیں دیا تھا۔ بوریاں بندھی ہوئی تھیں ورنہ ان میں سے دو تین بوریاں اپنے اوپر کر لیتا۔ اس وقت ٹرک کی رفتار پہلے ہی ہلکی تھی وہ ایک پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے کے بعد ڈھلان پر اترنے لگا تھا۔ کہ اچانک اسے ک لگے اور وہ آہستہ آہستہ پہاڑی سڑک کی بائیں جانب ٹیلے کی دیوار کے ساتھ آکر گیا۔ راستے میں بھی ٹرک کئی جگہوں پر رکا تھا۔ کہیں محصول دینے کے لئے۔ کہیں ٹیکس دینے کے لئے اور کہیں ڈرائیور اور ٹھیکے دار چائے وغیرہ پینے کے لئے ٹرک لیتے تھے۔

میں یہی سمجھا کہ ڈرائیور نے چائے پینے کے لئے ٹرک کو روکا ہے۔ میں نے سر اٹھا دیکھا۔ عقب میں پہاڑی سڑک پر دونوں جانب کوئی چائے کا کھوکھا یا دوکان نظر نہ ۔ اتنے میں آگے سے بھاری قدموں کی آواز قریب آنے لگی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ ٹ پڑا۔ کیونکہ یہ آواز فوجی بوٹوں کی تھی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چار پانچ ڈوگرہ ی پیچھے آگئے۔ ان میں ایک حوالدار میجر تھا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"کون ہو تم؟ سری نگر کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے بتایا کہ میرا نام نرائن داس ہے۔ سری نگر کے ہندواڑہ محلے میں میری

پنساری کی دکان ہے۔ میں نے کچھ ایسے اعتماد سے یہ باتیں کیں کہ ڈوگرہ حوالدار میجر ٹرک کے ٹھیکدار اور ڈرائیور سے جو ان فوجیوں کے ساتھ ہی پیچھے آئے تھے کہنے لگا۔

"چلو جاؤ۔ آگے کسی فالتو آدمی کو ٹرک پر مت بٹھانا۔ تمہیں پتہ نہیں ادھر کشمیری گوریلے اٹیک کرتے رہتے ہیں۔"

ہندو ٹھیکدار اور سکھ ڈرائیور نے بڑی لجاجت سے کہا کہ وہ آئندہ کبھی کسی فالتو آدمی کو ٹرک پر نہیں بٹھائیں گے۔ ٹرک چل پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مصیبت نازل ہوتے ہوتے دور ہو گئی۔ لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ ٹرک پہاڑی سڑک پر تھوڑی دور تک چلتا رہا۔ پھر ایک طرف ہو کر رک گیا۔ میں نے سوچا کہ پھر ڈوگرہ فوجیوں نے چیکنگ کے لئے روک لیا ہو گا۔ مگر اس دفعہ ڈوگرہ فوجیوں کی بجائے ٹرک کا ڈرائیور اور ہندو ٹھیکدار آ گئے۔ ہندو ٹھیکدار نے مجھے آرڈر دینے کے انداز میں کہا۔

"چلو یہاں اتر جاؤ۔ تمہارے لئے ہم کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتے۔ آگے پھر فوجی چیک پوسٹ ہے۔"

سکھ ڈرائیور کہنے لگا۔

"یہاں نیچے گھاٹی میں ایک راستہ سری نگر کو جا نکلتا ہے۔ ہم تمہیں اس سے آگے نہیں لے جا سکتے۔ فوج زبردست چیکنگ کر رہی ہے۔ چلو اترو یہاں۔"

میں خاموشی سے ٹرک سے اتر پڑا۔ میرے اترتے ہی ٹرک آگے روانہ ہو گیا۔ میں نیچے گھاٹی میں اترنے کی بجائے پہاڑی سڑک پر ایک طرف ہو کر چل پڑا۔ کشمیر کی پہاڑیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ابھی سورج ان پہاڑیوں کے اوپر ہی تھا اور دن کی روشنی تھی۔ ان پہاڑیوں کو میں پہچانتا تھا۔ ان کی دوسری طرف سری نگر کی وادی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مجھے ایک پہاڑی کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ یہ میں نے غلطی کی تھی کہ اس پہاڑی سڑک پر پیدل چل پڑا تھا۔ ڈوگرہ فوجیوں نے کہا تھا کہ ادھر کشمیری گوریلوں کا اٹیک ہوتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ علاقے ڈوگرہ فوجی یونٹ کی فوجی سرگرمیوں کی زد میں تھا اور ان کی فائٹنگ پیٹرول پارٹیاں ضرور آس پاس موجود ہوں گی۔ لیکن میں نے سوچا کہ دوسری

پہاڑی کی ڈھلان پر نیچے گھاٹی میں اتر جاؤں گا۔

میں ایک موڑ گھوم کر پہاڑی سڑک کی دوسری جانب آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے پہاڑی کے سامنے لگے ہوئے تین بہت بڑے فوجی ٹرک کھڑے ہیں۔ دس بارہ ڈوگرہ فوجی سڑک پر برین گنیں لئے کھڑے اوپر پہاڑی کی چوٹی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں وہیں سے واپس ہونے لگا تو ایک فوجی نے مجھے دیکھ لیا اور برین گن کا رخ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"ہالٹ۔ کون ہو تم؟"

میں رک گیا۔ تین فوجی دوڑ کر میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے کہانی گھڑ کر انہیں سنانی شروع کی تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"کشمیری مسلمان ہو؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں جی۔ میں ہندو ہوں۔ میرا نام نرائن داس ہے۔ میں۔۔۔"

دوسرے فوجی نے جو لانس نائیک تھا پہلے فوجی سے کہا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ کشمیری گوریلا ہے۔ اس کی پتلون اتار کر دیکھو"

دوسرے لمحے انہیں میرے مسلمان ہونے کا پتہ چل گیا۔ ایک ڈوگرے نے چلا کر ا۔

"پکڑ لیا ہے گوریلا صاحب۔۔!"

دوسرے فوجی بھی دوڑ کر میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے مجھے مکے اور ٹھڈے مارنے رُوع کر دیئے۔ پھر مجھے گھسیٹتے ہوئے اس طرف لے گئے جدھر ٹرک کھڑے تھے۔ ان کوں میں فوجی نہیں تھے۔ اوپر ترپالیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایمونیشن اور راشن یرہ ہو گا۔ یہ سپلائی کے ٹرک تھے جو آگے وادی میں بھارتی فوجی یونٹوں میں جا رہے ے۔ مجھے اگلے ٹرک میں دو فوجیوں کے درمیان پھنسا کر بٹھا دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ کسی ناک کشمیری مجاہد کی تلاش میں تھے جس کے بارے میں انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ اس جگہ

موجود ہے اور انہوں نے مجھے وہی کشمیری گوریلا سمجھ کر پکڑ لیا تھا۔ ٹرک سڑک پر آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگنے لگے۔ میں اگلے ٹرک میں تھا۔ ہمارے پیچھے دوسرے دونوں ٹرک آرہے تھے۔ میں دو بھارتی فوجیوں کے درمیان پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ تیسرا بھارتی فوجی ٹرک ڈرائیور تھا جو ٹرک چلا رہا تھا۔ ایک فوجی نے میری گردن دبوچ کر مجھے گالی دے کر کہا۔

"تم لوگوں نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ ابھی تمہیں مزا چکھاتے ہیں"

دوسرے فوجی نے کہا۔

"اس کو باہر نکال کر شوٹ کر دو"

پہلے فوجی نے میری گردن چھوڑ دی اور بولا۔

"یونٹ میں لے جا کر پہلے اس سے دوسرے گوریلوں کے ٹھکانے کا تو پتہ چلالیں۔ اس کے بعد اس کی گردن کاٹ ڈالیں گے۔ گولی اس پر ضائع نہیں کریں گے۔"

تینوں بھارتی فوجی ٹرک ایک پہاڑی سے اتر کر دوسری پہاڑی کے گرد سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے کہ اچانک اوپر سے تڑا تڑ فائر آنا شروع ہو گیا۔ ڈرائیور فوراً بریک لگا کر چیخا

"کشمیری گوریلے ادھر بھی ہیں۔ نیچے اتر کر پوزیشنیں سنبھالو۔"

دونوں فوجی مجھے پکڑ کر میرے ساتھ ہی ٹرک میں سے باہر نکل کر جھاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ایک فوجی نے برین گن کی نالی میری گردن کے ساتھ لگا دی تھی۔ دوسرا فوجی اور ٹرک ڈرائیور دونوں اوپر کی طرف فائرنگ کرنے لگے۔ دوسرے ٹرکوں میں جو بھارتی فوجی بیٹھے تھے انہوں نے بھی ٹرکوں سے چھلانگیں لگا دی تھیں اور ٹرکوں سے دور ہٹ کر جھاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں لے کر اوپر دھڑا دھڑ فائرنگ کرنے لگے تھے۔ اوپر سے مشین گنوں کا فائر آرہا تھا۔ گولیاں ٹرکوں سے ٹکرا کر پھٹ رہی تھیں۔ یہ کشمیری مجاہد تھے جو گھات میں بیٹھے ان سپلائی والے ٹرکوں کا انتظار کر رہے تھے۔

اچانک اوپر سے یا علی اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے اور تین چار گرنیڈ آکر ٹرکوں

ے ٹکرائے اور یکے بعد دیگرے دھماکوں سے پھٹے۔ ایک گرنیڈ ٹرک کی ترپال کے اوپر
گرا جس نے ٹرک میں ایک خوفناک دھماکے کے بعد آگ لگا دی اور اس کے بعد اس فوجی
ک میں دھماکے شروع ہو گئے۔ ٹرک کا چھوٹا بڑا ایمونیشن پھٹ رہا تھا۔

اب میں ان بھارتی فوجیوں کا قیدی نہیں تھا۔ میں اپنے اصلی کمانڈو روپ میں آگیا
۔ جس فوجی نے میری طرف برین گن تان رکھی تھی میں نے نیچے سے ہاتھ مار کر اس
برین کو اوپر کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی برین گن کو پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ
ے کو گراہی تھا کہ میں نے اس پر ایک برسٹ مارا۔ وہ اچھلا اور نیچے ڈھلان میں لڑھک
۔ دوسرے دونوں فوجیوں نے اپنی گنوں کا رخ میری طرف کیا ہی تھا کہ میں نے ان پر
گن کی بوچھاڑیں مارنی شروع کر دیں۔ دونوں بھارتی فوجی وہیں الٹے ہو گئے۔ اس
بعد میں سڑک کنارے کی جھاڑیوں میں دوسرے بھارتی فوجیوں کی طرف دوڑا جو پھٹتے
ے ٹرک کے شعلوں اور دھماکوں سے بچنے کے لئے سڑک کی دوسری طرف دوڑ گئے
ر وہاں پوزیشنیں سنبھال کر اوپر کی طرف بے مقصد گولیاں چلا رہے تھے۔ وہ مجھے
ک کی دوسری طرف صاف نظر آرہے تھے اور میری زد میں تھے۔ میں نے برین گن
ی کی اور ان پر اندھا دھند برسٹ فائر کرنے لگا۔ یہ چھ سات فوجی تھے اور میرے
میں تھے۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکا۔

ب نیچے سے بھارتی فوجیوں کی فائرنگ رک گئی تو پہاڑی کے اوپر سے ایک بار پھر
ر اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا اور میں نے دس بارہ کشمیری حریت پرست گوریلوں کو
ں کی آڑ لیتے بکھری ہوئی پوزیشن میں نیچے اترتے دیکھا۔ ایک بھارتی فوجی ٹرک
ں جل رہا تھا۔ دوسرے دونوں ٹرک اسی طرح کھڑے تھے۔ میں برین گن لے کر
ں سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ میں نے برین گن اوپر اٹھا کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔
یری گوریلے میری طرف آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک دوسرے سے کشمیری میں
نے لگے۔ ایک نے مجھ سے پوچھا۔

"کون ہو؟"

میں نے کہا۔

"اس سوال کے جواب کے پیچھے ایک بڑی لمبی داستان ہے دوستو! بس تم یہی سمجھ لو کہ میں مسلمان ہوں۔ اور تمہارے کمانڈر شیروان کا ساتھی ہوں"

پھر میں نے انہیں اپنا نام بتایا تو وہ جوش میں آکر نعرے لگانے لگے۔ ان میں سے دو نے مجھے پہچان لیا تھا۔ انہوں نے مجھے باری باری گلے لگایا۔ پھر ٹرکوں کی تلاشی شروع ہو گئی۔ دونوں ٹرکوں میں مشین گنیں، سٹین گنیں، راٹ لانچر، راکٹ لانچروں کے راکٹ، مارٹر گنیں، مارٹر گنوں کے گولوں کے کریٹ بھرے ہوئے تھے۔

کشمیری گوریلوں کے لیڈر نے کہا۔

"ان ٹرکوں کو آگے لے چلو۔"

میں بھی ان کشمیری مجاہدوں کے ساتھ ایک ٹرک میں بیٹھ گیا اور جنگی ہتھیاروں سے بھرے ہوئے دونوں ٹرک آگے کی طرف چل پڑے۔ اس وقت سورج سری نگر کی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو گیا تھا اور وادیوں پر ہلکا ہلکا اندھیرا چھا گیا تھا۔ کوئی ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹرکوں کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں دوسرے کشمیر مجاہد بھی ادھر ادھر سے نکل کر آ گئے۔ ٹرکوں میں سے اسلحہ اور جنگی ہتھیاروں کے کری باہر نکال کر اوپر لے جائے جانے لگے۔ اس دوران کچھ مجاہد پیچھے پہاڑی کی ڈھلان جھاڑیوں کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھے رہے کہ اگر پیچھے کوئی بھارتی فوجی گاڑی یا ٹرک آ تو اسے وہیں راکٹ لانچر سے راکٹ فائر کر کے اڑا دیں۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر بھارتی ٹرکوں کا سارا ایمونیشن کشمیری حریت پرست مجاہد کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔ رات میں نے ان کشمیری مجاہدوں کے ساتھ ہی گزاری دوسرے دن ان میں سے دو مجاہد جنہوں نے مجھے کمانڈر شیروان کے پاس کئی بار دیکھا مگر میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا مجھے ساتھ لے کر پہاڑی راستوں میں سے گزرتے ہو کمانڈر شیروان کی خفیہ کمیں گاہ میں پہنچ گئے۔ کمانڈر شیراون نے مجھے دیکھتے ہی گلے لیا۔ میں نے شیروان کو اپنی روئیداد مختصراً بیان کی اور کہا۔

"کمانڈر! مجھے بتاؤ ہمارا اگلا کمانڈو مشن کون سا ہے؟"

کمانڈر شیروان نے جیب سے چھوٹا سا کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

"آج رات قاضی کنڈ کی پہاڑیوں کی جانب سے ایک بھارتی فوجی کنوائے آ رہا ہے۔ ہمیں گھات لگا کر اسے برباد کرنا ہے"

میں نے کمانڈر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پرجوش انداز میں کہا۔

"انشاء اللہ! یہ بھارتی فوجی کانوائے سری نگر نہیں پہنچ سکے گا۔"

اسی رات کے اندھیرے میں ہم چار کمانڈوز دوسرے کشمیری مجاہدوں کے ساتھ اپنے ٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہماری منزل قاضی کنڈ کی پہاڑیاں تھیں جن میں ایک سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی پہاڑیوں میں سے اتر کر سرینگر کے میدانوں میں داخل ہوتی تھی۔ ہمیں جو اطلاع ملی اس کے مطابق یہ ملٹری ٹرکوں کا کانوائے درہ حاجی پیر کی طرف سے آ رہا تھا۔ یہ کل ڑے ٹرک تھے جن میں دوسرے فوجی ساز و سامان کے علاوہ مارٹر گنوں اور مارٹر توپ ولوں کا بھاری سٹاک سرینگر کی بھارتی چھاؤنی میں لایا جا رہا تھا۔ بھارتی فوجی سرینگر کے ر آس پاس کے گاؤں میں مسلمان کشمیریوں کے مکان مارٹر فائر سے تباہ کرتے تھے۔ گاؤں پر انہیں شک پڑتا تھا کہ یہاں کشمیری حریت پسند چھپے ہوئے ہیں، وہ اس گاؤں اچانک چھاپہ مارتے تھے۔ تلاشی لیتے تھے۔ عورتوں کی بے حرمتی کرتے تھے۔ ذرا سی امت پر مردوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے تھے اور اس کے بعد گاؤں سے کچھ فاصلے پر جا کر ر توپوں کے فائر سے پورے گاؤں کے مکانوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔ چنانچہ ان ں کو راستے میں ہی تباہ کرنا بہت ضروری تھا۔ ہم چار تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ میں، ڈر شیروان اور دو دوسرے کشمیری گوریلے، ہمارے علاوہ تین کشمیری مجاہد تھے۔ یہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھے۔ ہم نے کشمیری کسانوں کا بھیس بدل رکھا ر خچروں پر سوار قاضی کنڈ کی طرف جانے والے پہاڑی راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ں سے کسی نے پرانا کمبل اور کسی نے کھیس جسم کے گرد لپیٹے ہوئے تھے۔ ان کمبلوں

اور کمیسوں کے اندر ہم نے سٹین گنیں چھپا رکھی تھیں۔ ہم ان پہاڑیوں میں سارا دن سفر کرتے رہے۔ رات کو ایک جگہ آرام کیا۔ اگلے روز پھر سفر شروع ہو گیا۔ ہم قاضی کنڈ کے پرانے پل والے موڑ پر پہنچ کر گھات لگانا چاہتے تھے۔ کیونکہ ہماری اطلاع کے مطابق بھارتی کانوائے کو تیسرے دن دوپہر کے بعد وہاں سے گذرنا تھا۔

رات کو تین گھنٹے ہم نے آرام کیا اور منہ اندھیرے خچروں پر سوار ہو کر اپنے سفر پر چل پڑے۔ دوسرے دن شام کو ہم قاضی کنڈ کی پہاڑیوں میں سے گذر رہے تھے۔ کمانڈر شیروان نے دوربین سے اوپر پہاڑی سڑک کو دیکھا اور دوربین مجھے دے کر کہا۔

"اوپر جو سڑک نظر آ رہی ہے اس کے پیچھے پرانا پل ہے جو انگریزوں کے زمانے کا ہوا ہے۔ ہمیں وہاں گھات لگا کر بیٹھنا ہو گا۔"

میں نے دوربین لگا کر دیکھا۔ دور اوپر پہاڑی کے پہلو میں ایک سڑک بل کھاتی گذر رہی تھی۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"پرانا پل یہاں سے پیچھے کتنی دور ہو گا؟ اور کیا وہاں گھات لگانے کے لئے کوئی موزوں جگہ ہو گی"

شیروان بولا۔

"پل کے اوپر ڈھلان پر چنار کے بے شمار درخت ہیں۔ ان درختوں میں بڑی اچھی گھات لگائی جا سکتی ہے۔"

باقی دونوں کمانڈو نے ہمارے خیال کی تصدیق کی اور ہم نے اللہ کا نام لے کر پہاڑی سڑک کی طرف خچروں کو ڈال دیا۔ راستہ کافی دشوار تھا۔ راستے میں درخت تھے جھاڑیاں تھیں۔ چھوٹے بڑے پتھر اور چٹانیں تھیں۔ سیدھا راستہ کوئی نہیں تھا۔ ہمارے خچر ہر قسم کی رکاوٹوں میں سے گذرتے ہوئے پہاڑی کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ علاقے میں کوئی بھارتی فوجی کیمپ نہیں تھا۔ اس لئے ہم آزادی سے سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں راستہ زیادہ لمبا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اوپر سڑک پر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ سورج قاضی کنڈ کی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا جس کی وجہ سے پہاڑ

کی اس جانب جہاں ہم تھے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سڑک پکی تھی اور اس پر سے صرف ایک ٹرک ہی گذر سکتا تھا۔ دو ٹرک برابر برابر ہو کر نہیں گذر سکتے تھے۔ اس سڑک پر پبلک گاڑیوں کی ٹریفک بالکل نہیں تھی۔ صرف فوجی کانوائے ہی آتے جاتے تھے۔ سرینگر سے اگر فوجی کانوائے آتا تھا تو درہ حاجی پیر کی طرف سے آنے والے کانوائے کو وہیں روک لیا جاتا تھا۔ درہ حاجی پیر سے جو کانوائے آتا تھا اس کے لئے سری نگر کے میدانوں تک سڑک پر دوسری کسی گاڑی کو سڑک پر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ یہ سارا کام پرانے پل پر ایک فوجی مورچہ تھا وہاں وائرلیس کے ذریعے انجام پاتا تھا۔

ہم نے سڑک کے اوپر چنار کے درختوں میں ایک جگہ کیمپ لگا لیا اپنے اردگرد درختوں کی شاخیں کاٹ کر مصنوعی جھاڑیوں کا حصار بنا لیا۔ ہمیں وہیں رات گذارنی تھی۔ دوسرے دن اسلحے سے لدے ہوئے فوجی ٹرک دوپہر کے بعد کسی بھی وقت گذرنے والے تھے۔ ہمارے مخبروں نے بتایا تھا کہ یہ چار بڑے ٹرک ہیں۔ ان کے آگے پیچھے ایک ایک سیکورٹی گارڈ کی جیپ ہو گی۔ جس میں مسلح فوجی ہوں گے اور مشین گنیں بھی لگی ہوئی ہوں گی۔ رات ہم نے درختوں کے نیچے کیمو فلاج کر کے بنائے گئے کیمپ میں گذاری۔ دوسرے دن ہم گھات لگا کر بھارتی فوجی کانوائے کا انتظار کرنے لگے۔ دن گذر گیا۔ شام آ گئی مگر کوئی کانوائے نہ آیا۔ کمانڈر شیروان بھی پریشان تھا۔ کہنے لگا۔

"کہیں کانوائے کا ٹائم اور روٹ تو نہیں بدل دیا گیا؟ مگر دوسرا روٹ تو کوئی بھی نہیں اگر کانوائے کے ٹرکوں کو گذرنا ہے تو وہ اسی سڑک پر سے گذر کر سری نگر جائیں گے۔"

"ہو سکتا ہے ٹائم بدل دیا گیا ہو۔ کوئی وجہ ہو گئی ہو۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہی ہیں۔ آج نہیں تو ممکن ہے کل کسی وقت کانوائے آ جائے۔"

جب اس سے اگلا دن بھی گذر گیا اور کانوائے نہ گذرا تو کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"ہمیں اپنا آدمی بھیج کر صحیح صورت حال کا پتہ لگانا چاہئے۔"

چنانچہ اسی وقت ایک کشمیری مجاہد کو تیار کیا گیا کہ وہ پیچھے جا کر معلوم کرے کہ کانوائے کب آنے والا ہے۔ یہ کشمیری مجاہد بھی کشمیری کسان کے بھیس میں تھا اور اس

علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ اسی وقت اپنے مشن پر نکل گیا۔

اس دوران ہم لوگ سڑک کے اوپر گھات لگا کر بیٹھے رہے کہ اگر کانوائے کے ٹرک نظر آجائیں تو ان پر حملہ کر دیا جائے۔ ہمارے پاس سٹین گنوں کے علاوہ دستی بم بھی تھے اور ٹینک شکن راکٹ اور راکٹ لانچر بھی تھے۔ ہم اس روز بھی سارا دن گھات لگائے بیٹھے رہے۔ کوئی کانوائے نہ آیا۔ شام کو ہمارا کشمیری مجاہد واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ یہاں سے بہت پیچھے کنڈال کے شیوا مندر کے قریب پہاڑی تودہ گرنے سے سڑک بند ہو گئی ہے جس کی وجہ سے فوجی کانوائے وہیں رکا ہوا ہے۔

کمانڈر شیروان نے پوچھا۔

"کیا تم نے وہ جگہ دیکھی ہے جہاں پہاڑی تودہ گرنے سے سڑک بند ہو گئی ہے"

مجاہد بولا۔

"جی ہاں۔ میں وہ سارا علاقہ دیکھ کر آیا ہوں۔ سڑک پر پہاڑی تودہ گرنے سے ایک اور پہاڑی بن گئی ہے۔ فوجی جوان مٹی پتھر ہٹانے میں لگے ہوئے ہیں۔"

"اسلحے سے لدے ہوئے فوجی ٹرک کہاں کھڑے ہیں؟"

اس کے جواب میں کشمیری مجاہد نے کہا۔

"ان ٹرکوں پر سے گولہ بارود اور فوجی سازوسامان اتار کر کنڈال کے شیوا مندر کے نیچے سٹاک کر دیا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" کمانڈر شیروان نے پوچھا۔ "کیا شیوا مندر کے نیچے کوئی ایمونیشن ڈمپ ہے؟"

کشمیری مجاہد کہنے لگا۔

"سر! شیوا مندر کے نیچے بہت بڑا ایمونیشن ڈمپ ہے۔ میری اطلاع کے مطابق اسلحہ اور گولہ بارود کے اس ذخیرے میں سے ہی اوپر سیاچین گلیشئر کے بھارتی مورچوں کو ایمونیشن سپلائی کیا جاتا ہے اور کشمیر کے محاذ پر اسی ذخیرے سے گولہ بارود ٹرکوں میں بھر کر کانوائیوں کی شکل میں سری نگر لایا جاتا ہے۔"

کمانڈر شیروان نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں درخت کی شاخوں کو کاٹنے کی بجائے درخت کو ہی جڑ سے اکھاڑ ڈالنا چاہئے کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"بڑا اچھا خیال ہے۔"

پھر میں نے کشمیری مجاہد سے پوچھا کہ شیوا مندر کے تہہ خانے میں کتنی مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود سٹاک کیا ہوا ہو گا۔ اس نے کہا۔

"سر! وہاں ہمارے ایک کشمیری ساتھی نے مجھے بتایا ہے کہ اتنا بڑا ایمونیشن کا ذخیرہ سارے کشمیر میں کسی اور جگہ پر نہیں ہے۔ کشمیر اور سیاچین کے بھارتی مورچوں اور یونٹوں کو اسی ڈپو سے گولہ بارود سپلائی ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑا گولہ بارود کا ذخیرہ ہے۔ اور مندر کے نیچے اس لئے بنایا گیا کہ کسی مخبر کو اس کا علم نہ ہو سکے۔ لیکن آپ کو تو معلوم ہی ہے ہمارے حریت پسند جگہ جگہ موجود ہیں۔"

میں نے کشمیری مجاہد سے ایک اور سوال کیا۔

"اس شیوا مندر میں کس کی پوجا ہوتی ہے۔ شیوا کے نام سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں شوجی کی پوجا ہوتی ہو گی"

"جی ہاں۔ وہاں شولنگ کی پوجا ہی ہوتی ہے۔ شیوجی کی مورتیوں کی بھی پوجا ہوتی ہے اور شیو دیوتا کے سر پر جو کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے اس کی بھی پوجا ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ علاقہ تو دور دراز پہاڑیوں میں واقع ہے۔ پھر پوجا کرنے والے کہاں سے آتے ہیں؟"

کشمیری مجاہد نے جواب دیا۔

"سر! ہر روز شام کے وقت آس پاس کے پہاڑی دیہات میں جو ہندو رہتے ہیں وہ جلوس کی شکل میں ڈھول بجاتے بھجن گاتے مندر میں آتے ہیں اور شیو دیوتا کی پوجا کرنے

کے بعد واپس چلے جاتے ہیں مندر چھوٹا سا ہے مگر سارے علاقے میں بڑا مشہور ہے اس کا ایک مہنت پجاری ہے جو لوگوں سے نذرانے وصول کرتا ہے اور انہیں مٹھائی اور پھول کا شرادھ دیتا ہے۔"

میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"کمانڈر! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میرے ساتھ آؤ"

ہم دونوں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر کیمو فلاج کئے ہوئے کیمپ کے اندر آ گئے۔

ہم زمین پر بیٹھ گئے۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے کمانڈر۔ فیصلہ کرنے اور اس پر عمل کرنے کا وقت ہے۔ میں نے شیوا مندر کے بھارتی ایمونیشن ڈپو کو اڑانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گھات لگا کر ایک ایک دو دو ٹرک اڑانے سے بہتر ہے کہ اسلحہ بارود کا وہ ذخیرہ ہی اڑایا جائے جہاں سے یہ اسلحہ اور بارود ٹرکوں میں بھر بھر کر سیاچین میں پاکستانی فوجیوں اور مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندی کے خلاف استعمال کرنے کے لئے سپلائی کیا جاتا ہے۔"

کمانڈر شیروان بولا۔

"اس کے لئے ہمیں بڑی ہوشیاری سے کوئی پلان بنانا ہو گا۔ کیونکہ اتنے بڑے اسلحہ ڈپو کی حفاظت کے لئے بھارتی فوجی کمانڈ نے سیکورٹی کا زبردست انتظام کیا ہوا ہو گا"

میں نے کہا۔

"اس مشن کے لئے ہمیں ایک مختلف طریقہ کار استعمال کرنا ہو گا۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہے کہ پتہ چل جانے کی صورت میں ہم وہاں پر موجود بھارتی کیمپ کے ہر قسم کے اسلحہ سے لیس فوجیوں کا زیادہ دیر تک مقابلہ کر سکیں"

"تو پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

میں نے کہا۔

"ہم بھیس بدل کر وہاں جائیں گے"

"بھیس تو ہم نے اب بھی کشمیری کسانوں کا بدلا ہوا ہے۔ اور کون سا بھیس بدلیں گے؟"

میرے ذہن میں ایک پورا منصوبہ آ گیا ہوا تھا۔ مگر میں ابھی یہ منصوبہ کمانڈر شیروان کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈر! سب سے پہلے تو ہمیں اپنے دو کمانڈو کو بھیج کر مندر کے ایمونیشن ڈمپ کی سیکورٹی کے بارے میں مکمل سروے کروانا ہو گا کہ وہاں دن کے وقت گارڈ کی تعداد کتنی ہوتی ہے۔ رات کے وقت کہاں کہاں گارڈ متعین ہوتے ہیں۔ اگر کوئی گشتی پارٹی رات کو پٹرولنگ پر نکلتی ہے تو اس کا روٹ کون سا ہوتا ہے۔ ان تمام امور کی ہمارے پاس مکمل رپورٹ ہونی چاہئے اس کے بعد ہی ہم اس مشن پر نکل سکتے ہیں اور اس کے بعد ہی میں تمہیں بتا دوں گا کہ ہمیں وہاں کس بھیس میں جانا ہو گا۔"

کمانڈر شیروان نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس طرح تو دیر لگ جائے گی اور ہو سکتا ہے اس دوران سڑک کی مرمت بھی ہو جائے اور گولہ بارود لے کر ایک کانوائے سری نگر کی طرف روانہ بھی ہو جائے۔ میں نے کہا۔

"ہمارے آدمی کی اطلاع کے مطابق سڑک پر جو پہاڑی تودہ گرا ہے اس کو صاف کرنے میں اور سڑک کو پھر سے ٹریفک کے لئے بحال کرنے میں کم از کم ایک ہفتہ ضرور ے جائے گا۔ اور دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے جہاں سے فوجی ٹرک اسلحہ لے کر سری نگر جائیں۔ ایک ہفتہ بہت ہے۔ ہمیں اگر کل تک شیوا مندر کے بھارتی کیمپ کی مکمل وے رپورٹ مل جاتی ہے تو ہم پرسوں اپنا مشن شروع کر دیں گے۔ میرے اندازے مطابق ہمیں اپنے مشن کے مکمل کرنے میں ایک دن سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

کمانڈر شیروان مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمارے دونوں کمانڈو ابھی سروے مشن پر نکل جاتے ہیں۔ یہ کل پوری رپورٹ لے آئیں گے۔"

ہمارے دونوں کشمیری کمانڈو جو ہمارے ساتھ آئے تھے اسی وقت سروے مشن پر نکل گئے۔ کمانڈوز کے ایکشن فوری ہوتے ہیں۔ وہاں بحث مباحثے نہیں کئے جاتے۔ حکم ملتا ہے اور اس پر ساتھ ہی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ دوپہر کے وقت دونوں کشمیری کمانڈو گئے تھے۔ وہ دوسرے دن صبح صبح ہمارے پاس سیکورٹی کی پوری رپورٹ لے کر واپس بھی آگئے۔ اگر وہ سڑک کے راستے جاتے تو انہیں ٹارگٹ تک پہنچنے اور واپس آنے میں تین دن لگ جاتے۔ لیکن وہ شارٹ کٹ پہاڑی راستوں سے ہو کر گئے تھے اور ایک دن کا راستہ انہوں نے دو گھنٹوں میں طے کر لیا تھا۔

انہوں نے واپس آکر جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق بھارتی کیمپ میں تیس چالیس فوجیوں پر مشتمل صرف ایک کمپنی ہی متعین تھی۔ کیونکہ وہاں سوائے ایمونیشن ڈپو کے اور کوئی دوسری فوی انسٹالیشن یعنی فوجی تنصیبات نہیں تھیں۔ اس کمپنی کے ذمے صرف ایمونیشن ڈمپ کی سیکورٹی کی حفاظت تھی۔ اور چونکہ یہ علاقہ ان کے اندازے کے مطابق کشمیری حریت پسندوں سے بہت دور تھا اس لئے وہاں فوج کی زیادہ نفری تعینات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رپورٹ کے مطابق ایمونیشن کا ذخیرہ شیوا مندر میں جہاں شو دیوتا اور اس کی پتنی پاروتی کی بڑی مورتیاں تھیں ان کے نیچے ایک بہت بڑے تہہ خانے میں سٹاک کیا ہوا تھا۔ یہ تہہ خانہ پہاڑی کے اندر ایک قدرتی غار کی شکل میں تھا جو تین اطراف سے بند تھا صرف ایک طرف سے غار میں جانے کا راستہ تھا جس کا دروازہ مندر میں رکھی ہوئی شیوا پاروتی کی بڑی مورتیوں کے عقب میں بنی ہوئی ایک دیوار میں واقع تھا۔ اس دروازے پر چار بھارتی فوجی پوری طرح مسلح ہو کر چوبیس گھنٹے موجود رہتے تھے۔ اس طرف پوجا کرنے والے ہندو یاتریوں کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مندر کی جس طرف پتھریلی سیڑھیاں تھیں اس کے بالکل سامنے ایک فوجی بیرک تھی جہاں کمپنی کے جوان رہتے تھے۔ ان کا لنگر خانہ بھی وہیں پر تھا اور ٹرک بھی اسی طرف آکر ٹھہرتے تھے اور وہیں ان میں گولہ بارود وغیرہ لاد کر انہیں سری نگر اور سیاہ چین کے بھارتی مورچوں کی طرف روانہ کیا جاتا تھا۔ یہ جگہ سری نگر سے اتنی دور تھی اور اتنی محفوظ تھی

کہ یہاں کسی قسم کا کوئی حادثہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے کشمیری کمانڈو سے پوچھا۔

"جو ہندو یاتری شام کو شیوا مندر میں شولنگ اور شیوا پاروتی کی پوجا کرنے آتے ہیں وہ کہاں آکر ٹھہرتے ہیں؟"

کشمیری کمانڈو نے جواب دیا۔

"انہیں رات کو تو ٹھہرنا نہیں ہوتا۔ شام کے وقت ڈھول ڈمرو بجاتے گاتے ناچتے آتے ہیں۔ مندر میں آکر پوجا پاٹھ کرتے ہیں اور وہیں سے ناچتے گاتے واپس اپنے پہاڑی دیہات کی طرف واپس چلے جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"مندر کے پجاری کی کوٹھڑی کہاں پر ہے؟"

کشمیری کمانڈر نے کہا۔

"اس کی کوٹھڑی مندر کے صحن کے کونے میں ہی ہے۔"

جب میں نے پوری رپورٹ سن لی تو کمانڈو شیروان اور دونوں کشمیری کمانڈوز کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ منصوبہ ایسا تھا کہ اس کی کامیابی کے کافی امکانات تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے علاوہ وہاں کی صورت حال میں دوسرا کوئی منصوبہ کارگر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں تھا کہ ہم کمانڈو اٹیک کر کے پوری انڈین کمپنی کا مقابلہ کر سکتے۔ جبکہ ان کے پاس اسلحے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ابھی دن کا پہلا پہر ہی تھا۔ ہم نے اپنے مشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ منصوبے کے مطابق ہم نے مسلمان کشمیری دیہاتیوں والا لباس اتار کر ہندو دیہاتیوں والا لباس یعنی شلوار کی جگہ تنگ موہری والے پاجامے پہن لئے۔ لمبے کرتے تو وہاں ہندو مسلمان دونوں ہی پہنتے تھے۔ ناگ منی کے جنگلی پودے میں ٹماٹروں ایسا پھل لگتا جس کا گودا سرخ ہوتا ہے۔ یہ بڑا پکا رنگ ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے سروں پر مٹی ڈال کر بالوں کو سادھوؤں کے بالوں کی طرح بنایا۔ چہروں پر بھی تھوڑی تھوڑی راکھ مل لی۔ ماتھے پر ناگ منی کے پھل توڑ کر اس کے سرخ رنگ سے لمبے لمبے تلک لگائے۔ جنگلی پھولوں کے ہار بنا کر گلے میں ڈال لئے یوں ہم

نے بالکل ہندو یاتریوں والا خلیہ بنا لیا۔ باقی کشمیری مجاہدوں کو ہم نے اس جگہ رہنے کی ہدایت کی اور ہم چاروں کمانڈو شیو جی پاروتی کے بھگت بن کر یاتریوں کی شکل میں اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ ہمارے پاس کیا کچھ تھا؟ یہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ ہم چار کمانڈو تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک آٹومیٹک جرمن پستول تھا جس پر سائی لینسر لگے ہوئے تھے۔ ہر پستول میں بیس گولیوں والے لمبے میگزین چڑھے ہوئے تھے۔ ایک ایک کمانڈو چاقو تھا۔ ہمارے ایک کمانڈو ساتھی کے خچر کے ساتھ ایک تھیلا بندھا ہوا جس میں ایک درجن دستی بم۔ چار سٹین گنیں اور ان کے میگزین کی بیلٹس تھیں۔

میرے پاس انتہائی زور دار دھماکے سے پھٹنے اور آگ لگانے والی پلاسٹک ٹیپ تھی جس کی مدد سے میں ترچناپلی کے انڈین نیوی کے جہاز اور ناگ پور کے فائیو سٹار ہوٹل میں تباہی مچا چکا تھا اور انڈین آرمی کی ایک اسلحہ سے بھری ہوئی ریل گاڑی کو بھی بھک سے اڑا چکا تھا۔ یہ پلاسٹک ٹیپ میں نے خود تیار کی تھی اور اس کے لگانے اور چلانے میں مجھے انتہائی مہارت حاصل تھی۔ ہم چاروں خچروں پر سوار ہو کر صبح کے وقت اپنی قاضی کنڈ کی کمیں گاہ بلکہ عارضی جنگلی کیمپ سے نکلے تھے۔ ہمارا چوتھا کمانڈو ساتھی جس کے پاس دستی بموں اور سٹین گنوں والا تھیلا تھا ہم سب سے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر چلا آرہا تھا۔ اس کو ہم نے ہنگامی حالات پیدا ہو جانے کی صورت میں ہمیں حفاظتی چھاتہ مہیا کرنے کے لئے پیچھے رکھا ہوا تھا۔

دوسرا کشمیری کمانڈو آگے آگے تھا اور پہاڑیوں کے شارٹ کٹ راستے پر لے جانے میں ہمیں گائیڈ کر رہا تھا۔ ہم نے کئی گھاٹیاں' درے' کھائیاں اور چھوٹی چھوٹی وادیاں عبور کیں۔ ایک جگہ ہماری بائیں جانب تیز رفتاری سے بہتا ہوا دریا بھی آگیا۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور چلتے رہے۔ پھر ایک جانب پہاڑیوں کے درمیان آکر چڑھائی چڑھنے لگے۔ اس طرح مختصر ترین پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے ہم تین گھنٹوں میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے۔ ہمارے گائیڈ کشمیری کمانڈو نے دور سے ہمیں ایک پہاڑی ٹیلے

کی ڈھلان پر ایک چٹان باہر کو نکلی ہوئی دکھائی جس کے اوپر مخروطی مینار والا مندر تھا۔ مندر کا کلس چمک رہا تھا اور زعفرانی رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہمارے گائیڈ نے کہا۔

"یہی شیو پاروتی کا وہ مندر ہے جس کے نیچے قدرتی پہاڑی تہہ خانے میں ایمونیشن اور فوجی اسلحہ کے انبار پڑے ہوئے ہیں۔"

ہم نے اپنے خچر روک لئے۔ میں نے اور کمانڈر شیروان نے دوربین کی مدد سے شیو پاروتی مندر کو دیکھا۔ اس کے چبوترے پر ہمیں تین سادھو آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ہم نے دوربین خچر کے گلے میں لٹکے ہوئے تھیلے میں چھپا دی اور خچروں کو آگے بڑھا دیا۔ یہ فاصلہ بہت قریب لگتا تھا لیکن وہاں تک پہنچنے میں بھی ہمیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔

شیو پاروتی مندر سے کوئی ایک فرلانگ دور ہی ہم خچروں سے اتر پڑے۔ صرف ہمارا چوتھا کشمیری کمانڈو ساتھی خچر پر بیٹھا رہا۔ ہم نے دوربین والا تھیلا بھی اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے پاس دستی بموں اور سٹین گنوں والا تھیلا پہلے سے ہی تھا۔ کمانڈر شیروان نے اسے ہدایت کی۔

"تم ہم سے دور رہ کر ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے ہمیں اپنی نگاہ پر رکھو گے۔ اگر کوئی ہنگامی صورت پیدا ہو گئی تو تم ہمیں فائرنگ سے کور دو گے۔ جب تک کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہ ہو جائے تم ہمارے نزدیک نہیں آؤ گے۔ تم سمجھ گئے ہو گے؟"

"یس سر! سمجھ گیا ہوں۔"

"اوکے۔ ہم جاتے ہیں۔ تم اس وقت ہمارے پیچھے آنا جب ہم تمہاری نظروں سے اوجھل ہونے لگیں۔ ہم نے اپنے خچر چھوڑ دیں گے۔ ٹارگٹ پر پہنچ کر تم بھی اپنا خچر چھوڑ دو گے۔"

ہم نے خچر چھوڑ دیئے تھے۔ ان خچروں نے اپنے آپ اپنے مالک کے گاؤں پہنچ جانا تھا۔ ہم تین آگے آگے تھے۔ میں' شیروان اور ہمارا گائیڈ تیسرا کشمیری گوریلا۔ ہم پہاڑی راستوں پر پیدل چل رہے تھے۔ ہم سب شیو پاروتی کے یاتریوں کے حلیے میں تھے۔

ہم تھوڑی دیر کے لئے بالکل خاموش ہو گئے۔ ہم میں سے ہر کوئی یہی سوچ رہا تھا
اگر ہم رات کو شب خون مارتے ہیں تو ان چار فوجیوں کو کیسے اپنے راستے سے ہٹایا جا
ہے۔ کمانڈر شیروان نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پلاسٹک بم کا زیادہ سے زیادہ دورانیہ کتنا ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"زیادہ سے زیادہ چھ گھنٹے کا وقفہ دیا جا سکتا ہے۔"

اور کم سے کم؟" کشمیری کمانڈو نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔

"کم سے کم اتنا ہی وقفہ دیا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی بم لگا کر باہر آسکے اور واردات
جگہ سے محفوظ علاقے تک پہنچ سکے"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"اگر ہم ان چاروں سنتریوں کو ہلاک کرتے ہیں تو پلاسٹک بموں کو صبح ہونے
پہلے پھٹ جانا چاہئے۔ اگر ہم انہیں صرف بے ہوش کر کے اندر جاتے ہیں تو دورا
زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں ایسا کرنا نہیں چاہئے۔ ہم کر بھی نہیں سکتے کیونکہ ہو
آجانے کے بعد یونٹ کا عملہ ایمونیشن کی چیکنگ ضرور کرے گا۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں ان لوگوں کو اتنا ٹائم دینے کی کیا ضرورت ہے ہمیں کسی نہ کسی طرح
خانے کے اندر جا کر پلاسٹک بم چپکانے ہیں۔ اس کے بعد صرف آدھ گھنٹے کا وقفہ د
ہو گا۔ آدھ گھنٹے میں ہم ان پہاڑیوں میں کسی محفوظ مقام تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ ا
میں کوئی شک نہیں کہ اتنا بڑا اسلحہ کا ذخیرہ پھٹنے سے پہاڑوں میں زلزلے آنا شروع
جائیں گے"

کمانڈر شیروان نے گردن موڑ کر نیچے پہاڑی نشیب میں دیکھا اور پھر میری طرف
کر کے آہستہ سے بولا۔

"ان سنتریوں تک پہنچنے کے لئے اس مندر سے ہی نیچے اترنا ہو گا۔ دوسرا کوئی راستہ
مجھے نظر نہیں آتا"

کشمیری کمانڈو گائیڈ نے آہستہ سے کہا۔

"سر! دوسری طرف سے ایک پہاڑی پگ ڈنڈی دروازے تک آتی ہے۔ یہ پگ
ڈی کافی چوڑی ہے۔ پیچھے سڑک ہے ٹرک اس سڑک پر آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فوجی
ان اسلحہ اور گولہ بارود کے کریٹ سروں پر اٹھا کر ٹرکوں سے لاتے اور لے جاتے
ں۔"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

یا خیال ہے۔ ہمیں آج رات اٹیک کر دینا چاہئے"

ں اور کشمیری کمانڈو گائیڈ کنکھیوں سے تہہ خانے کے دروازے پر اٹن شن کھڑے بھارتی
تریوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے کشمیری کمانڈو سے پوچھا۔

ہاری کیا رائے ہے؟"

نے کہا۔

"سر! ہم جب بھی اٹیک کریں گے یہاں چار سنتری اسی طرح کھڑے ہوں گے۔ بہتر
کل کی بجائے آج رات ہی حملہ کر دینا چاہئے۔"

میں نے کمانڈر شیروان کا ہاتھ آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔

"اوکے کمانڈر! ہم آج رات اٹیک کریں گے۔ ٹائم رات کے دو بجے کے بعد کا
ہے"

دو بجے کے بعد کا وقت ہم کمانڈو لوگ حملے کے لئے اس لئے رکھا کرتے تھے کہ
ان کی فطرت ہے کہ خواہ وہ کیسی ہی سخت ڈیوٹی پر کیوں نہ ہو اس وقت اس پر قدرتی
ر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ جاگنے اور سونے کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ کمانڈر
ان بولا۔

"ٹھیک ہے ہمیں اپنے ریزرو ساتھی کو خبر کر دینی چاہئے"

میں نے کہا۔

"یہ کام میں کرتا ہوں۔ دوسرے میں پیچھے سے جا کر وہ جگہ بھی دیکھ آؤں گا جہاں سے ہمیں پہاڑی پگ ڈنڈی پر سے ہو کر تہہ خانے کے دروازے تک آنا ہوگا"

کمانڈر شیروان بولا۔

"تم پگ ڈنڈی کی جانب سے آؤ گے"

پھر کشمیری کمانڈو گائیڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اور تم پہاڑ کی ڈھلان کی طرف سے اوپر آؤ گے میں اس مندر کی دیوار والی سیڑھیوں سے ٹارگٹ تک پہنچوں گا۔ میں اس طرف والے دو فوجیوں کو اپنے نشانے کی زد میں لے کر دو فائر کروں گا۔ تم دوسری طرف سے آکر دوسرے دو فوجیوں کو ختم کر دو گے۔"

پھر اس نے کشمیری کمانڈو گائیڈ سے کہا۔

"تم آدھا گھنٹہ پہلے نیچے ڈھلان کی جھاڑیوں اور پتھروں میں آکر چھپ کر بیٹھ جاؤ گے۔ اگر ہم میں سے کسی کا نشانہ خطا ہو جائے گا تو اسے تم فائر کر کے ہلاک کر دو گے۔ ریزرو کمانڈو کچھ فاصلے پر ٹیلے کے درختوں میں چھپ کر بیٹھا ہوگا۔ اگر صورت حال بگڑ جاتی ہے تو وہ مشین گن کی اندھا دھند فائرنگ کر کے ہمیں فرار ہونے کا موقع مہیا کرے گا۔ کیونکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے سائی لینسر والے پستولوں کی آواز نیچے بارک میں کسی فوجی جوان کو جگا دے۔ یا کوئی فوجی پہلے سے جاگ رہا ہو اور وہ اسے سن لے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے دو سنتریوں کے گرنے کے ساتھ ہی دوسرے فوجی خطرے بھانپ کر فائرنگ شروع کر دیں اور فائرنگ کی آواز سے بارک کے سارے فوجی بیدار ہو جائیں۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں ہر حالت میں ٹھیک ٹھیک نشانوں پر پستول کے فائر کرنے ہوں گے۔ یہ ہمارے تربیت اور تجربے کا امتحان ہے۔ ہمیں اسی دن کے لئے تربیت دی گئی ہے۔ ہمارا ن

ہر حالت میں بھی خطا نہیں جانا چاہئے اور چاروں بھارتی سنتریوں کو ایک ساتھ گرنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے مر کر گرنے میں دو سیکنڈ کا وقفہ پڑ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ وقفہ پڑ گیا تو نہ صرف یہ کہ ہمارا مشن ناکام ہو جائے گا بلکہ ہم بھی گھیرے میں آجائیں گے۔"

کمانڈر شیروان نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"دوست! یہ دونوں کام ہم دونوں نے کرنے ہیں اور ہم دونوں تجربہ کار تربیت یافتہ نشانے باز ہیں۔ ہمارے پستول سے نکلی ہوئی گولی ٹھیک نشانے پر جا کر لگے گی۔ ہمارے ں سے گولی نکلتی ہی نشانے پر لگنے کے لئے ہے۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو" میں نے کہا

"ءاللہ ایسا ہی ہوگا"

ری کمانڈو گائیڈ کہنے لگا۔

"آپ فکر نہ کریں اگر خدا نہ کرے آپ میں سے کسی کا نشانہ سنتری کے عین وقت ر ادھر ہل جانے سے خطا ہو گیا تو اسے میں اپنے فائر کی زد میں لے لوں گا۔ اول تو ں سنتری چوکیداروں کی طرح ادھر ادھر چل پھر کر پہرہ نہیں دیتے۔ وہ ایک جگہ پر ن کر اٹن شن کھڑے ہوتے ہیں اور یہ بڑا آسان نشانہ ہوتا ہے۔"

اتنے میں شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ اس دوران نیچے سے اردگرد کے گاؤں کے ں کے بھجن کرتن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"دوسرے یاتری آرہے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ اپنے ریزرو کمانڈو ساتھی کے پاس جا کر اپنا سارا پلان بتا دو۔ ہم اسی جگہ بیٹھے ہیں"

میں اٹھا اور جھوم جھوم کر گاتے ہوئے مندر سے باہر نکل گیا۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ علوم تھا کہ اپنا چوتھا ریزرو کمانڈو ساتھی بائیں جانب ٹیلے کی ایک جانب کسی جگہ کر بیٹھا ہوگا۔ میں اسی طرف آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ یہاں اندھیرا تھا پتھر اور جھاڑیاں رخت تھے ایک جگہ سے ہمارا ساتھی کمانڈو اچانک نکل کر میرے سامنے آگیا۔

"سر! کیا بات ہے؟"
اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ میں نے اسے وہیں ایک طرف اندھیرے میں بٹھا لیا اور اسے سارا پلان بتانے کے بعد کہا۔

"آج رات دو بج کر پانچ منٹ پر ہمارا کمانڈو آپریشن شروع ہو جائے گا۔ اپنی گھڑی میری گھڑی سے ملا لو۔"

ہم نے اپنی اپنی گھڑیوں کا وقت ملا لیا۔ میں نے اسے سارا حدود اربعہ بتا دیا اور کہا کہ جب ہم سنتریوں کو ہلاک کرنے کے بعد تہہ خانے میں جائیں گے تو وہ ایسی جگہ پر سٹین گن لے کر گھات میں بیٹھ جائے گا جہاں سے دروازہ اس کے بالکل سامنے ہو گا۔

"ہمیں تہہ خانے کے اندر زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگیں گے۔ ہمیں صرف وہاں حساس جگہوں پر پلاسٹک کی ٹیپیں ہی لگانی ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے سر ہم پوری طرح سے الرٹ رہے گا"

میں نے اسے بتایا کہ آپریشن کے فوراً بعد ہم لوگ نیچے پرانی بارہ دری کے پاس ملیں گے۔ وہاں سے ہم کسی دوسری جگہ جائیں گے۔ اس کے بعد میں واپس مندر میں آگیا جہاں گاؤں کے یاتریوں نے شور مچا رکھا تھا۔ خوب ڈمرو بجا کر رقص کر رہے تھے۔ کمانڈر شیروان اور کشمیری گائیڈ کمانڈو ایک طرف صحن میں بیٹھے تھے۔ ہم سب یاتریوں کے بھیس میں تھے کوئی ہمیں دیکھ کر بالکل نہیں پہچان سکتا تھا کہ ہم کتنے خطرناک کمانڈو ہیں اور وہاں کس قدر خطرناک مشن پر آئے ہوئے ہیں۔

یاتریوں کا ہنگامہ وہاں رات دس بجے تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنے اپنے گاؤں کی طرف چل دیئے۔ ہم بھی مندر سے نکل کر پہاڑی کی دوسری جانب ایک جگہ درختوں کے نیچی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہم اپنے ساتھ چنے اور گڑ لائے تھے۔ ہم تینوں نے چنے اور گڑ کھائے مندر کے نل پر جا کر باری باری پانی پیا اور واپس اسی جگہ پر آ کر چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے بھی اپنی گھڑیاں ملا لی تھیں۔ ہماری تینوں گھڑیوں پر وقت ایک ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ گیارہ بج گئے۔ پھر بارہ بج گئے۔ پھر رات کا

بج گیا۔ ہمیں جنگل میں چھپ کر مشکل سے مشکل حالات میں وقت گذارنے کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ ہمیں نہ کوئی دقت محسوس ہو رہی تھی نہ نیند آ رہی تھی۔ انڈو کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جہاں اسے جاگنا ہوتا ہے وہاں وہ جاگتا ہے وہاں ں کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ جہاں اسے سونا ہوتا ہے وہ لکڑی کے شہتیر کی طرح ہے اور سو جاتا ہے۔ پھر اسے دین دنیا کی کوئی خبر نہیں ہوتی اور ایک گھنٹہ سو کر بارہ ں کے جگراتے کی نیند پوری کر لیتا ہے۔ اس وقت پاکستان کے نوجوانوں کو ایسے ہی بننے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے دشمن بہت ہیں۔ دوست کم ہیں۔ اسے شمنوں سے ہوشیار رہ کر اپنے وطن پاکستان کی حفاظت کرنی ہے۔

جب رات کے ٹھیک دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تو ہم اپنی اپنی گھڑیوں کی چمکتی ہوئی ں کو دیکھ رہے تھے۔ جب سوئی نے پانچ منٹ ظاہر کئے تو ہم اللہ کا نام لے کر اٹھ ہوئے۔ اپنے اپنے پستول ہم نے پندرہ منٹ پہلے ہی چیک کر لئے تھے۔ ہم تینوں دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ خدا کو یاد کیا۔ کلمہ شریف پڑھا میں نے آہستہ سے کہا۔

'دوستو! ہم اسلام کی حرمت کشمیر کی آزادی اور پاکستان کی سلامتی کے مشن پر جا ں۔ زندہ رہے تو پرانی بارہ دری میں ملاقات ہوگی۔ مر گئے تو اگلے جہان میں ملیں

ا کرو کہ اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو اپنے ٹارگٹ کو مار کر شہید ہوں۔ اللہ بیلی!"

ات کے اندھیرے میں ہم تینوں اپنی اپنی پوزیشنوں کی طرف نکل گئے۔ کمانڈر کو مندر کی جانب سے پہاڑی ڈھلان پر نیچے اتر کر اپنے ٹارگٹ کے دو بھارتی کو فائر کر کے مارنا تھا۔ مجھے پگ ڈنڈی کی طرف سے آ کر دوسرے دو سنتریوں کو تا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کی پوزیشنوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کوئل کی آواز ائر کرنے کا وقت مقرر کرنا تھا۔ کوئل کی آواز کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان نے اپنی ے دو سنتریوں کو مار گرانا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی طرف کے دو سنتریوں کرنے تھے۔ ہم لوگ اندھیرے میں بھی نشانے پر فائر جھونکنے میں ماہر تھے۔ ہمیں

اندھیری راتوں میں اپنے ٹارگٹ پر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے کی سخت تربیت دی گئی تھی۔ میں اپنی پوزیشن پر جا کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ مجھے ذرا نیچے تہہ خانے کے دروازے والی ذرا باہر کو نکلی ہوئی چٹان کا چبوترہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں چاروں سنتری دو ایک جانب اور دو دروازے کی دوسری جانب اٹن شن کھڑے تھے۔ ان کی سٹین گنیں ان کے ہاتھوں میں تھیں مجھے یقین تھا کہ کمانڈر شیروان ہی اور ہمارا کشمیری گائیڈ کمانڈر بھی اپنی اپنی پوزیشنوں پر موجود ہوں گے۔ میں نے الٹی گنتی شروع کر دی۔ دس سے نو آٹھ اور پیچھے کی طرف گنتی کرنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے اپنی طرف کے دونوں سنتریوں کو نشانہ میں لینے کی مشق کر لی تھی۔

ٹھیک جب الٹی گنتی کرتے کرتے میں نے اپنے منہ سے کوئل کی ایسی آواز نکالی جیسے بڑی دور کسی درخت پر کوئل بولی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اللہ کا نام لے کر اپنی طرف کے دونوں اٹن شن کھڑے بھارتی سنتریوں میں سے پہلے ایک کو پستول کی زد میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے دوسرے سنتری پر فائر کر دیا۔ مجھے اپنے پستول کے بند فائر کی آواز کے ساتھ دو اور فائروں کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف کے دونوں سنتری بھی ایک پیچھے کو اور دوسرا منہ کے بل آگے کو گر پڑا۔ یہ دونوں فائر کمانڈر شیروان نے کئے تھے جو ٹھیک ٹارگٹ پر جا کر لگے تھے۔

جیسے ہی چاروں سنتری گرے ہم جھاڑیوں اور پتھروں کی اوٹ سے نکل کر نیچے چبوترے پر آ گئے۔ ہم نے سب سے پہلے گرے ہوئے بھارتی سنتریوں کو چیک کیا۔ اندھیرے میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ انہیں گولیاں کہاں لگی تھیں مگر ان کی نبضیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ مر چکے تھے۔

ہم نے انہیں گھسیٹ کر اندھیرے میں ایک طرف ڈال دیا اور دروازے کو دیکھا۔ دروازہ لوہے کا تھا اور تالا لگا ہوا تھا۔ کمانڈر شیروان نے قمیض کے اندر سے لوہے کا چھوٹا راڈ نکالا۔ اسے تالے کے کنڈے میں ڈال کر اپنی طرف کو جھٹکا دیا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ پتھر کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ نیچے ایک کافی بڑا قدرتی غار تھا جہاں ہر

قسم کا فوجی اسلحہ گولہ بارود اور مارٹر گنوں کے گولے اور مارٹر گنیں، گرنیڈوں کے کریٹ اور راکٹ اور راکٹ لانچر بھاری تعداد میں تھے، اتنا اسلحہ اور گولے بارود کا ذخیرہ میں نے بھارت کی کسی چھاؤنی کے ایمونیشن ڈمپ میں نہیں دیکھا تھا۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔

میں نے جیب سے سیاہ رنگ کی پلاسٹک کی ٹیپ نکالی جو چوڑی سکاچ ٹیپ کی طرح رنگ کی شکل کی تھی۔ اس ٹیپ کے ساتھ انتہائی دھماکہ خیز مواد چمٹا ہوا تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"تم اسی جگہ ٹھہرو۔ میں ٹیپ لگا کر آتا ہوں"

شیروان کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ دروازے کے پاس ہی ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں مدھم روشنی والا بلب روشن تھا۔ میں نے خاص خاص مقامات پر دھماکہ خیز پلاسٹک کی ٹیپ چپکائی اور کمانڈر شیروان کے پاس تیزی سے آ کر کہا

"نکل چلو۔ کام ہو گیا ہے۔"

ہم نے دروازے کو آہستہ سے بند کیا اور اندھیرے میں جھک کر چلتے ہوئے اوپر ٹرک کی طرف جانے کی بجائے نیچے پہاڑی کے نشیب میں اترنے لگے۔ ڈھلان اترنے کے بعد ہمارا ریزرو کمانڈو بھی آ گیا کہنے لگا۔

"کیا کام ہو گیا؟"

"ہاں ہمارے پیچھے پیچھے ہمیں کور کر کے چلے آؤ"

ہم جتنی جلدی اترائی اتر سکتے تھے اترتے چلے گئے۔ ٹیلے کی ڈھلان ختم ہو گئی۔ کمانڈر شیروان نے مجھ سے پوچھا۔

"پلاسٹک بموں کا کتنا ٹائم رکھا ہے تم نے؟"

میں نے کہا۔

"صرف آدھا گھنٹہ"

"میرے خدا! یہ تو بہت تھوڑا وقت ہے" کمانڈر شیروان بولا

میں نے کہا۔

"میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا یہ میری مجبوری تھی"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"بیس منٹ ابھی ہیں۔ اس دوران میں ہم کافی دور نکل جائیں گے۔"

ہم تینوں نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ ہم پہاڑی کی اترائی اتر چکے تھے۔ پھر ایک درے میں داخل ہو گئے۔ یہاں چٹانوں کے درمیان بڑا تنگ اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا راستہ تھا۔ اندھیرے میں ہم جھاڑیاں ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک ٹیلے کا موڑ گھومے تو آگے چھوٹی سی وادی آگئی جہاں ستاروں کی روشنی میں سفیدے کے چھریرے چھریرے اوپر کو اٹھے ہوئے درختوں کی قطار نظر آئی۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہمیں یہاں رک کر ٹارگٹ کے اڑنے کا انتظار کرنا چاہیئے"

ہم تینوں ایک جگہ زمین پر بیٹھ گئے۔ میرے حساب سے پلاسٹک بموں کو پھٹ کر اسلحہ کے سارے ذخیروں کو تباہ کرنے میں صرف دو منٹ باقی رہ گئے تھے۔ کمانڈر شیروان اور میں اندھیری رات میں بائیں جانب دوسری پہاڑی کے اوپر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

اچانک ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی زمین ہلنا شروع ہو گئی۔ ہم تینوں کمانڈو زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ گئے۔ ہم نے سر اٹھائے ہوئے تھے اور اندھیرے میں اندازے سے شیو پاروتی مندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس طرف بلا کا چمک پیدا ہوئی کہ ہماری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ پھر ایک کڑاکا ہوا اور مندر کی جانب جیسے پہاڑ پھٹ گیا اور اس میں سے شعلے نکل کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ اب ایک قیامت آگئی تھی۔ اتنے زور دار دھماکے ہو رہے تھے جیسے پہاڑیاں اور ٹیلے پھٹ رہے ہوں۔ راکٹ شوکریں مارتے اوپر کو فائر ہو رہے تھے۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ آگ کے شعلوں کا رنگ کبھی سرخ کبھی نیلا اور کبھی سفید ہو رہا تھا۔ زمین ہل رہی تھی۔ زمین کے اندر گڑگڑاہٹ کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ جس ٹیلے کے نیچے گولہ بارود کا ذخیرہ تھا وہ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ شیو پاروتی کا

مندر بھی ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

کمانڈر شیروان نے بے اختیار نعرہ لگایا

"اللہ اکبر! یا علی"

اس کے جواب میں ہم نے بھی بے اختیار نعرہ لگایا

"اللہ اکبر! یا علی"

آسمان پر آتش بازی کا منظر تھا۔ نیلے سرخ سفید شعلوں نے سارے علاقے کو دن کی طرح روشن کر دیا تھا۔ کمانڈر شیروان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے نکل چلنا چاہیئے"

اس دوران ہمارا چوتھا ریزرو کمانڈو بھی ہمارے پاس آگیا تھا۔ ہم اٹھے اور پہاڑی کی اترائی اترنے لگے۔ ہم تیز تیز اتر رہے تھے اور جھاڑیوں پتھروں کو پھلانگتے ہوئے جا رہے تھے۔ یہ شارٹ کٹ راستہ تھا۔ آدھے گھنٹہ میں ہم پہاڑی کی دوسری جانب ایک سڑک پر نکل آئے۔ آسمان شعلوں سے اسی طرح روشن تھا۔ دھماکوں کی آوازوں سے اردگرد کی پہاڑیوں میں ایسی گونج پیدا ہو رہی تھی جیسے سارے علاقے کی پہاڑیاں آتش فشاں بن کر پھٹ رہی ہوں۔ اب دور سے مشین گن فائر کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ بھارتی کیمپ کے فوجی شاید اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو کر ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ یہ سڑک وہی تھی جس پر سے بھارتی فوجی کانوائے ایمونیشن کی سپلائی لے کر سری نگر جایا کرتے تھے۔ سڑک آگے جا کر نیچے اترائی میں اتر گئی تھی۔

نیچے وادی شروع ہو جاتی تھی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ کسی کسی وقت ایمونیشن کے پھٹتے گولوں کی وجہ سے آسمان پر چمک پیدا ہو جاتی تھی جس سے وادی ایک لمحے کے لئے روشن ہو کر ہمیں راستہ دکھا دیتی تھی۔

سری نگر کی وادی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم دو کمانڈو سڑک کی ایک جانب اور دو کمانڈو سڑک کی دوسری جانب چل رہے تھے۔ ہمارا ریزرو کشمیری کمانڈو جس کے

پاس سٹین گنیں اور دستی بم تھے وہ ہم سے تھوڑا ہٹ کر اس طرح چل رہا تھا کہ سڑک پر کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ وہ خطرناک صورت پیدا ہو جانے کی صورت میں ہماری حفاظت کے لئے ہم سے فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔ اچانک سامنے سڑک کے موڑ پر کسی ٹرک کی آواز آئی۔ پھر اس کی بتیاں نظر پڑیں۔ ہم جلدی سے سڑک کنارے جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہ ایک فوجی ٹرک تھا جو پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور ٹرک آ رہا تھا۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے دیکھ رہے تھے۔ پورے چار فوجی ٹرک تھے جن میں فوجی مشین گنیں لگائے کھڑے تھے۔ ٹرک بڑی تیزی سے آگے نکل گئے۔ یہ اس طرف جا رہے تھے جدھر سے دھماکوں کی آوازیں اور شعلوں کی چمک ابھی تک آسمان پر بجلی کی طرح کوند رہی تھی۔

جب فوجی ٹرک گزر گئے تو ہم سڑک کو چھوڑ کر نیچے گھاٹی میں اتر گئے۔ یہاں سے ہماری خفیہ پناہ گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ جب ہم پناہ گاہ میں پہنچے تو ہمارے مجاہد حریت پسند ساتھی جاگ رہے تھے۔ وہ دھماکوں کی ہلکی ہلکی گونج سن رہے تھے اور آسمان پر چمکتی روشنی کو دیکھ رہے تھے۔ ہم نے جاتے ہی نعرہ لگایا۔

"اللہ اکبر یا علی!"

پناہ گاہ نعروں کی آواز سے گونج اٹھی۔

کمانڈر شیروان نے ہم سب کو کامیابی سے مشن مکمل ہو جانے پر مبارک باد دی اور کہا

"اللہ کی مدد ہمارے ساتھ تھی۔ ورنہ یہ ٹارگٹ اتنا آسان نہیں تھا۔ اب کم از کم ایک مہینے تک یہاں بھارتی فوج کو ایمونیشن کی تازہ سپلائی نہیں مل سکے گی اور یہی ہمارا مشن تھا"

میں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ بھارتی فوج اس تباہی کا بدلہ سری نگر کے دیہات میں کشمیری مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا کر اور معصوم کشمیریوں کو شہید کر کے لے گی

کمانڈر شیروان بولا۔

"ہمیں اس کے مقابلے کے لئے بھی تیار رہنا ہوگا ابھی تم سب لوگ سو جاؤ۔ صبح دیکھیں گے انڈین آرمی کیا کرتی ہے اور ہمیں اس کے جواب میں کیا کارروائی کرنی ہوگی"

ہم تینوں کمانڈو وہیں زمین پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی ہم نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ دن کافی نکل آیا تھا جب کمانڈر شیروان نے اپنے غار سے نکل کر ہمیں جگا دیا۔ اس کے ساتھ ایک کشمیری کمانڈو بھی تھا جس نے سٹین گن اٹھا رکھی تھی۔

کمانڈر شیروان میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انڈین آرمی کی ایک یونٹ کے فوجی وادی کے دیہات میں مکانوں کو مارٹر گنوں کے فائر سے تباہ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہئے۔"

کمانڈر شیروان بولا۔

"ہمارے ساتھی نیچے سڑک پر جیپ میں تیار بیٹھے ہیں۔ تم بھی نیچے آجاؤ۔"

میں اسی طرح اٹھا۔ کونے میں رکھی ہوئی سٹین گن اٹھائی اور اللہ پاک کے نام کا ورد کرتا پناہ گاہ سے نکل کر گھاٹی اتر کر نیچے کچی پہاڑی سڑک پر آ گیا۔ یہاں ایک سویلین جیپ کھڑی تھی۔ اس میں ہمارے پانچ مجاہد عام کشمیری شہریوں کے لباس میں اپنی لمبی قمیضوں کے اندر سٹین گنیں چھپائے خاموشی سے بیٹھے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ کمانڈر شیروان بھی دوسری طرف سے آ گیا۔ میں اور کمانڈر شیروان بھی عام کشمیری شہریوں کے لباس میں تھے۔ کمانڈر شیروان جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر اور میں اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنا اپنا اسلحہ لمبے کشمیری کرتوں کے اندر چھپایا ہوا تھا۔ لباس سے ہم جنگلاتی لکڑی کا کاروبار کرنے والے ٹھیکیدار لگ رہے تھے۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ سٹارٹ ہوئی اور تیزی سے پہاڑی سڑک پر نیچے کی طرف جانے لگی پہاڑ کے کچھ موڑ کاٹنے کے بعد ہم ایک وادی میں آ گئے دور درختوں میں ساتھ ساتھ دو تین گاؤں نظر آئے۔ ان میں سے دھواں اٹھ رہا

تھا۔ فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک دور سے دھماکے کی گونج سنائی دی۔ یہ مارٹر توپ کے گولے کا دھماکہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک جگہ سے دھواں اوپر کو اٹھا اور لوگوں کے شور کی آوازیں آئیں۔ کمانڈر شیروان نے اس طرف جیپ ڈال دی۔

میں نے کہا۔

"وہاں فوج کی نفری زیادہ ہو گی۔ ہمیں گھات لگانی چاہئے۔"

"کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تم دیکھتے جاؤ"

جیپ اونچے اونچے سفیدے کے درختوں کے پاس پہنچی تو وہاں ایک طرف تین فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کمانڈر شیروان نے جیپ ایک چٹان کے پیچھے لا کر کھڑی کر دی۔ ہم چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے۔ کمانڈر شیروان نے دوربین لگا کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ پھر دوربین مجھے دے دی اور کہا۔

"گاؤں کا ایک مکان بھی نہیں بچا"

میں نے دیکھا کہ گاؤں کے تقریباً سارے مکان جو لکڑی کے تھے ڈھے چکے تھے اور کچھ مکانوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ دو فوجی ایک طرف سٹین گنیں لئے پوزیشنوں میں کھڑے تھے اور وقفے وقفے سے برسٹ فائر کر رہے تھے۔ ہمارے ایک کمانڈو نے کہا۔

"سر! یہ لوگ ٹیلے والی سڑک سے واپس کیمپ میں جائیں گے۔ ہمیں وہاں سڑک پر پوزیشنیں سنبھال کر ان کا انتظار کرنا چاہئے تاکہ ان میں سے ایک بھی بھارتی فوجی زندہ واپس نہ جانے پائے۔"

یہ سنتے ہی کمانڈر شیروان اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو اوپر والی پہاڑی سڑک پر"

ہم سب لوگ یعنی چاروں کمانڈو اور چار حریت پسند مجاہد جیپ میں بیٹھے اور جیپ پہاڑی راستے پر تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑنے لگی۔ کوئی دس منٹ بعد ہم چڑھائی چڑھ کر پہاڑی ٹیلے پر ایک جگہ جیپ روک کر اتر پڑے۔ جیپ کو سڑک سے ہٹا کر درختوں

اور جھاڑیوں میں چھپایا۔ مجاہدوں نے دستی بم رائفلیں اور سٹین گنیں اٹھا لیں۔ ہم نے کمانڈوز نے بھی چھ چھ دستی بم اور سٹین گنیں لیں اور سڑک کے اوپر پہاڑی ڈھلان پر جھاڑیوں کے پیچھے مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ سڑک کی ایک جانب پہاڑ کی ڈھلان تھی۔ دوسری جانب گہری گھاٹی تھی۔ ہم بھارتی گاڑیوں کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے دوربین سے گاؤں کے باہر دو فوجی ٹرک دیکھے تھے جو اوپر سے کھلے تھے اور ان میں ایک ایک فوجی مشین گن لگائے کھڑا تھا۔ میں نے اپنے مجاہدوں کو ہدایت کر دی تھی کہ جیسے ہی بھارتی فوجی ٹرک سڑک پر ہماری رینج میں آئیں ان پر دستی بموں کی بارش کر دینی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سٹین گنوں اور رائفلوں کا فائر کھول دینا ہے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا معلوم ہو رہا تھا۔

ہم بکھر بکھر کر ڈھلان کے پتھروں کے پیچھے پوزیشنیں لئے بیٹھے تھے۔ آخر ہمیں دور سے ٹرکوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے منہ سے کوئل کی آواز نکال کر سب کو الرٹ کر دیا۔ پھر پہاڑی موڑ پر ایک بھارتی فوجی ٹرک نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے دوسرا ٹرک تھا۔ دونوں ٹرک اوپر سے کھلے تھے۔ دونوں ٹرکوں میں بھارتی فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ آگے کی جانب ایک ایک فوجی مشین گن لگائے کھڑا سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم پوری طرح سے الرٹ ہو گئے چڑھائی پر آ کر فوجی ٹرکوں کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ دونوں ٹرکوں کے درمیان پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگلا ٹرک جیسے ہی ہماری رینج میں آیا میں نے اور کمانڈر شیروان نے یکے بعد دیگرے تین تین دستی بم پن نکال کر ٹرک پر پھینکے۔ چھ میں سے پانچ دستی بم اگلے ٹرک میں گرے اور گرتے ہی زبردست دھماکے ہوئے۔ میں نے ایک بھارتی فوجی کو اچھل کر ٹرک سے باہر گرتے دیکھا۔ اس دوران دوسرے مجاہدوں نے دوسرے ٹرک پر دستی بموں کی بارش کر دی اور ساتھ ہی رائفلوں اور سٹین گنوں کا فائر کھول دیا۔ دونوں ٹرکوں میں افراتفری مچ گئی۔ ایک ٹرک میں آگ لگ گئی۔ بھارتی فوجیوں میں سے تین فوجی چھلانگیں لگا کر باہر کودتے دیکھے گئے۔ ان سب کی نفری دس گیارہ تھی۔ ان میں دو آفیسر بھی تھے۔ انہوں نے بھی سڑک

پر پوزیشن لے لی اور پہاڑی ڈھلان پر جہاں ہم گھات لگائے ہوئے تھے مشین گن کے برسٹ فائر کرنے لگے۔

مگر وہ پہاڑی کے نشیب میں تھے۔ ہم اوپر پتھروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ ہم نے فائرنگ جاری رکھی۔ دستی بم بھی پھینکتے رہے اتنے تیز فائر اور دستی بموں کی بارش نے بھارتی فوجیوں کو دوسری طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ سب مارے گئے تھے۔ صرف تین فوجی زندہ تھے جو سڑک کی گھاٹی کی طرف اترنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ ان کی نالائقی تھی۔ انہیں بھاگنا ہی تھا تو سڑک پر پیچھے کی جانب بھاگنا چاہئے تھا۔ اس طرح وہ بہت جلد ہماری رینج سے باہر ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ گھاٹی میں اترنے لگے۔ انہیں گھاٹی میں اترتا دیکھ کر کمانڈر شیروان نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور ہم سب گھات میں سے نکل کر نعرے لگاتے ڈھلان سے اتر کر سڑک پر آگئے اور دائیں بائیں سٹین گنوں کی بوچھاڑیں مارتے سڑک کے کنارے آگئے۔ تینوں بھارتی فوجی نیچے گھاٹی میں جھاڑیوں کو پکڑ کر نیچے اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اترائی سیدھی تھی۔ ہم نے اوپر سے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ دیکھتے دیکھتے تینوں بھارتی فوجی ہماری گولیاں کھا کر وہیں الٹ گئے اور پھر بے جان پتھروں کی طرح نیچے گہری کھائی میں لڑھکتے چلے گئے۔

ایک ٹرک پہلے سے جل رہا تھا۔ دوسرے ٹرک کو آگ نہیں لگی تھی لیکن اس کی باڈی کا پچھلا حصہ اڑ گیا تھا۔ ہم نے اس ٹرک میں لگی ہوئی مشین گن اور چار رائفلیں اپنے قبضے میں کیں اور اس ٹرک کو بھی آگ لگا دی۔ وہاں سے ہم جیپ میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوئے۔ وادی میں آکر کمانڈر شیروان جیپ سے اتر گیا۔ اس نے مجھے بھی اتار لیا اور باقی مجاہدوں سے کہا۔

"تم لوگ اپنے اڈے پر جاؤ۔ ہم گاؤں پر جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے کتنے بھائی شہید ہوئے ہیں"

مجاہد جیپ لے کر خفیہ پناہ گاہ کی طرف اور ہم پیدل ہی گاؤں کی طرف چل پڑے گاؤں وہاں سے بمشکل ڈیڑھ دو فرلانگ پر تھا۔ گاؤں میں کہرام مچا تھا۔ بھارتی فوجیوں

مارٹر فائر سے سارے مکان مسمار ہو گئے تھے لکڑی کے مکان تھے۔ کئی ایک میں ابھی تک آگ لگی ہوئی تھی اور دیہاتی کشمیری آگ بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہم عام کشمیری شہریوں کے لباس میں تھے۔ ایک طرف دو بوڑھی عورتیں زمین پر بیٹھی روتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔ ایک بوڑھا روتے ہوئے انہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا ہم ان عورتوں کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

کمانڈر شیروان کشمیری زبان میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ عورتیں اور بوڑھا کشمیری اسے اپنی زبان میں کچھ بتا رہا تھا۔ میں کشمیری زبان روانی سے بول نہیں سکتا تھا۔ لیکن سمجھ لیتا تھا۔

کشمیری عورتوں اور بوڑھے نے کمانڈو شیروان کو بتایا کہ بھارتی فوجی ان کی جوان بیٹی جمیلہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ان کے جوان بیٹے کو شہید کر دیا ہے گاؤں کے پندرہ آدمی شہید کر دیئے گئے تھے جن میں چار بچے اور دو عورتیں بھی تھیں۔ ان سب کی لاشیں گاؤں کی مسجد کے صحن میں پڑی تھیں۔ بوڑھے کشمیری نے بتایا کہ تین فوجی تھے جن میں ایک کیپٹن فوجی تھا۔ وہ ڈوگرہ تھا۔ انہوں نے ان کے جوان بیٹے کو گولی مار کر شہید کر دیا اور جمیلہ کو سب کے سامنے گھسیٹتے ہوئے جیپ میں ڈالا اور اغوا کر کے لے گئے۔ ان کی بیٹی روتی رہی، چیختی رہی۔ مگر وہاں ان کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ گاؤں کے سب جوان شہید کر دیئے گئے تھے۔

کمانڈر شیروان نے پوچھا کہ وہ تینوں فوجی کس طرف گئے تھے۔ کیونکہ جن دو بھارتی فوجی ٹرکوں کو ہم نے تباہ کیا تھا ان کے ساتھ کوئی جیپ نہیں تھی۔ بوڑھے کشمیری نے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"اس طرف گئی تھی جیپ ادھر کوئی بھارتی فوجی چھاؤنی ہو گی۔ ہائے یا اللہ ہم کیا کریں کس کے پاس فریاد لے کر جائیں؟"

کمانڈر شیروان نے بوڑھے کشمیری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بابا! تمہاری بیٹی ہماری بیٹی ہے۔ کشمیر کی بیٹی ہے۔ ہم جمیلہ کو بھارتی درندوں سے چھڑا کر

لائیں گے اور ان تینوں بھارتی فوجیوں کے سر بھی کاٹ کر ساتھ لائیں گے جنہوں نے ہماری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔"

یہ کہہ کر کمانڈر شیروان اٹھ کر مجھے ایک طرف لے گیا۔ کمانڈر نے بوڑھے کشمیری سے بہت بڑا وعدہ کر لیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کمانڈر شیروان ایک سچا کشمیری مسلمان مجاہد ہے۔ وہ جو وعدہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے۔ شیروان نے مجھ سے کہا۔

"میرا اندازہ ہے کہ جمیلہ بیٹی کو ڈوگرہ فوجی گلمرگ روڈ کی طرف لے گئے ہیں۔ وہاں ایک بھارتی فوجی کیمپ ہے۔ پہاڑی نالے کے کنارے کچھ فوجیوں کی بارکیں اور کچھ فوجی افسروں کے لئے فلیٹ بھی بنائے گئے ہیں۔ ہم جمیلہ کو وہاں سے نکال کر لائیں گے"

میں نے کہا۔

"پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ فوجی کس رجمنٹ کے تھے۔ اور ان کا حلیہ کیا تھا؟"

شیروان بولا۔

"بوڑھے نے مجھے بتایا ہے کہ ان میں ایک کیپٹن تھا۔ وہ ڈوگری زبان بولتا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر سورج گرہن کا نشان تھا یہ نشانیاں کافی ہیں۔ باقی ہم خود معلوم کر لیں گے۔ ہمیں ابھی گلمرگ فوجی چھاؤنی کی طرف چلنا ہوگا۔"

وہاں سے ہم واپس اپنی خفیہ پناہ گاہ میں آ گئے۔ اپنے ساتھیوں کو اپنے نئے مشن کے بارے میں بتایا۔ تمام مجاہد ہمارے ساتھ چلنے کے لئے بے چین تھے۔ مگر یہ بڑا نازک مشن تھا۔ اس مشن پر ہم جلوس بنا کر نہیں جا سکتے تھے۔ یہاں ہمیں جوش کے ساتھ ہوش سے بھی کام لینا تھا۔ کمانڈر شیروان نے ساتھی مجاہدوں سے کہا۔

"ہمیں صرف ایک اور ساتھی کمانڈو کی ضرورت ہوگی اور کمانڈو ہاشم! تم ہمارے ساتھ چلو گے۔"

یہ وہی کشمیری مجاہد کمانڈو تھا جو شیو پاروتی مندر والے ایمونیشن ذخیرے کے مشن

ہیں حفاظتی چھاتہ مہیا کرنے کی خاطر ہمارے ساتھ گیا تھا۔ یہ بھی دوسرے کشمیری مجاہدوں کی طرح بے حد نڈر دلیر اور سمجھدار کمانڈو تھا اور تقریباً ہر مشن پر ہمارے ساتھ جاتا تھا۔ ہ ہمارے مزاج اور ہماری حکمت عملیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کہنے لگا۔

"الحمد للہ سر! میں خوش نصیب ہوں کہ اپنی بہن کو دشمنوں سے چھڑانے اور دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے آپ کے ساتھ جا رہا ہوں"

شیروان نے کہا۔

"ہم آدھ گھنٹے بعد اپنے نئے مشن پر نکل رہے ہیں۔ جو تیاری کرنی ہے کر لو۔ گڑ اور چنوں کا تھیلا ساتھ رکھ لینا۔ دوپہر کا کھانا ہم جنگل میں ہی کھائیں گے۔"

ہم نے اپنا لباس وہی کشمیری شہریوں والا ہی رکھا۔ صرف اپنے اپنے آٹومیٹک پستولوں ں نیا میگزین بھر لیا۔ کمانڈو ہاشم نے بھی اپنا پستول اور کمانڈو چاقو قمیض کے اندر چھپا یا۔ منہ ہاتھ دھویا دو نفل ادا کر کے خدا سے اپنے مشن کی کامیابی کی دعا مانگی اور پھر ہم پ میں بیٹھ کر اپنے مشن پر گلمرگ کی طرف جاتی روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیپ را ایک مجاہد چلا رہا تھا۔

ں کی ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ ہمیں گلمرگ روڈ پر پہاڑی نالے والی بھارتی چھاؤنی یا رتی فوجی کیمپ کے پاس چھوڑ آئے۔ سری نگر سے گلمرگ کی طرف جاؤ تو چڑھائی رع ہو جاتی ہے اور سردی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ یہ بہار کا موسم تھا لیکن گلمرگ کی ب سری نگر کے مقابلے میں زیادہ سردی پڑتی تھی۔ اس لئے ہم نے گرم اونی سویٹر اور کے اوپر چمڑے کی جرسیاں پہن رکھی تھیں۔ ہمیں اپنے ساتھ کمبل یا بستر وغیرہ رکھنے ضرورت نہیں تھی۔ کمانڈو کو کمبلوں آرام دہ بستروں کی ضرورت نہیں ہوتی وہ برفانی ں میں بھی برف کھود کر اندر گڑھا بنا کر رات گذار لیتا ہے۔ اس کے لئے گرم سویٹر رم جرسی ہی کافی ہوتی ہے۔ سڑک پر معمولی سی ٹریفک تھی۔ جیپ سڑک پر بڑی ا سے چلی جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہم کشمیر کے حسین ترین پہاڑی علاقے میں سے

گذر رہے تھے۔ مگر آج کشمیر کا یہ جنت نظیر حسن اداس تھا۔ اس کے حسین چہرے سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے بچے اپنے وطن کی آزادی اور اسلام کی جرات کی خاطر اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔

ہم نے ایک جگہ جنگل میں بیٹھ کر تھوڑے سے چنے اور گڑ کھایا۔ چشمے کا پانی پیا اور دوبارہ اپنے مشن کی طرف چل پڑے۔ مزید دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ چھوٹا سا پہاڑی نالہ آگیا جو وادی میں ایک طرف اونچے پہاڑوں کے درمیان سے بہتا چلا آرہا تھا۔ یہ کافی چوڑا نالہ تھا اور پہاڑی دریا لگتا تھا۔ اس کے اوپر پل بنا ہوا تھا۔ ٹریفک اس پل پر سے گذر کر دوسری طرف جاتی تھی۔ ہماری جیپ بھی پل پار کر کے پہاڑی نالے کے دوسرے کنارے پر آگئی۔ یہاں ہمیں دریا کے کنارے کنارے کشادہ سرسبز میدان میں کچھ فوجی بارکیں اور پہاڑی ڈھلان پر کچھ چھوٹی چھوٹی کوارٹروں ایسی کوٹھیاں دکھائی دیں۔

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔" اب اس نے ڈرائیور مجاہد سے کہا۔

"دوست! اب تم جیپ لے کر واپس جاؤ گے"

"ٹھیک ہے کمانڈر!"

ہم جیپ سے اتر گئے اور مجاہد ڈرائیور جیپ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ کمانڈو زیادہ باتیں اور بحث مباحثہ نہیں کیا کرتے۔ ان کے لیڈر کا آرڈر ہی ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ میں نے شیروان سے بالکل نہ پوچھا کہ یہاں ہم جس مجاہد کے پاس جا

لیڈر نے کہا یہ کام کرنا ہے کمانڈو نے کہا یس سر! اور وہ کام کر ڈالا۔ جیپ چلی گئی تو ہم ہے ہیں اس کا نام کیا ہے۔

تینوں کمانڈو یعنی میں، کمانڈر شیروان اور کمانڈو ہاشم پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ اوپر کی ب بھارتی فوجی کیمپ کافی پیچھے رہ گیا تو ہم نالے سے ہٹ کر ڈھلان کی وادی میں داخل طرف چلنے لگے۔ میں اب اس پہاڑی نالے کو دریا نہیں کہوں گا۔ کیونکہ ہمارے میدانی گئے۔ یہاں زمین اونچی اور کہیں نشیبی تھی۔ کہیں کہیں گھاٹی تھی۔ چنار اور سفیدے علاقوں میں دریا کا تصور وہ نہیں ہوتا جو پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے۔ درخت تھے۔ زعفران کے چھوٹے چھوٹے کھیت بھی تھے۔ ہم سیب اور ناشپاتیوں کے

ہم پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان چلتے اس مقام پر آگئے باغوں میں سے بھی گذرے۔ یہاں کشمیری باغبان اور کسان اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔ جہاں ہمارے بائیں ہاتھ کو زمین اونچی ہونی شروع ہو جاتی تھی۔ کافی آگے جا کر تین جانب جانب اونچی جگہ پر لکڑی کے چند ایک دیہاتی مکان نظر آئے۔ شیروان نے کہا۔

فوجی بیرکیں تھیں۔ ان سے آگے دس بارہ کوارٹر نما فلیٹ تھے۔ شاید یہ فیملی والے فوجی "وہاں جا رہے ہیں"

افسروں کے لئے بنائے گئے تھے۔ فوجی بارکوں کے آگے خار دار تاروں والی کوئی پانچ فٹ اونچی دیوار تھی اس سے آگے فوجی کیمپ تھا۔ جہاں فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور ایک جگہ کوارٹر کے آگے رجمنٹ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہم جب بھارتی فوجی کیمپ سے بھی آگے نکل گئے تو میں نے کمانڈر سے پوچھا۔

"شیروان بھائی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

کمانڈر نے کہا۔

"اپنے ایک حریت پسند مجاہد کے ہاں جا رہے ہیں"

کشمیر کا بچہ بچہ اس وقت حریت کے جذبے سے سرشار تھا۔ کشمیر کا ہر گھر حریت پسندوں کی آماجگاہ تھا۔ یہ کشمیر کے بیٹے تھے جو مادر وطن کی حرمت، آزادی اور اسلام کی سربلندی کے لئے کافر دشمن سے کشمیر پر زبردستی قبضہ کر کے بیٹھی ہوئی بھارتی فوج سے جنگ کر رہے تھے۔ ان کے وسائل کم تھے۔ جب کہ بھارتی فوج تربیت یافتہ پیشہ ور فوج تھی اور اس کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ اس کے باوجود کشمیری حریت پسندوں کی جرات و دلیری کے کارناموں کی دوسرے ملکوں تک دھوم مچی ہوئی تھی۔ جس فوجی کو پتہ چلتا تھا کہ اس کی پوسٹنگ کشمیر میں ہو رہی ہے اس کا چہرہ اتر جاتا تھا۔ رنگ زرد ہو جاتا تھا اور اس کے گھر میں ماتم کی فضا بن جاتی تھی۔ کیونکہ کشمیر کے محاذ سے بھارتی فوجی کا زندہ واپس آنا تقریباً ناممکن ہوتا تھا۔

اس دوران شیروان نے کمانڈو ہاشم کو ہدایت کی تھی کہ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک طرف کو ہو کر چلتا رہے۔ تاکہ اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو وہ ہمیں خبردار بھی کر سکے اور فائرنگ کھول کر ہماری مدد بھی کر سکے۔ جب ہم گاؤں کے لکڑی کے پرانے مکانوں کے علاقے میں داخل ہوئے تو کمانڈو ہاشم اوپر سے ہو کر ہمارے پاس آگیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم کس مجاہد کے گھر جا رہے ہیں۔ گاؤں کے چند ایک مکان تھے۔ مکانوں کی چھتوں اور صحن میں کہیں کہیں شلجم کے چھلکے اور سرخ مرچیں دھوپ میں سکھانے کو ڈال رکھی تھیں۔ یہاں بادام اور اخروٹ کے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ ہم ایک جگہ اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ شیروان نے کمانڈو ہاشم سے کہا۔

"جا کر دیکھو شعبان گھر پر ہی ہے؟"

کمانڈو ہاشم لکڑی کے مکانوں کی طرف جاتی پگ ڈنڈی کی طرف ہو گیا۔ ہم درخت کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ اخروٹ کا درخت بہت گنجان ہوتا ہے اور اس کا تنا بھی کافی موٹا ہوتا ہے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کمانڈو ہاشم ایک مکان کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ آدمی جو کشمیری مجاہد شعبان ہی ہو سکتا تھا وہیں صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور کمانڈو ہاشم واپس ہماری طرف آنے لگا۔

کمانڈر شیروان بھی ادھر کو ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے شعبان کو پہچان لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمارا مجاہد گھر پر ہی مل گیا ہے۔ اچھا ہوا"

اتنی دیر میں کمانڈو ہاشم ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا کہنے لگا۔

"لیڈر! شعبان نے آپ کو سلام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ سیب کے باغ والی کوٹھڑی میں میرا انتظار کرو۔ میں آرہا ہوں"

ہم اس وقت کوئی بات کئے بغیر اٹھ کر سیب کے باغ کی طرف چل دیئے۔ سیب کے باغ کی دوسری طرف چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی تھی جس کے باہر ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ جو خالی پڑا تھا۔ ہم کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر دری پر بیٹھ گئے۔ پانچ منٹ کے بعد مجاہد شعبان بھی آگیا۔ خوبصورت صحت مند کشمیری نوجوان تھا۔ شیروان نے اس سے میرا

تعارف کرایا اور ساری بات بیان کر دی۔ مجاہد شعبان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"میں ان تینوں بھارتی فوجیوں کا پتہ لگا لوں گا ان میں جو ڈوگرہ کیپٹن ہے اور جس کے ماتھے پر گرہن کا نشان ہے اگر وہ اسی بھارتی کیمپ میں ہے تو وہ ہمارے انتقام کی آگ سے بچ نہیں سکے گا۔ ہماری بہن جمیلہ اسی کے پاس ہے تو وہ نالے والے کوارٹروں میں ہی ہو گی۔ میں ابھی ان سب کا سراغ لگانے جاتا ہوں۔ تم لوگ اس کوٹھڑی میں میرا انتظار کرنا۔"

مجاہد شعبان باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے شیروان سے پوچھا۔

"شعبان اتنی جلدی اتنا مشکل سراغ کیسے لگائے گا؟"

"اس کے اپنے آدمی فوجی کیمپ میں کام کرتے ہیں اور افسروں کے کوارٹروں میں بھی آتے جاتے ہیں"

ہم کوٹھڑی میں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ مجاہد شعبان دن کے ساڑھے گیارہ بجے گیا تھا۔ دوپہر کے تین بجے واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"ڈوگرہ فوجی کیپٹن کا نام دین دیال شرما ہے۔ جمیلہ کو اس نے اپنے کوارٹر میں ہی چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ جو دو بھارتی فوجی جمیلہ کو اغوا کر کے لائے تھے ان میں ایک حوالدار اور ایک لانس نائیک ہے۔ ان کے نام حوالدار کامو رام اور لانس نائیک کانشی رام ہے۔ دونوں رات کو ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر میں ضرور حاضر ہوتے ہیں۔ اس وقت ڈوگرہ کیپٹن شراب پیتا ہے اور یہ دونوں اس کے اردلی کے طور پر اس کی خدمت بجا لاتے ہیں"

میں حیران رہ گیا۔ مجاہد شعبان پوری تفصیل کے ساتھ مکمل رپورٹ لے آیا تھا۔

روان نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیا خیال ہے؟ ہم آج رات اٹیک کریں گے"

کمانڈر شیروان کی عادت تھی کہ جب وہ ٹارگٹ کے سامنے پہنچ جاتا تھا اور حالات نارمل ہوتے تھے تو پھر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر اسے گوارا نہیں ہوتی تھی۔ وہ فوراً ایکشن شروع کر دیتا تھا۔ چونکہ میں نے کمانڈر شیروان کے ساتھ ایک عرصہ گزارا تھا۔ اور میں اس کی اس عادت سے واقف تھا اس لئے میں نے فوراً جواب دیا۔

"یس لیڈر! میں تیار ہوں"

اس کے بعد ہم نے مجاہد شعبان کے ساتھ مل کر کمانڈو آپریشن کی پوری سکیم تیار کی۔ منصوبہ کوئی پیچیدہ نہیں تھا۔ بالکل صاف تھا مگر دلیرانہ منصوبہ تھا اور اس کے ہر قدم پر موت کو پچھاڑنا تھا۔ موت سے مقابلہ کرنا تھا۔ موت کو شکست دینی تھی۔ ٹارگٹ مارنے سے پہلے ہرگز نہیں مرنا تھا۔ کمانڈو ہاشم کو ہم نے کور دینے یعنی ہمارے لئے کچھ فاصلے پر رہ کر حفاظتی چھاتہ مہیا کرنے کی ڈیوٹی دی تھی۔ ہم نے اپنے پاس ایک ایک بڑا کمانڈو چاقو اور سائی لینسر والے آٹو میٹک پستول ہی رکھے تھے۔ باقی سٹین گن اور ہینڈ گرنیڈ کمانڈو ہاشم کے پاس رکھے جانے تھے۔

کمانڈو شعبان ہمیں اپنے گھر اس لئے نہیں لے گیا تھا کہ گاؤں میں بھارتی سی آئی ڈی کے آدمی آتے جاتے رہتے تھے۔

اور شیو پاروتی مندر والے ایمونیشن کے ذخیرے کی تباہی کے بعد اس سارے علاقے میں سی آئی ڈی کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ کیونکہ فوج ابھی تک کسی کمانڈو کو گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ وہاں کوٹھڑی میں باتیں کرتے اور منصوبے کی تفصیلات پر غور کرتے رات ہو گئی مجاہد شعبان وہیں ہمارے لئے کھانا اور سبز چائے سے بھرا ہوا سماوار لے آیا۔ کھانا کھانے کے بعد رات کے آٹھ بجے مجاہد شعبان حالات کا جائزہ لینے اور اپنے آدمیوں سے بات کرنے کے لئے چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔

"ڈوگرہ کیپٹن دین دیال کے آفیسرز کوارٹر میں رات کے دس بجے شراب کی محفل لگنے والی ہے۔ کشمیری لڑکی جمیلہ اسی کوارٹر کے ایک کمرے میں بند ہے۔ ڈوگرہ کیپٹن کے دونوں فوجی ساتھی حوالدار اور لانس نائیک شراب کی اس

محفل میں اس کے ساتھ ہوں گے۔ ہمارا ایک مجاہد نوکر کے بھیس میں وہاں موجود ہوگا۔ وہ کوارٹر کے کمرے کے عقب میں آکر دو بار ماچس کی تیلی جلا کر ہمیں آل کلیئر کا سگنل دے گا۔ بس اس کے بعد آپ لوگوں کو اٹیک کر دینا ہو گا۔ اور جو کچھ کرنا ہو گا کر دینا ہو گا۔ یہ بتائیں کہ آپ کشمیری لڑکی کے ساتھ ان تینوں ڈوگرہ فوجیوں کو پکڑ کر کیسے اس کوٹھڑی تک لائیں گے۔ اگر وہ شراب کے نشے میں دھت بھی ہوں گے تو ممکن ہے یہاں تک آتے آتے انہیں ہوش آجائے آپ انہیں وہیں ہلاک کر دیں تو زیادہ بہتر ہو گا"

کمانڈر شیروان کہنے لگا۔

"کمانڈو شعبان! ہم نے مشن شروع کرنے سے پہلے جمیلہ کے بوڑھے ماں باپ کے آگے قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کی بیٹی جمیلہ کو کافروں کی قید سے آزاد کروا کر لے آئیں گے اور ساتھ ہی جن بھارتی فوجیوں نے کشمیر کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ اس کی بے حرمتی کی ہے ان کے سر بھی کاٹ کر لائیں گے۔ چنانچہ تم بے فکر رہو ہمارے ساتھ ڈوگرہ کیپٹن اور دونوں بھارتی فوجی نہیں ہوں گے بلکہ ان کے سر بوری میں بند کر کے ساتھ لے آئیں گے۔ اس طرح ہمارا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور اپنا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا"

مجاہد شعبان نے اس کے بعد کوئی سوال نہ کیا۔ شیروان مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"دوست! چلنے سے پہلے ہر ایک چیز چیک کر لی جائے۔ ہم اسی سویلین کپڑوں میں ہی جائیں گے۔ ہمیں کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ شعبان تمہیں شام کے وقت ساتھ لے جا کر ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دکھا لائے گا"

جب سورج غروب ہو گیا اور شام کا اندھیرا چھانے لگا تو ہم شعبان کے ساتھ دیہاتی پڑوں کے لباس میں ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دیکھنے کے لئے نکل پڑے۔ مجاہد شعبان ہمیں ہاڑی رستوں سے لے جا رہا تھا جہاں سے ہمیں رات کے وقت گذرنا تھا۔ یہ بھارتی پ کی فوجی بارکوں کا عقب تھا اور یہاں جنگلی جھاڑیاں اور درخت بہت تھے۔ مجاہد

شعبان نے ہمیں ڈوگرہ کیپٹن کا کوارٹر دکھایا جو چھوٹی سی کوٹھی کی طرح تھا۔ آگے پیچھے چھوٹا لان تھا۔ اس کی کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ کیونکہ یہ جگہ بھارتی کیمپ میں ہی تھی اور اس کے پیچھے خاردار تار کی دیوار تھی۔ شعبان ہمیں ایک گھاٹی میں سے نکال کر لایا تھا۔ جس طرف کانٹے دار تار والی دیوار میں ایک آدمی کے گزرنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کے پچھواڑے بادام کے درخت تھے۔ یہاں ایک چھوٹی سی چٹان زمین سے نکل کر کوئی پندرہ فٹ اوپر چلی گئی تھی۔ چٹان کے نیچے ایک شگاف تھا۔ شعبان نے کہا۔

"تم لوگ یہاں چھپ کر رات کے دس بجنے کا انتظار کر سکتے ہو"

پھر اس نے دور سے ہمیں کوارٹر کے گرد لگی ہوئی گارڈینیا کی جھاڑیاں دکھا کر کہا۔

"وہ جہاں انار کا درخت ہے۔ وہاں سے تم باڑھ پھلانگ کر اندر جا سکتے ہو۔ کونے والا کمرہ باتھ روم ہے۔ اس کے ساتھ وہ کمرہ ہے جہاں کشمیری لڑکی کو قید کیا ہوا ہے۔ تم باتھ روم کے دروازے سے اندر داخل ہو گے۔ کیونکہ باقی تمام کمروں کے دروازے اندر سے بند ہوتے ہیں۔ ہمارا آدمی رات کو شراب کی پارٹی شروع ہونے سے پہلے اندر آکر باتھ روم کے دروازے کی کنڈی کھول دے گا۔ اس کے بعد سب کچھ تمہیں اپنی مرضی سے سوچ سمجھ کر کرنا ہو گا۔ اب واپس آجاؤ۔"

ہم جن راستوں سے گئے تھے ان ہی راستوں پر چلتے ہوئے واپس سیب کے باغ والی کوٹھڑی میں آگئے۔ اور رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ شعبان چلا گیا تھا ہم نے اس سے نائلون کا سیاہ رنگ کا بڑا تھیلا منگوا کر رکھ لیا تھا۔ اس تھیلے میں ہمیں ڈوگرہ کیپٹن اور دونوں بھارتی فوجیوں کی سر کاٹ کر لانے تھے۔ میں نے آج تک کسی دشمن کا بھی سر نہیں کاٹا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کمانڈر شیروان نے بھی پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ ہم بھارتی فوجیوں کے سر کیسے کاٹیں گے۔ اگرچہ ہمارے پاس بڑے کمانڈو چاقو موجود تھے مگر گردن کاٹنے کے لئے کسی کلہاڑی ایسی شے کی ضرورت ہوا

ہے۔ بہرحال اس موضوع پر میں نے کمانڈر شیروان سے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔ ہم اپنے مشن کے بارے میں مزید تفصیلات طے کرنے اور ایک ایک نقل و حرکت کی ریہرسل کرتے رہے۔ جب ہماری گھڑیوں نے ایک ساتھ رات کے پورے دس بجائے تو کمانڈر شیروان نے کہا۔

"چلو شیرو! جن کافروں نے ہمارے بھائیوں کو قتل کیا ہے اور ہماری ماؤں' بہنوں کو بے عزت کیا ہے ان سے بدلہ چکانے کا وقت آگیا ہے"

ہم تینوں کمانڈو اللہ کا نام لے کر سیب کے باغ والی کوٹھڑی سے نکل آئے۔ باہر گلمرگ کے قرب وجوار کی رات سرد اور کہر آلود تھی۔ کہرے کی وجہ سے آسمان پر چمکنے والے ستارے کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہم نے گرم جرسیاں اور جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ لباس کشمیری دیہاتیوں والا تھا۔ کھدر کے لمبے کرتے اور نیچے شلواریں۔ پاؤں میں کینوس کے جوتے تھے تاکہ چلتے وقت قدموں کی آواز پیدا نہ ہو۔ ہم نے جس طرف سے جانا تھا اور جس فارمیشن میں چلنا تھا یہ سب کچھ پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ کمانڈر شیروان آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے دو قدموں کا فاصلہ ڈال کر میں چل رہا تھا۔ کمانڈو ہاشم ہم سے پانچ قدم کے فاصلے پر دائیں جانب ہمارے پہلو میں ہمارے متوازی چل رہا تھا۔ رات اندھیری اور کہر آلود تھی لیکن ہماری آنکھیں راتوں کے اندھیرے کی عادی تھیں۔ جس طرح چیتا اندھیری رات میں بھی اپنے شکار کو دیکھ لیتا ہے اسی طرح ہم بھی اندھیری رات میں اپنے ٹارگٹ کو دیکھ سکتے تھے۔ درخت جھاڑیاں چھوٹے بڑے پتھر' نشیب' گھاٹیاں اور پہاڑ کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلی ہوئی دھندلی نیم تاریک وادی ہمیں برابر نظر آرہی تھی۔ جب ہم ایک گھاٹی میں سے گزر کر خاردار تار کی دیوار کے سوراخ میں سے نکل کر اوپر آئے تو ہمیں دور فوجی بارک کی روشنیاں اور آفیسرز کوارٹر کی روشنی نظر آئی۔ ہم ایک خاص زاویے سے پھیل کر ایک دوسرے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے چلتے چلتے بادام کے درختوں کے نیچے آکر رک گئے۔ اب کمانڈو ہاشم بھی ہمارے پاس آکر زمین پر بیٹھ گیا۔ ہم سب کی نظریں کچھ فاصلے پر ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کی عقبی دیوار کے اوپر جلتے بلب پر

لگی تھیں۔ اس بلب کی روشنی عقبی دیوار اور غسل خانے کے پچھلے دروازے پر پڑ رہی تھی کمانڈر شیروان نے آہستہ سے کہا۔

"باتھ روم کے دروازے میں داخل ہوتے وقت ہم دور سے نظر آسکتے ہیں ہمیں دوسری طرف سے آنا ہوگا"

پھر اس نے کمانڈو ہاشم کو ہدایت کی۔

"تم گارڈینیا کی باڑھ کے پیچھے پوزیشن لے کر ہمارے باہر نکلنے کا انتظار کرو گے۔ اگر اس دوران کوئی دوسرا آدمی غسل خانے کے دروازے کی طرف آتا نظر آیا تو تم اس پر فائر نہیں کرو گے۔ تمہارا کام یہ ہوگا کہ چیتے کی طرح تیزی سے رینگ کر اس کے عقب میں پہنچو گے اور اسے دبوچ لو گے اور اس سے پہلے کہ اس کی آواز نکلے اس کی گردن کی ہڈی توڑ دو گے۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟"

کمانڈو ہاشم نے کہا۔

"نو سر۔ کوئی سوال نہیں کوئی اعتراض نہیں"

"اوکے۔ گو"

اور اس کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان کوارٹر کی طرف بڑھا۔ میں اس کے بالکل پیچھے تھا۔ آٹو میٹک پستول ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ پلاسٹک کا تھیلا میں نے اپنی کمر کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ اس خیال سے مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ جب ہم واپس آجائیں گے تو ہمارے ساتھ معصوم اور مظلوم کشمیری لڑکی جمیلہ بھی ہوگی اور پلاسٹک کے تھیلے میں دشمنوں کے تین کٹے ہوئے سر بھی ہوں گے۔ اپنی عزت غیرت، اپنے وطن کے ناموس اور اپنے دین اسلام کی حرمت کی خاطر دشمن سے جنگ کرتے ہوئے جب ہم دشمن کا سر کاٹتے ہیں تو اس سے ہمیں ایک طرح کی روحانی خوشی ہوتی ہے۔ یہ ایسی ہی خوشی ہے کہ جس طرح خدانخواستہ اگر کوئی غنڈہ بدمعاش ہماری بیٹی کو ہماری آنکھوں کے سامنے اس کے کپڑے پھاڑ کر اٹھا کر لے جائے اور ہم تعاقب کر کے اس غنڈے بدمعاش کو قتل کر دیں اور اپنی بیٹی کو چھڑالیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے

خود شہید ہو جانے یا کافر کا سر قلم کر دینے سے جو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ایک شہید اور غازی کا رتبہ ہے۔ اور اسلام میں ایک مسلمان کے دو ہی مقام ہیں۔ غازی یا شہید۔

اندھیرے اور سرد رات کے کہرے میں چلتے ہوئے ہم ڈوگرہ کیپٹن کے کوارٹر کے گرد لگی ہوئی جھاڑیوں کی باڑھ کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ باتھ روم کا دروازہ ہم سے بیس پچیس قدموں کے فاصلے پر تھا۔ کمانڈر شیروان نے کمانڈو ہاشم کو اشارہ کیا۔ وہ دو قدم دوڑ کر ایک طرف گیا اور باڑھ کی جھاڑیوں کے پیچھے مورچہ بنا کر بیٹھ گیا۔ کمانڈر شیروان نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ میں سامنے کی طرف سے جاؤں گا۔ تم دوسری طرف سے باتھ روم والے دروازے پر آؤ گے۔ ہمیں یقین تھا کہ اپنے آدمی نے باتھ روم کے دروازے کی اندر سے کنڈی کھول دی ہوگی۔

ہم زمین پر منہ کے بل لیٹ گئے تھے اور باڑھ پھلانگنے کے بعد زمین پر کہنیوں کے بل رینگتے ہوئے چل رہے تھے۔ میں دوسری طرف ہو گیا جدھر اندھیرا تھا۔ میں دوسری طرف سے نصف قطر کا چکر لگا کر دروازے کی طرف آیا تو میں نے دیکھا کمانڈر شیروان زمین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی گردن اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بلند کر کے لہرایا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آجاؤ۔ سب ٹھیک ہے۔ ادھر سے میں نے اور سامنے کی جانب سے کمانڈر شیروان نے باتھ روم کے دروازے کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ گھاس شبنم سے گیلی اور ٹھنڈی تھی مگر ہمیں اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ہمارے مشن کی گرمی نے ہمارے جسموں کو بھی گرم کر دیا ہوا تھا۔ انسان کے سامنے کوئی بڑا تعمیری مقصد ہو تو پھر راستے کی کوئی رکاوٹ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پھر نہ سردی گرمی کچھ کہتی ہے نہ بھوک پیاس پریشان کرتی ہے۔ آدمی جب روپے پیسے کے لالچ میں زمین جائیداد کے لالچ میں کسی کو قتل کرنے جاتا ہے تو اس کا ضمیر ہر قدم پر اس کی ملامت کر رہا ہوتا ہے لیکن جب ایک انسان اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کا نام بلند رکھنے کی خاطر کافر دشمن سے جنگ کرنے کے لئے جاتا ہے تو اس کا ضمیر اس سے خوش ہوتا ہے۔ اس کو روحانی

طاقت عطا کرتا ہے اور فرشتے اس غازی کی مدد کر رہے ہوتے ہیں۔

میری بھی اس وقت یہی کیفیت تھی۔ ہم جو کچھ کر رہے تھے اللہ کی رضا کے لئے کر رہے تھے۔ اللہ کی خاطر کر رہے تھے۔ یقین کریں اس وقت موت ہمیں چیونٹی سے بھی کم تر اور بے وقعت معلوم ہو رہی تھی۔ اگر آپ کو موت کا خوف ہے تو اپنے ہر کام کو اپنے ہر فعل کو اللہ کی رضا اور اللہ کی خوشنودی کے لئے وقف کر دیں۔ آپ کو موت کے خوف سے نجات مل جائے گی۔ میں اور کمانڈر شیروان زمین پر کہنیوں کے بل رینگتے رینگتے باتھ روم کے عقبی دروازے تک پہنچ گئے۔ میں نے لیٹے لیٹے دروازے کو ہاتھ سے اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہم باتھ روم میں داخل ہو گئے۔ باتھ روم کی بتی جل رہی تھی۔ ہم بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے کیونکہ دروازہ کھلنے سے باتھ روم کی تیز روشنی باہر آنے لگی تھی۔ ہم نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔

چھوٹا سا باتھ روم تھا مگر اس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ ہم دبے پاؤں دوسرے دروازے کی طرف بڑھے جو بند تھا اور جس کی دوسری طرف سے آدمیوں کے بولنے کی اور کسی وقت قہقہے کی آواز آ جاتی تھی۔ کوشش کے باوجود ہمیں دروازے میں کوئی سوراخ یا ایسی درز نہ مل سکی جس میں جھانک کر ہم دوسری جانب کا منظر دیکھ سکتے۔ دروازہ نیچے فرش سے دو انچ اونچا رکھا گیا تھا۔ ہم باتھ روم کے فرش پر لیٹ گئے اور گال فرش کے ساتھ لگا کر دو انچ کی درز میں سے دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف کا منظر یہ تھا کہ صوفے پر دو فوجی بیٹھے تھے ایک فوجی میز کے قریب کھڑا میز پر کبابوں یا آلو کی ٹکیوں کی پلیٹ رکھ رہا تھا۔ یہ لانس نائیک کی وردی میں تھا۔ باقی دو فوجی جو صوفے پر بیٹھے تھے ان میں سے ایک کیپٹن کی وردی اور دوسرا حوالدار کی وردی میں تھا۔ عجیب بات تھی رات کے دس بجے بھی انہوں نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے چونکہ کشمیر میں ایمرجنسی کے حالات تھے اس لئے فوجی اس وقت تک اپنی وردیوں میں رہتے ہوں جب تک کہ وہ سونے کے لئے بستر پر نہیں لیٹتے۔ میز پر شراب کے تین گلاس پڑے تھے۔ لانس نائیک نے کباب کی پلیٹ میز پر رکھ دی اور اپنے گلاس میں شراب ڈال کر ذرا پرے

ہو کر بیٹھ کر پینے لگا۔ کیپٹن کی وردی والا یقیناً ڈوگرہ کیپٹن دین دیال شرما ہی تھا۔ یہ تینوں وہی بھارتی فوجی تھے جنہوں نے گاؤں کو مارٹر گنوں سے اڑایا تھا۔ بے گناہ کشمیریوں کو ہلاک کیا تھا۔ اور کشمیری لڑکی جمیلہ کو اغوا کر کے لے آئے تھے۔ ہم فرش سے آہستہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کمانڈر شیروان نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

"تینوں وہی کافر ہیں ہم زیادہ دیر تک باتھ روم میں نہیں رہ سکتے۔ یہ لوگ شراب پی رہے ہیں اور یہ لوگ بار بار پیشاب کرنے اندر آئیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہمارا ایکشن کیا ہونا چاہئے؟"

شیروان بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ سب سے پہلے ہمیں باہر کا جائزہ لینا ہو گا کہ باہر کوئی سنتری گارڈ ڈیوٹی پر تو نہیں ہے"

ہم آہستہ سے باتھ روم کا عقبی دروازہ کھول کر باہر لان میں نکل آئے اور دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے دوسری طرف جا کر جھانک کر دیکھا۔ یہ کوارٹر کے سامنے والا حصہ تھا۔ برآمدے میں بتی جل رہی تھی مگر وہاں کوئی سنتری نہیں تھا۔ آگے چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ باغیچے کا چھوٹا سا گیٹ تھا۔ گیٹ پر کوئی دروازہ نہیں لگا تھا۔ جھاڑیوں کو تراش کر آنے جانے کا راستہ بنایا ہوا تھا۔ ہم وہیں دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔

"گارڈ ڈیوٹی پر کوئی نہیں۔ یہ ہمارے لئے اچھا شگون ہے۔ مگر ہمیں یہ پتہ چلنا چاہئے کہ کشمیری لڑکی بھی یہاں موجود ہے کہ نہیں"

میں نے کہا۔

"شعبان نے کہا تھا کہ جمیلہ باتھ روم کے ساتھ والے جنوبی کمرے میں بند رہے۔ چلو اس طرف چل کر دیکھتے ہیں"

ہم دیوار کے ساتھ پنجوں اور گھٹنوں کے بل چیتوں کی طرح چلتے باتھ روم کے

دروازے کے آگے سے گزر کر دوسری طرف جو کمرہ تھا اس کی دیوار کے بائیں آکر رک گئے۔ ادھر کمرے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ صرف زمین سے چار فٹ اونچی ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ سرد رات کا کہر پتلے بادل کی طرح کوارٹر کے لان میں آگیا تھا۔ اس کہرے نے ہمیں چھپا لیا تھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ سلاخوں کے پیچھے کھڑکی کے پٹ تھے۔ جو بند تھے۔ شیروان نے انگلی سلاخوں میں ڈال کر کھڑکی کے پٹ کو اندر کو دھکیلا۔ کہنے لگا۔

"کھڑکی کی کنڈی لگی ہوئی ہے"

اچانک کھڑکی کے پیچھے سے ایک مرد کی دھیمی آواز آئی۔ میں نے شیروان کو اشارہ کیا ہم نے کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ کان لگا دیئے۔ اندر کوئی مرد فوجی اردو میں کہہ رہا تھا۔

"کچھ کھاؤ۔ راشن نہیں کھاؤ گی تو بھوکی مرجاؤ گی"

تب ایک لڑکی کی آواز آئی لڑکی نے خدا کا واسطہ دیتے ہوئے کشمیری لہجے کی اردو میں کہا۔

"مجھے کچھ نہ کہنا۔ اگلے مہینے میری شادی ہونے والی ہے۔ خدا کا واسطہ ہے خدا کے لئے مجھے کچھ نہ کہنا"

اور لڑکی کے رونے کی آواز آنے لگی۔ مرد کی آواز پھر آئی۔

"اگلے مہینے والی شادی کو بھول جاؤ۔ آج رات تمہاری تین آدمیوں سے شادی ہوگی۔ لو تھوڑا کھالو تاکہ تمہارے اندر طاقت آجائے"

کمانڈر شیروان نے کان پیچھے ہٹا لئے اس کا چہرہ کہرے میں تانبے کی طرح تمتما رہا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ "ہم اندر چلیں گے۔"

ہم کہرے کی چادر میں تیز تیز قدم اٹھاتے باتھ روم کے دروازے پر آکر رک گئے۔ کمانڈر نے دروازے کے ساتھ کان لگایا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔

"اندر کوئی نہیں"

اور وہ دروازہ کھول کر باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باتھ

روم میں آگیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ ہم باتھ روم کے فرش پر لیٹ کر دوسرے دروازے کی نچلی دو انچ کی درز میں سے دوسری طرف دیکھنے لگے۔ کمرے میں صرف ڈوگرہ کیپٹن اور حوالدار ہی بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ تیسرا آدمی لانس نائیک کشمیری لڑکی کے کمرے میں ہی تھا سامنے دیوار میں جو دروازہ تھا وہ کھلا اور اندر سے ڈوگرہ لانس نائیک باہر آیا۔ ڈوگرہ کیپٹن نے نشے میں جھومتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری ہیما مالینی نے کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں؟"

لانس نائیک بولا۔

"سر! آلو کی ٹکیاں اس کے پاس رکھ آیا ہوں صبح سے بھوکی ہے۔ اپنے آپ کھائے گی"

کمانڈر شیروان جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ باتھ روم کے بلب کی روشنی میں شیروان کا سرخ وسفید چہرہ ایسے سرخ ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے فحش گالی دے دی ہو۔ اس نے آٹومیٹک پستول نکال کر اس کا میگزین بڑی احتیاط سے چیک کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں مجھے کہا۔

"دوست! ہم اٹیک کریں گے"

میں نے بھی اپنا آٹومیٹک پستول نکال لیا۔ میگزین چیک کیا۔ ہم موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ کمانڈر شیروان نے جو فیصلہ کر لیا تھا اب اس پر عمل کرنا اس کے لئے ضروری ہوگیا تھا۔ باتھ روم کا یہ دروازہ بند ضرور تھا مگر اس کو باہر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ہمیں صرف اسے کھولنا ہی تھا۔ شیروان نے ایک دم سے دروازہ کھول کر نعرہ لگایا۔ "اللہ اکبر"

میں نے نعرہ لگایا۔ "یا علی"

اس کے ساتھ ہی ہمارے آٹومیٹک پستولوں میں سے گولیوں کی بوچھاڑیں نکلنے لگیں۔ سائی لینسروں کی وجہ سے دھماکوں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ تینوں بھارتی فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وہ ہمارے نشانوں کی زد میں تھے۔ ایک ایک ڈوگرے

فوجی کے جسم سے ایک سیکنڈ میں چھ چھ سات سات گولیاں پار ہو گئیں۔ ڈوگرہ کیپٹن صوفے پر ہی الٹ گیا۔ لانس نائیک بھارتی فوجی صوفے کے پیچھے کھڑا تھا وہ اسی جگہ ڈھیر ہو گیا۔ بھارتی حوالدار کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ گلاس گولی لگنے سے چکنا چور ہو گیا۔ دو گولیاں اس کی کھوپڑی میں سے نکل گئیں۔ وہ منہ کے بل نیچے گر پڑا۔ شیروان نے ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔ میں دوڑ کر کمرے کے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے پاس گیا۔ اسے کھول کر باہر دیکھا۔ باہر خاموشی چھائی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس دوران کمانڈر شیروان اس کمرے میں چلا گیا تھا جس کے اندر کشمیری لڑکی جمیلہ قید تھی۔ وہ لڑکی کو نکال کر باہر لے آیا۔ لڑکی حواس باختہ سی ہو رہی تھی۔ اس نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں دیکھیں تو دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

کمانڈر شیروان نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔

اس نے کہا۔

"میرا نام جمیلہ ہے آپ حریت پسند مجاہد بھائی ہیں نا؟"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہاں بہن۔ ہم حریت پسند مجاہد ہیں۔ ہم تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔"

کمانڈر شیروان اس سے کشمیری میں بات کر رہا تھا۔ پھر اس نے لڑکی سے کہا۔

"بہن! صرف ایک منٹ کے لئے تم اس کمرے میں واپس چلی جاؤ۔ ہمیں ان ڈوگرہ کافروں کے ساتھ ایک ایسا سلوک کرنا ہے۔ جسے تم شاید دیکھ نہ سکو گی۔"

جمیلہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ کہنے لگی۔

"مجھے اس کمرے سے ڈر لگتا ہے"

میں نے کہا۔

"بہن! صرف ایک منٹ اندر چل کر بیٹھو۔ جلدی کرو۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے"

جمیلہ ڈرتے ڈرتے جس کمرے میں قید تھی اسی کمرے میں واپس چلی گئی۔ شیروان نے مجھے کہا۔

"تھیلا نکال کر میرے پاس آجاؤ۔"

"مگر ذرا ٹھہرو"

کمانڈو شیروان نے اس خیال سے کہ جمیلہ دروازہ کھول کر وہ منظر نہ دیکھ لے جو اس کی برداشت سے باہر تھا۔ دروازے کو باہر سے چٹخنی لگا دی۔ تینوں ڈوگرہ فوجیوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ کمانڈر شیروان نے پستول جیب میں ڈالا اور کمانڈو چاقو نکال لیا۔ مجھے بھی ایسا کرنے کو کہا۔ سب سے پہلے اس نے ڈوگرہ کیپٹن کی لاش کو سیدھا کیا۔ اس کے کاندھے پر کیپٹن رینک کے تین سٹار لگے ہوئے تھے۔ اس کے سر میں تین گولیاں آرپار ہو گئی تھیں۔ شیروان نے لاش کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر ڈالا اور جس طرح بکرے کو ذبح کرتے ہیں بالکل اسی طرح اتنی طاقت اور زور سے چاقو اس کی گردن پر چلایا کہ ریڑھ کی ہڈی کے کٹنے کی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ دوسرے لمحے ڈوگرہ کیپٹن کی گردن اس کے جسم سے الگ ہو چکی تھی۔ شیروان نے میری طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

"تم میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اس کافر کی گردن کاٹ ڈالو"

میرے قریب صوفے کے نیچے ڈوگرہ حوالدار کی لاش پڑی تھی مجھ پر جیسے دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کشمیر کی تمام لڑکیوں کی بے حرمتی کرنے والا اور بے گناہ کشمیریوں کو ہلاک کر کے ان کے گھروں کو مارٹر گولوں سے تباہ کرنے والا یہی ایک ڈوگرہ حوالدار ہے۔ میں نے بڑا چاقو جس کے آدھے پھل پر دندانے بھی ہوتے ہیں لاش کی گردن کے نیچے رکھ کر اس کے سر پر ایک پاؤں رکھا اور پوری طاقت سے چاقو کو اوپر کی جانب جھٹکا دیا۔ دوسرے جھٹکے پر ڈوگرہ حوالدار کی گردن اس کے دھڑ سے الگ ہو گئی۔ اس وقت کمانڈر شیروان تیسرے ڈوگرہ فوجی کی گردن الگ کر چکا تھا۔ ہم نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے سر پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ رسی سے بند کیا۔ تھیلے کو نائلون کی رسی سے باندھ کر میں نے اپنے کندھے پر ڈالا اور نائلون کی رسی اپنی کمر کے گرد

باندھ دی۔ میں دروازہ کھول کر کشمیری لڑکی کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ دروازے کے پاس ہی فرش پر نیم بے ہوش پڑی تھی۔ شیروان بھی اندر آگیا اس نے پانی کا جگ لا کر لڑکی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ لڑکی ہوش میں آگئی۔ لگتا تھا کہ اس نے دروازے میں سے ہمیں ڈوگروں کی گردنیں کاٹتے دیکھ لیا تھا اور دہشت کے مارے بے ہوش ہوگئی تھی۔

شیروان نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"نکل چلو"

شیروان آگے میں لڑکی جمیلہ کو لے کر پیچھے تھا۔ ہم تیز تیز چلتے باتھ روم میں سے ہو کر دوسرے دروازے سے باہر عقبی لان میں آئے اب ہمیں رینگ رینگ کر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ رات اسی طرح سرد اور کہر آلود تھی۔ کہرا ہمارے چھپاؤ کے لئے کافی تھا۔ ہم نے دوڑ کر گارڈینیا کی جھاڑیوں کو پار کیا اور بادام کے درختوں کی طرف بھاگنے لگے۔ کشمیری لڑکی جمیلہ کے جسم میں نئی توانائی آگئی تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ دوڑ رہی تھی اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی اسے کافروں کی قید سے نکال کر لے جا رہے ہیں۔ اب اس کی عزت وحرمت محفوظ ہے۔

بادام کے درختوں میں ایک طرف سے کمانڈو ہاشم دوڑ کر ہمارے پاس آگیا۔ کشمیری لڑکی کو ہمارے ساتھ دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔ "اللہ ہمارے ساتھ ہے"

کمانڈر شیروان نے جمیلہ سے کشمیری زبان میں کہا۔

"بہن اللہ نے تمہیں کافروں سے محفوظ کر دیا ہے ہمارے ساتھ چلتی چلی جانا۔ جہاں ہم دوڑیں گے تمہیں بھی دوڑنا ہوگا۔ جہاں ہم خطرہ دیکھ کر چھپ جائیں گے تمہیں بھی چھپ جانا ہوگا اور کوئی آواز نہیں نکالنی ہوگی۔ میرے پیچھے آجاؤ۔"

کمانڈر شیروان نے جمیلہ کو اپنے پیچھے کر لیا۔ اس کے پیچھے میں اور میرے ساتھ کمانڈو ہاشم تھا۔ ہم سرد رات کی خاموشی میں تیز تیز چل رہے تھے۔ کمانڈو ہاشم نے

میرے تھیلے کو ہاتھ سے چھو کر کہا۔

"کافروں کے سر کاٹ کر لے آئے ہو۔ یہ ہماری سب سے بڑی فتح ہے۔ میں نے سائی لینسروں والے پستولوں کی آوازیں سن لی تھیں دشمن نے تو کوئی فائر نہیں کیا نا؟"

"بالکل نہیں ہمیں یہی ڈر تھا اگر وہ فائر کر دیتے تو اس کے دھماکوں سے بارکوں کے سنتری ہوشیار ہو کر ضرور ادھر کو آجاتے۔"

اگرچہ ہم تیز تیز چلتے ہوئے دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن کمانڈر شیروان نے ہماری آوازیں سن لیں وہ رک گیا۔ اس نے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کیوں بولتے ہو؟ کیوں بولتے ہو؟"

ہم پھر اسی فارمیشن میں تیز تیز چلنے لگے۔ ہم واپسی پر بھی انہی گھاٹیوں کھائیوں اور چٹانی پتھروں کی درمیان سے ہوتے ہوئے سیب کے باغ میں آگئے۔ یہاں کوٹھڑی کے اندر مجاہد شعبان کمبل اوڑھے بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر کوٹھڑی سے باہر آگیا۔ کہنے لگا۔

"لڑکی کہاں ہے؟"

جمیلہ پیچھے میرے ساتھ تھی۔ جمیلہ کو دیکھ کر شعبان نے اللہ تیرا شکر تین بار کہا۔ جمیلہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا۔ میرے کاندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے کو دیکھ کر نفرت سے کہا۔

"کافروں کے سر لائے ہو۔ شاباش۔ ان سروں کو دلی پردھان منتری کو بھجوا دینا۔"

ہم کوٹھڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ شیروان نے شعبان سے کہا۔

"ہم راتوں رات یہاں سے نکل جائیں گے۔ جمیلہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اس کے لئے جتنی جلدی کچھ کھانے کو لا سکتے ہو لے آؤ۔ کیونکہ آگے ہمارا سفر بڑا لمبا ہے۔"

شعبان بولا۔

"ابھی آتا ہوں"

وہ چلا گیا۔ جمیلہ کے چہرے سے ابھی خوف کے اثرات ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے شیروان سے کشمیری میں پوچھا۔

"کافروں کے سر یہیں زمین میں دبا دو۔ مجھے ڈر لگتا ہے"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے تمہارے بابا سے وعدہ کیا تھا کہ جن بھارتی فوجیوں نے جمیلہ بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ ہم ان کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ ہی لائیں گے۔ یہ سر ہمیں تمہارے بابا کو دکھانے ہوں گے۔ اس کے بعد ہمیں ان کے ساتھ جو سلوک کرنا ہوگا کریں گے۔ اب تم اس بارے میں ہم سے کوئی سوال نہ پوچھنا اوکے؟"

جمیلہ خاموش ہو گئی مجاہد شعبان چھ سات روٹیاں اور ساگ ان کے اوپر ڈال کر لے آیا۔ ساتھ پانی کی صراحی بھی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی جتنی روٹی کھا سکتے تھے کھائی۔ پانی پیا۔ زیادہ سے زیادہ وہاں آدھا گھنٹہ آرام کیا اور مجاہد شعبان سے کہا کہ اب ہم آگے کو چلتے ہیں۔ شعبان کہنے لگا۔

"صبح ہوتے ہی تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے قتل کی سب کو خبر ہو جائے گی اور جب لاشوں کے سر بھی غائب ہوں گے تو فوج کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔ یہاں کے مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جائے گی"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ ڈوگرہ فوجیوں کے سر غائب دیکھ کر ان پر دہشت بھی ضرور طاری ہو جائے گی۔ اس بار وہ یہاں کے مسلمان کشمیریوں پر سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالیں گے"

مجاہد شعبان بولا۔

"شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن میں تمہیں یہ کہنے والا تھا کہ اس بھیانک قتل کا پتہ لگتے ہی بھارتی فوج کے جوان تمہاری تلاش میں نکل پڑیں گے یہاں اتنے گھنے جنگل بھی نہیں ہیں۔ اور سری نگر یہاں سے کافی دور ہے۔ تم لڑکی کو ساتھ لے کر کہاں مارے مارے پھرتے رہو گے۔"

کمانڈر شیروان نے کہا۔

"اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے"

مجاہد شعبان نے کہا۔

"یہاں سے دو میل نیچے پہاڑی نالہ وادی میں بہتا ہے۔ وہاں ہمارے اپنے کچھ ماہی گیر رہتے ہیں۔ تمہیں ان سے ایک بڑی کشتی مل سکتی ہے۔ تم دریائی راستے سے ایک تو محفوظ ہو گے دوسرے بہت جلدی سری نگر کی وادی میں پہنچ جاؤ گے۔ کیونکہ پہاڑی نالے بہترین اور مختصر ترین راستوں سے دریاؤں تک جاتے ہیں۔"

مجھے اور کمانڈر شیروان کو شعبان کی تجویز پسند آئی۔ شیروان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ابھی ماہی گیروں کے گاؤں کو چلتے ہیں"

اور واقعی ہم اس وقت کوٹھڑی سے نکلے اور ماہی گیروں کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ مجاہد شعبان ہمارے ساتھ تھا۔ راتوں رات ہم ماہی گیروں کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہاں نالہ قریب ہی بہہ رہا تھا۔ یہ وادی تھی نالے کا پاٹ چوڑا تھا اور کشمیری ماہی گیروں کی کچھ چھوٹی بڑی کشتیاں بھی کناروں پر کھڑی تھیں۔ شعبان ہمیں کشتیوں کے پاس چھوڑ کر خود ماہی گیروں کے چھوٹے سے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ جمیلہ نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی مگر سردی زیادہ تھی۔ میں نے اسے اپنی گرم جیکٹ اتار کر پہنا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی شعبان ایک کشمیری ماہی گیر کو لے کر آ گیا۔ ان لوگوں نے کشمیری میں کچھ باتیں کیں۔ ہم ایک ذرا بڑی کشتی میں بیٹھ گئے جس پر آدھی چھت پڑی تھی۔ شعبان نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"تم لوگ نالے کے بہاؤ پر سفر کرو گے۔ تمہیں صرف چپوؤں اور ڈانڈ سے کشتی کو کناروں سے ٹکرانے سے بچانا ہوگا۔ یہاں سے نالہ وادی کی ڈھلان میں بہتا ہے اور پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ تم لوگ تین یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین گھنٹوں میں سری نگر کی وادی میں پہنچ جاؤ گے جہاں یہ نالہ دریائے جہلم میں گرتا ہے۔ کشتی کو تم وہاں ایک طرف باندھ دینا۔ ہمارے آدمی کل خود آکر کشتی واپس لے آئیں گے۔ اللہ بیلی"

ہم نے کشتی نالے کے بہاؤ پر ڈال دی۔ پانی کا یہاں واقعی بڑا زور تھا۔ نالہ ڈھلان میں بہتا تھا۔ کشتی نے تیزی سے سفر طے کرنا شروع کر دیا۔ ایک طرف کمانڈو ہاشم نے ڈانڈ پکڑے کھڑا تھا دوسرے طرف میں نے چپو سنبھال رکھے تھے۔ ہاشم کشتی کی سمت سیدھی رکھتا تھا اور میں کشتی کو کنارے کی طرف جانے سے روکتا تھا۔ یہ وادی تھی اونچی نیچی پہاڑی جگہ نہیں تھی۔ کوئی گھاٹی اور آبشاریں بھی نہیں تھیں۔ یہ سارا پہاڑوں کی تلیٹی کا علاقہ تھا۔ ہماری کشتی بہتی چلی جا رہی تھی۔ ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا میں نے کشتی میں ایک طرف رکھ دیا تھا۔ خطرہ تھا کہ کل تک اس میں بدبو پیدا ہونے لگے گی۔ کمانڈر شیروان نے کہا تھا کہ ہم صبح ہونے سے پہلے پہلے جمیلہ کو اس کے ماں باپ کے گھر پہنچائیں گے اور ساتھ ہی اس کے باپ کو ڈوگروں کے کٹے ہوئے سر بھی دکھا دیں گے۔ اس کے بعد ہمارا پروگرام سری نگر سے کچھ فاصلے پر پہاڑی پر جو ڈوگرہ فوج کا گیریزن تھا اس گیریزن میں ان کٹے ہوئے سروں کے تھیلے کو پھینکنے کا تھا۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ جمیلہ کو ہم نے کشتی میں ایک طرف سلا دیا تھا۔ شیروان نے اس کے اوپر اپنی جیکٹ بھی ڈال دی تھی کیونکہ سردی زیادہ تھی۔

رات کے ٹھیک سوا تین بجے ہمیں دور سے سری نگر شہر کی بتیاں جھلملاتی نظر آنے لگیں۔ یہاں نالہ دریا میں گرتا تھا پانی کا بہاؤ زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ کمانڈر شیروان نے ہاشم سے کہا۔

"آگے دریا ہے۔ کشتی کو بائیں جانب والے کنارے کی طرف لے آؤ"

کمانڈو ہاشم نے کشتی کے مہار کو ایک طرف موڑ دیا۔ میں چپوؤں کو اس طرح چلانے لگا کہ کشتی کنارے کی طرف آجائے۔ آخر کشتی کنارے پر آگئی۔ کمانڈو ہاشم نے رسی ہاتھ میں لے کر کنارے پر چھلانگ لگا دی اور رسی کو کھینچ کر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ ہم نے جمیلہ کو جگا دیا۔ شیروان نے جیکٹ پہن لی جمیلہ نے میری جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اتارنے لگی تو میں نے اسے منع کر دیا۔ "یہ ایک بھائی کا تحفہ سمجھ کر اپنے پاس رکھو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔"

ہم اندھیرے میں کشتی سے اتر کر سری نگری کی طرف چلنے لگے۔ جمیلہ کا گاؤں سری نگر شہر سے چھ سات میل مشرق کی جانب تھا۔ یعنی جس راستے پر ہم جا رہے تھے پہلے جمیلہ کا گاؤں آتا تھا۔ اس کے بعد سری نگر شہر کے مضافات شروع ہو جاتے تھے یہ راستہ کمانڈر شیروان کا دیکھا بھالا تھا۔ جمیلہ بھی ان راستوں سے واقف تھی۔ ہم ایک گھنٹے تک پہاڑی راستے پر چلتے رہے۔ اس کے بعد جمیلہ کا گاؤں آگیا۔ جلے ہوئے تباہ حال گاؤں پر ہو کا عالم طاری تھا۔ جمیلہ نے کہا۔

"نیچے گھاٹی کے کنارے میری خالہ کا گھر ہے اماں بابا وہیں ہوں گے۔ مجھے وہاں لے چلو"

ہم جمیلہ کو لے کر اس کی خالہ کے مکان پر آگئے۔ مکان بند تھا۔ جمیلہ نے دروازے کو کھٹکھٹایا اندر سے اس کے بابا کی نیند بھری آواز آئی۔

"کون ہے اس وقت؟"

جمیلہ نے جذبات سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بابا! میں ہوں جمیلہ"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دروازہ کھلا اس کے ماں باپ اور خالہ کا بیٹا باہر آگئے۔ ماں باپ کے گلے لگ کر جمیلہ بے اختیار روئے جا رہی تھی۔ جب ان کا کچھ ہلکا ہوا تو کمانڈر شیروان نے جمیلہ کے باپ سے کہا۔

"بابا! ہمیں اندر لے چلو۔ ہم تمہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔"

اندر لکڑی کی دیواروں والے مکان کی کوٹھڑی میں لالٹین روشن کر دی گئی۔ ادھر ادھر فرش پر گرم دریاں اور لحاف پڑے تھے۔ جمیلہ کا باپ اماں خالہ اور اس کا بیٹا ہمارا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ کمانڈر شیروان نے نائلون کا تھیلا مجھ سے لے کر کھولا اور اسے الٹا دیا۔ اس کے اندر ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے تین سر بکرے کی سریوں کی طرح گرے۔ ڈوگرہ فوجیوں کے چہرے نیلے پڑ چکے تھے۔ وہ سب ان سروں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ کمانڈر شیروان نے کہا۔

"بابا! میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر رہا ہوں۔ یہ تینوں کٹے ہوئے سر ان ڈوگرہ فوجیوں کے ہیں جنہوں نے جمیلہ بہن کو اغوا کیا تھا تمہاری بیٹی اور ہماری بہن کی عزت محفوظ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہماری بہن کی بے حرمتی کرتے ہم نے ان کے سر کاٹ کر دھڑ سے الگ کر دیئے تھے۔ اچھا خدا حافظ! اب ہم چلتے ہیں ابھی ہمیں ایک اور ذمے داری پوری کرنی ہے۔"

جمیلہ کو اس کے ماں باپ کے حوالے کر کے ہم اپنے خفیہ پہاڑی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس وقت ہم اپنے خفیہ اڈے پر پہنچے آسمان پر صبح کی سفیدی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ پہاڑی غار کے اندر جاتے ہی لحاف اوڑھ کر لکڑی کے شہتیروں کی طرح گہری نیند سو گئے۔ کمانڈو کو جب موقع ملے وہ اپنی نیند پوری کر لیتا ہے۔ ہم دو راتوں سے نہیں سوئے تھے۔ چنانچہ جب سو کر اٹھے تو آدھا دن گزر چکا تھا۔

ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ نائلون کے تھیلے میں سے ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سر نکال کر ان کا معائنہ کیا۔ کٹے ہوئے سروں کا رنگ سیاہ پڑنے لگا تھا اور ان میں سے بدبو بھی آنا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے اسی وقت اپنا آدمی بھیج کر بازار سے سپرٹ کی تین بڑی بوتلیں منگوائیں ساری سپرٹ ٹین کے کنستر

میں انڈیل دی اور پھر ڈوگرہ فوجیوں کے تینوں سر اس میں ڈال دیئے۔ تینوں سر سپرٹ میں ڈوب گئے۔ ہمارے دوسرے مجاہد ساتھی بھی ہمارے پاس بیٹھے ڈوگروں کے سروں کو دیکھ کر ہمیں مبارک بادیاں دے رہے تھے۔ شیروان کمانڈر نے کہا۔

"تم لوگوں میں سے ایک مجاہد نے سوال کیا تھا کہ میں نے ان کافروں کے سروں کو اتنا سنبھال کر کیوں رکھا ہوا ہے۔ میں اس سوال کا جواب اب دیتا ہوں۔ میں سروں کو عبرت کا نشان بنا کر بھارتی فوجی گیریزن کے فوجیوں تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کشمیری مجاہد اپنی بے عزتی اور بے حرمتی کا بدلہ لینا جانتے ہیں۔ اگر وہ مرد ہیں تو ہم اس سے میدان جنگ میں ہی لڑیں۔ اگر وہ ہماری عزتوں اور غیرتوں کو للکاریں گے تو ان سب کا حشر ان تین ڈوگرہ فوجیوں ایسا ہو گا۔"

سب نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔

میں اور کمانڈر شیروان اور کمانڈو ہاشم نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے شیروان سے پوچھا کہ اس کا منصوبہ کس نوعیت کا ہے۔ اور سکیم کی فارمیشن کیا ہو گی۔

کمانڈر شیروان نے مجھے اور کمانڈو ہاشم کو اپنی سکیم سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"انڈین آرمی کی آرٹلری رجمنٹ کا فوجی یونٹ یہاں سے چھ میل دور ایک پہاڑی کے اوپر گیریزن میں مقیم ہے۔ یہ یونٹ کشمیر کی مقبوضہ وادی میں بھارتی جارحانہ کارروائیوں کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ ہم رات کے وقت اس گیریزن کے کوارٹر گارڈ کے سامنے ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا پھینکیں گے۔ وہاں تھیلا پھینکنے سے سارے گیریزن کو بہت جلدی معلوم ہو جائے گا کہ گلمرگ کی چھاؤنی میں جن فوجیوں کے دھڑ ملے تھے یہ ان ہی

کے سر ہیں۔ اس کے ساتھ ہم ایک خط بھی لکھ کر تھیلے میں ڈال دیں گے کہ یہ سر تم لوگوں کے لئے عبرت بھی ہے اور انتباہ بھی۔ جنگ کے محاذ پر ہم آمنے سامنے آکر لڑیں گے۔ یا تم مر گئے یا ہم شہید ہو گئے۔ لیکن اگر تم ہماری ماؤں' بہنوں' بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلنے کی ناپاک حرکت کرو گے تو تمہارا یہی انجام ہو گا۔ کوئی سوال؟ کوئی اعتراض؟"

کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہیں"

شیروان نے کمانڈو ہاشم سے کہا۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے اس مضمون کا ایک خط لکھ کر تیار کرو"

کمانڈو ہاشم دوسری کوٹھڑی میں چلا گیا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"رات کس وقت جانے کا پروگرام ہے؟"

شیروان نے کچھ سوچ کر کہا۔

"وہی رات کے دو بجے یہاں سے نکلیں گے۔ رات کا پچھلا پہر اس قسم کے کمانڈو آپریشن کے لئے بڑا موزوں ہوتا ہے۔"

کمانڈو ہاشم ایک پرچہ لکھ کر لے آئے۔ پرچے پر انگریزی اور اردو میں وہی مضمون لکھا تھا جو کمانڈر شیروان نے اسے بتایا تھا۔ شیروان نے پرچہ پڑھا۔ پھر مجھے پڑھنے کو دیا میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک لکھا ہے"

ہم نے رات کے بارہ بجے سماوار میں سبز چائے تیار کروائی چائے کے ساتھ نمکین قلچے کھائے۔ اپنے اپنے پستولوں اور سٹین گنوں کی صفائی کی۔ اس مشن پر ہم اپنی اپنی سٹین گنیں بھی ساتھ لے جا رہے تھے۔ شیروان کمانڈو ہاشم کو اس مشن پر ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔

"ہاشم کی ہمیں ضرورت نہیں ہو گی۔ جتنے کم آدمی ہوں گے اتنی ہی ہمیں آسانی ہو گی۔ ہمیں کسی کا مقابلہ تو کرنا نہیں۔ کٹے ہوئے سروں والا تھیلا پہاڑی کی بلندی سے گیریزن کے کوارٹر گارڈ میں پھینکنا ہے۔ ہم دو ہی کافی ہوں گے"

"کیا تم نے گیریزن پہلے سے دیکھا ہوا ہے؟"

شیروان بولا۔

"ایک بار نہیں۔ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ہمیں گیریزن کی کس طرف جانا ہے اور کس مقام پر سے تھیلا نیچے پھینکنا ہے"

جب رات کا ڈیڑھ بج گیا تو ہم نے تینوں ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سر سپرٹ کے کنستر سے نکال کر انہیں پرانے کپڑوں سے خشک کیا۔ ان کو نائلون کے تھیلے میں ڈالا۔ ساتھ ہی لفافے میں لکھا ہوا پرچہ بھی ڈال کر رکھ دیا۔ لفافے کے باہر گیریزن کمانڈر کے لئے لکھا اور نیچے کشمیر کے حریت پرست مجاہد لکھ دیا۔ ہمارے پاس ایک ایک آٹومیٹک پستول' ایک ایک بڑا کمانڈو چاقو' ایک ایک سٹین گن اور کچھ فالتو میگزین تھا۔ دستی بم رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمانڈو ہاشم نے ہمارے لئے دو خچر تیار کر دیئے تھے۔ ٹھیک دو بجے رات ہم خچروں پر بیٹھ کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ پہاڑیوں میں چھ میل کا راستہ تھا۔ شیروان ایک مختصر راستے سے لے جا رہا تھا۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے انڈین آرٹلری یونٹ کا یہ کیمپ یا گیریزن ایک چھوٹی سی چھاؤنی کی طرح تھا۔ چاروں طرف خاردار تاروں والی اونچی دیوار تھی۔ کھمبوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ یہ گیریزن چھوٹے ٹیلے کے اوپر تھا۔ اس کی ایک جانب نیچے فوجی بارکوں کے باہر بھی روشنی ہو رہی تھی۔

ہم نے خچر کچھ فاصلے پر چھوڑ دیئے تھے۔ ان خچروں کو اپنے آپ واپس چلے جانا تھا۔ کمانڈر شیروان اور میں ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ہمارا لباس اس وقت کشمیری دیہاتیوں والا

نہیں تھا۔ ہم نے پتلونیں اور گرم جرسیاں اور جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ رات سرد تھی مگر ہمیں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ کمانڈو مشن کی گرمی نے ہمارے خون کو گرم رکھا ہوا تھا۔ شیروان اس طرف سے چڑھائی چڑھ رہا تھا جدھر ٹیلے پر گیریژن کا کوارٹر گارڈ تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے چڑھائی چڑھتے ہوئے گیریژن کی کانٹے دار دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ کمانڈر شیروان مجھے گائیڈ کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے۔

یہ چونکہ کوئی فوجی پکٹ یا فوجی مورچہ نہیں تھا اس لئے یہاں رات کے وقت گشتی پارٹی کا امکان بہت کم تھا۔ ہم نے ایک جگہ رک کر کچھ دیر انتظار بھی کیا کہ اگر کوئی پٹرولنگ پارٹی یہاں گشت پر ہے تو پتہ چل جائے گا۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد جب کوئی پارٹی ادھر نہ آئی تو ہم دیوار کے ساتھ جھک کر کوارٹر گارڈ والے ٹیلے کی طرف چلنے لگے۔ وہاں ایک جگہ اونچائی پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ ان درختوں کے نیچے خاردار تار کی دیوار کی دوسری جانب کوارٹر گارڈ تھا جہاں برآمدے کے باہر گول دائرے کے اندر رجمنٹ کا جھنڈا کھمبے پر لگا ہوا تھا اور ایک سنتری گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ ڈوگرہ فوجیوں کے کٹے ہوئے سروں والا تھیلا میرے پاس تھا۔ شیروان نے درختوں کے پاس آکر آگے کو جھک کر نیچے کوارٹر گارڈ کے صحن کو دیکھا۔ پھر تھیلا میرے ہاتھ سے لے کر اسے کوارٹر گارڈ کے صحن کی طرف اچھال دیا۔ ہم وہیں کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔

جیسے ہی تھیلا ڈیوٹی پر کھڑے سنتری کے پیچھے گرا۔ اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور دوڑ کر تھیلے کو اٹھایا۔ اسے کھول کر الٹا کیا۔ اندر سے تینوں ڈوگروں کے کٹے ہوئے سر اور خط والا لفافہ باہر گر پڑا۔ کٹے ہوئے سروں کو دیکھتے ہی سنتری نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈر شیروان نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

"نکل چلو"

ہم نیچے کو دوڑ پڑے۔ ادھر کسی جگہ کوئی مشین گن پوسٹ تھی۔ گنر نے فائر کھول دیا۔ کچھ معلوم نہیں تھا گولیوں کے برسٹ کس طرف سے آ رہے ہیں اور کس طرف پڑ

رہے ہیں۔ ہم ڈھلان پر زیادہ تیز دوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایک اور مشین گن فائر کرنے لگی۔ نیچے فوجیوں کے دوڑنے بھاگنے ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اچانک اوپر تلے دو روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ یہ چھتری والے روشنی راؤنڈ تھے۔ ساری پہاڑیاں' پہاڑیوں کی ڈھلانیں روشن ہو گئیں۔ ہم نیچے اترتے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے۔ ہم وہیں جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ روشنی راؤنڈ آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ جب وہ نیچے آ کر بجھ گئے اور ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا تو ہم اٹھ کر تیز تیز چلنے لگے۔ شیروان نے کہا۔

"ہم گھاٹی کی طرف نہیں جائیں گے۔ مشین گن پوسٹ اسی طرف ہے"

اب رائفلوں کا فائر بھی آنے لگا تھا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا ہمیں روشنی راؤنڈ کی روشنی میں دیکھ لیا گیا تھا۔ کمانڈر شیروان دائیں طرف کو گھوم گیا۔ اس طرف نشیب میں گہری کھائی کے کنارے کنارے ایک پہاڑی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ ہم اسی پگ ڈنڈی پر دوڑ پڑے۔ فائر ہمارے سروں کے اوپر آ رہا تھا۔ ہم نے بھی پستول نکال لئے تھے۔ مگر ابھی تک جوابی فائر نہیں کیا تھا۔ فائر کے انداز سے لگتا تھا کہ ایک پارٹی ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"ہمیں گھاٹی کی طرف سے ہو کر نکل جانا چاہیئے"

مگر کمانڈر شیروان نے کہا۔

"ہم ٹھیک جا رہے ہیں"

کمانڈر شیروان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ یہ بات نہ مجھے معلوم تھی نہ کمانڈر شیروان کو معلوم تھی۔ وہ ٹیلے کے پہلو میں سے ہو کر سامنے والی بڑی چٹان کے عقب میں جانا چاہتا تھا۔ میں اس کی بائیں جانب تھا۔ جیسے ہی وہ دائیں جانب مڑا۔ پیچھے سے مشین گن کا برسٹ فائر ہوا۔ کمانڈر شیروان چلتے چلتے رک گیا۔ پھر منہ کے بل گر پڑا۔ میں اسے اٹھانے کے لئے جھکا۔ مگر کشمیر کا یہ جیالا سپوت جہاد کشمیر کا بے باک دلیر مجاہد کمانڈر

شیروان اب کبھی نہ اٹھنے کے لئے گرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا ہاتھ شہید کے لہو میں سرخ ہو گیا۔ ابھی تک میں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ شیروان شدید زخمی ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے ہتھیاروں کے فائر میں گھاٹی میں اتر گیا۔ جیسے جیسے میں گھاٹی میں آگے بڑھ رہا تھا فائرنگ کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ گھاٹی دوسرے ٹیلے کے دامن میں جا نکلتی تھی۔ یہ مختصر پہاڑی رستہ کمانڈر شیروان نے ہی مجھے دکھایا تھا۔ مجھے اس ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف جانا تھا۔ کمانڈر شیروان کا جسم مجھے بے جان اور ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس کی نبض دیکھنے سے ڈر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا شیروان شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا ہے۔ میں اسے کاندھے پر ڈالے آہستہ آہستہ ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ یہ بڑا دشوار کام تھا۔ چڑھائی مشکل تھی میرے کاندھے پر شیروان کے جسم کا بوجھ بھی تھا۔ مگر میرا وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں ایک ہاتھ سے جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔ دور پیچھے گیریزن والی پہاڑی کی طرف دو روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ مگر ان کی روشنی مجھ سے کافی فاصلے پر تھی۔ میں تھک گیا سانس لینے کے لئے میں نے کمانڈر شیروان کو وہیں جھاڑیوں میں لٹا دیا۔ ابھی پچھلے پہر کا اندھیرا تھا میں نے شیروان کی گردن پر ایک طرف انگلی رکھ دی۔ مجھے کسی وقت لگتا کہ کمانڈر شیروان کا دل دھڑک رہا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر کہرے کے جیسے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میں نے شیروان کو کاندھے پر ڈالا اور ٹیلے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ جس وقت میں ٹیلے کی چوٹی پر پہنچا تو آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ ٹیلے کی دوسری جانب کشادہ وادی سحر کے نیلے دھندلکے میں نظر آ رہی تھی ۔ وادی کے آخر میں وہ پہاڑیاں تھیں جہاں ہماری خفیہ پناہ گاہ تھی ۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں

گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ صبح کاذب کی نیلی روشنی سپیدہ سحر میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نے کمانڈر شیروان کے جسم کو غور سے دیکھا۔ اس کی جرسی اور جیکٹ لہو سے سرخ ہو رہی تھی۔ مشین گن کا برسٹ اس کے پیٹ میں سے گزر گیا تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر نور سا آگیا تھا۔ کمانڈر شیروان شہید ہو چکا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کشمیر کے اس غیور بیٹے کی زندگی کا سفر ختم ہو چکا تھا۔

عجیب بات ہے شیروان کا جسم لاش کی طرح نہیں اکڑا تھا۔ اس کا جسم ویسے ہی نرم اور نیم گرم تھا جیسے زندہ انسان کا ہوا کرتا ہے۔ صبح کی سپیدی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر یہ سفیدی سرخی مائل ہونے لگی۔ مشرقی افق پر پہاڑیوں کے پیچھے سرخ روشنی کا غبار سا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ پھر سورج کے سرخ قرص کا لرزتا جھلملاتا ہوا کنارا آہستہ آہستہ ابھرنا شروع ہو گیا۔ جیسے جیسے سورج طلوع ہو رہا تھا اس کی سرخ روشنی گلابی رنگ اختیار کر رہی تھی۔

پھر یہ گلابی رنگ سنہری ہو گیا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو کر میرے سامنے آگیا۔ اس وقت میرے سامنے دو سورج تھے۔ ایک سورج مشرقی پہاڑیوں کے افق پر طلوع ہو رہا تھا اور دوسرا سورج شہید کمانڈر شیروان کی پیشانی سے طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے جھک کر شہید کی دمکتی ہوئی چمکتی ہوئی پیشانی کو چوم لیا۔ مجھے شہید کے جسد خاکی سے جنت کے پھولوں کی خوشبو آئی۔

اس وقت مجھے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان یاد آگیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ جو مومنین اللہ تعالیٰ کی خاطر جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور ان کو اپنے رب کی طرف سے رزق پہنچتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔

ہمارا مشن موت کا مشن تھا۔ کمانڈر شیروان اپنا مشن پورا کر کے اللہ کی راہ میں شہید

ہو گیا تھا اور موت اسے تلاش ہی کرتی رہ گئی تھی۔ میں نے زندہ شہید کے جسد خاکی کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور وادی میں اترنے لگا۔ طلوع ہوتے سورج کی سنہری کرنیں شہید کی پیشانی کو چوم رہی تھیں۔ شہید شیروان کے جسم سے ایک نئے سورج کی سنہری کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ آزادی کشمیر کا سورج تھا۔ کشمیر کے بہادر بیٹوں کی قربانیوں اور شہادتوں کا سورج تھا۔ جس نے بہت جلد طلوع ہو کر سارے کشمیر کو آزادی کی نورانی کرنوں سے منور کرنا تھا۔



جیسے ہی ہم تینوں کمانڈو شیو پاروتی مندر کے قریب پہنچے ہم نے ترنگ میں آکر جھوم جھوم کر گانا شروع کر دیا۔

جے جے شو شنکر
کانٹا لگے نہ کنکر
کہ پیالہ تیرے نام کا پیا

چونکہ مجھے ہندو دیو مالا اور ان کی دیوی دیوتاؤں کی تاریخ پر کافی عبور حاصل تھا اس لئے یہ تین بول میں نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیئے تھے اور ہم اکٹھے مل کر گا رہے تھے۔ اس وقت مندر کے باہر صرف تین چار یاتری ہی بیٹھے تھے۔ ایک سادھو بھی ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔

پجاری اپنی کوٹھڑی کے آگے چارپائی پر کمبل اوڑھ کر بیٹھا ناریل کی گڑگڑی پی رہا تھا۔ انہوں نے ہماری طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اس طرح یاتری وہاں اکثر ماتھا ٹیکنے آتے ہی رہتے تھے۔

ہم اسی طرح جھوم جھوم کر گاتے مندر کے اندر چلے گئے۔ اندر شیو دیوتا اور اس کی پتنی پاروتی کی مورتیاں تھیں۔ ان کے آگے جا کر ہم نے ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا۔ اور پھر اسی طرح گاتے ہوئے باہر صحن میں آکر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں سے ہمیں مندر کی دائیں جانب والی وہ دیوار نظر آ رہی تھی جہاں مندر کے تہ خانے کا دروازہ تھا جس کے آگے چار انڈین فوج کی کسی یونٹ کے سنتری پہرہ دے رہے تھے۔

طرف کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اس طرح یاتری وہاں اکثر ماتھا ٹیکنے آتے ہی رہتے تھے۔

ہم اس طرح جھوم جھوم کر گاتے مندر کے اندر چلے گئے۔ اندر شیو دیوتا اور اس کی پتنی پاروتی کی مورتیاں تھیں۔ ان کے آگے جا کر ہم نے ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا۔ اور پھر اسی طرح گاتے ہوئے باہر صحن میں آکر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم ایسی جگہ بیٹھے تھے

جہاں سے ہمیں مندر کی دائیں جانب والی وہ دیوار نظر آ رہی تھی جہاں مندر کے تہ خانے کا دروازہ تھا جس کے آگے چار انڈین فوج کی کسی یونٹ کے سنتری پہرہ دے رہے تھے۔

ہم اپنی طرف سے بڑے بے نیاز ہو کر بلکہ مگن ہو کر بیٹھے تھے جیسے ہمیں سوائے شو پاروتی کی پوجا اور بھگتی کے اور کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ جب کہ حقیقت میں ہمیں شو پاروتی کی پوجا سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں تھا اور ہم وہاں کوئی اور ہی مشن لے کر آئے تھے جس کے کامیاب ہونے کی صورت میں شو پاروتی کے مندر کے بھی پرخچے اڑ جانے تھے۔ ہم تینوں جہاں بیٹھے تھے وہاں اردگرد کوئی اور آدمی نہیں تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"تہ خانے کا یہی دروازہ ہے نا؟"

کشمیری گائیڈ کمانڈو بولا۔

"یہی دروازہ ہے۔ اس کے اندر سیڑھیاں ہیں جو نیچے پہاڑی کے قدرتی غار میں جاتی ہیں۔ وہاں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے ہیں"

کمانڈر شیروان بھی کنکھیوں سے دروازے کو دیکھ رہا تھا جو ہم سے تھوڑی دور ذرا نیچے پہاڑی کی ڈھلان پر باہر کو نکلی ہوئی چٹان کے چبوترے پر تھا۔ کشمیری گوریلے گائیڈ نے کہا۔

"چاروں سنتری ہر وقت یہاں موجود ہوتے ہیں۔ آٹھ آٹھ گھنٹے بعد ان کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتی ہیں۔"

میں دروازے اور اس کے اردگرد کے ماحول کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے کمانڈر شیروان سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں بیک وقت ان چاروں سنتریوں کو قابو کرنا ہوگا۔ جو اتنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کوئی معمولی پہرےدار نہیں ہیں۔ انڈین آرمی کے تربیت یافتہ پیشہ ور فوجی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان کا تعلق کمانڈو فورس سے ہو""؟